
بیدل

بیدل

خواجہ عباداللہ اختر

ادارۂ ثقافت اسلامیہ
کلب روڈ۔ لاہور

طبع اوّل - ۱۹۵۲
طبع دوم - ۱۹۶۱
تعداد ایک ہزار

محمد اشرف ڈار (سیکرٹری) نے دین محمدی پریس
سرکلر روڈ۔ لاہور سے چھپوا کر ادارۂ ثقافتِ
اسلامیہ لاہور کے لئے شائع کیا

فہرست مضامین

بیدل

عالمے صاحب دل است اما کسے بیدل نشد

از کتاب بیدلے گر نقطۂ آید بدست
نسخہا آتش تواں زد تختہ ہا باید شکست

صد چمن باید بطوفان تغافل داد نت
تا بخونِ دل توانی ایں قدر ھا رنگ بست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ حال

ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدلؔ کا کلام میرے زیرِ مطالعہ گزشتہ زائد از چالیس سال رہا ہے۔ اگرچہ اس کے افکار کی بلندی تک میری رسائی نہیں۔ لیکن جو کچھ اور جہاں تک میرے فہم میں آیا پیش کر رہا ہوں۔ یہ وہ بلند پایہ شخصیت ہے جسے مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ جیسے "بحرِ بیکراں" اور "محیطِ بے ساحل" اور ہمارے علامہ اقبالؔ مرحوم "مرشدِ کامل" کہتے ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے بھی دادِ سخن دی ہے۔ اس کا نظیر متقدمین میں چند ہستیاں ہیں۔ متاخرین میں اس کا مثل بمشکل پیدا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کے ساتھ فنونِ لطیفہ بلند درجہ سے گرتے جاتے ہیں۔ یونان نے "ہومر" اور عرب نے ایامِ جاہلیت کے شعرا پھر پیدا نہیں کئے۔ تمدن کا ارتقاء پیٹ کے دھندوں سے فرصت لینے نہیں دیتا۔ فنونِ لطیفہ سے کسی کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اس کی طرف توجہ تو ان حضرات کی ہوتی ہے جو گوشۂ قناعت میں بیٹھ کر فقر و فاقہ قبول کرتے ہیں۔ ایک دوست نے مجھے بتایا کہ علامہ اقبالؔ کی ایک صحبت میں سنا کہ فرمایا "بیدلؔ اپنی طرز کا موجد بھی ہے اور خاتم بھی" جو جدت اور ایجاد اس کے کلام میں ہے وہ اس کے ہم عصر شعرا میں نہیں۔ ان کے سامنے متقدمین کا کلام بھی ایک نمونہ تھا اور اسی کا اتباع

ان کا نصب العین تھا۔ اس لئے بیدل کو "خارج آہنگ" کہتے۔ میر غلام علی آزاد لکھتا ہے کہ یہ ان حضرات کا صریح ظلم ہے۔ بات یہ ہے کہ بیدل نے متقدمین کی پرانی لکیر جو متاخرین عرصہ سے پیٹتے چلے آرہے تھے چھوڑ کر ایک نئی روش اختیار کی۔ جس سے ہم عصر شعرا ناواقف تھے۔ اسے نئی نئی ترکیبیں بھی اختراع کرنا پڑیں۔ جس نے زبان میں اور وسعت پیدا کی۔ اس کے سوا چارا نہ تھا۔ خیالات کے اظہار کا آلہ زبان ہی ہوتی ہے۔ جب اس کا دامن تنگ ہو تو وسعت خیال کے لئے اسے پھیلانا پڑتا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ بیدل مشکل پسند سمجھا گیا۔ لیکن یہ قصور فہم کا ہے۔ اس لیے جب تک طبائع اس کے کلام سے مانوس نہ ہوں بیدل کا سمجھنا بھی مشکل ہے۔

ایک دفعہ لاہور کے کالجوں کے طلباء نے "یوم غالب" منایا۔ علامہ اقبال زندہ تھے۔ ایک وفد باریاب ہوا اور شمولیت کی دعوت دی۔ فرمایا کہ مناسب تھا کہ تم یوم بیدل مناتے۔ اچھا اب سوال کو زیر بحث لاؤ کہ کیا وجہ ہے کہ غالب کا کلام غلام آباد ہندوستان میں مقبول ہے اور بیدل کو کوئی جانتا بھی نہیں لیکن بیدل کا کلام آزاد ممالک افغانستان میں تلاوت ہو رہا ہے اور غالب کو وہاں کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ پھر فرمایا کہ غالب کا تصوّف افسردگی پیدا کرتا ہے اور بیدل کا تصوّف حیات بخش تر و تازگی کے ساتھ اُبھارتا ہے۔

بیدل کے تعارف کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ علامہ اقبال اس کے مداح ہیں۔ کلیات بیدل میں مطبوعہ کلام ہی ملتا ہے۔ غیر مطبوعہ کلام کا حوالہ تذکروں میں ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کے پاس کسی جزو کا مکمل نسخہ بھی ہو۔ بیدل کے مزار واقع دہلی میں سالانہ عرس کی تقریب پر شعرا جمع ہوتے ہیں یہاں مکمّل نسخہ موجود تھا۔ اکثر شعرا نے نقل اسی سے بہم پہنچائی۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتا ہے کہ بیدل نے ایک لاکھ سے زائد اشعار لکھے۔ مجھے کلیات وہ بھی کئی ہاتھوں سے گذرتی ہوئی ملی تھی اُس وقت میں مدرسہ کا ایک طالب علم تھا۔ گذشتہ فسادات پنجاب میں میرے کتب خانہ

کے ساتھ یہ بھی نہ رہی۔ کابل میں امیر حبیب اللہ کی توجہ سے بیدل کا دیوان شائع ہؤا۔ یہ بھی ردیف دال پر ختم ہو گیا۔ امیر شہید ہو گیا اور یہ بھی نا تمام رہا۔ خوش قسمتی سے کلیات ایک کرم فرمانے دو روز کے لیے عاریتاً دی۔ ان دو دنوں میں میں نے کچھ اشعار نقل کیے۔ اور حسب وعدہ کلیات واپس کر دی۔ جسے مرے عنایت فرما بجا اپنا "سرمایہ حیات" سمجھتے ہیں۔ چار سال سے "ریسرچ" میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ ان کی سعی مشکور فرمائے۔ اور میں تو شکر گزار ہوں۔ اگر وہ صرف دو روز کے لیے بھی کلیات نہ دیتے تو بہت باتیں رہ جاتیں۔

میں تو پہلے ہی قصور فہم کا اعتراف کر چکا ہوں۔ یں تو میں علامہ اقبال سی بلند پایہ شخصیت بھی یہ اعتراف فراخ دلی سے کرتی رہی کہ میں بیدل کی سطح کی بلندی تک نہ پہنچ سکا۔ اس لئے ان اوراق میں اگر کہیں غلطی نظر آئے اور ضرور ہے کہ غلطی ہو تو مجھے معذور سمجھا جائے۔ غرض تو اتنی ہے کہ قارئین کرام بیدل سے روشناس ہوں۔

بیدل محض باتونی نہیں۔ وہ انفس و آفاق کا مشاہدہ غائر نظر سے کرتا ہے۔ اس کلام میں صرف شاعرانہ تخیل حسین الفاظ کے زیور سے آراستہ نہیں حکیمانہ تفکر بلند پایہ بھی ہے۔ یہ صرف دعوےٰ نہیں، دلیل اس کا کلام ہے۔ اگرچہ اس کے کلام کا موضوع وہ سب کچھ ہے جو زندگی کے ہر ایک شعبہ میں مشاہدہ ہوتا ہے مگر ہم نے ایک خاص موضوع کو نمایاں کیا ہے اور یہ فلسفہ خودی اور بیخودی ہے۔ اسے ہمارے زمانہ میں علامہ اقبال نے واضح کیا۔ علامہ مرحوم ایک ایسے زمانہ میں تھے جبکہ مسلمان من حیث القوم سُرعت سے پستی کی طرف گر رہے تھے، اور ان کی غلامانہ ذہنیت جس پر مغربی امپیریلزم پورے طور پر مسلط تھی اتنی پست ہو چکی تھی کہ اُبھرنے کی توقع جاتی رہی تھی۔ سر سید غفرلہ سے لے کر علامہ مرحوم تک قائدینِ ملت ان کو جھنجوڑ رہے تھے۔ اور یہ ٹس سے مس تک نہ ہوتے۔ علامہ نے فلسفہ خودی کو سیاسیات پر اطلاق کرتے ہوئے پیش کیا۔ اس کا اثر خاطر خواہ ہؤا۔ بیدل ہستی کی گتھی سلجھانا چاہتا ہے۔

وہ سیاسیات و معاشیات میں اس لئے بھی نہ اُلجھا کہ وہ عہد مسلمانانِ ہندوستان کے انتہائی عروج کا تھا۔ وہ ان سے الگ ہوکر خودشناس بننا چاہتا تھا، اس نے رازِ ہستی ممکن حد تک معلوم کرلیا اور جس خوش اسلوبی سے وہ بیان کررہا ہے بلا مبالغہ اسی کا حصّہ ہے۔

بیدل کا کلام نظم و نثر کا مجموعہ ہے۔ نظم کو وہ کلی اور نثر کو پھول سے تشبیہ دیتا ہے ؎

آنجا کہ تمیز محرم جزو کل است — یکتی وکی لازم انگور و مل است
در گلشن اعتبار قدرت سنجان — آرائش نظم غنچہ و نثر گل است

یہ تشبیہ اس کی نظم و نثر پر بالکل منطبق ہوتی ہے۔ اس رباعی کا مفہوم تو یہ ہے کہ غنچہ میں حُسن وخوبی کی رنگینی جمع ہوتی ہے۔ اور جامع الفاظ نظم میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ رنگ و بو سب کچھ اس میں ہوتا ہے مگر پریشانی نہیں ہوتی۔ جب یہ غنچہ کھلتا ہے تو گل بن جاتا ہے۔ اس کی پنکھڑیاں اگرچہ پیوستہ ہوتی ہیں مگر ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اسی طرح نظم کی شرح نثر ہے۔ بیدل کے کلام نظم و نثر میں رنگینی ایک جیسی پائی جاتی ہے۔ ہم نے ان اوراق میں اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا۔ یہ مشکل موضوع ہے۔ چند اشعار کا انتخاب کیا ہے جن کا تعلق زیرِ بحث سے ہے۔ اگر بیدل کی شاعری پڑھتے تو متقدمین اور معاصرین کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑتا۔ خود بیدل اسے مذموم قرار دیتا ہے۔ ہمیں مرزا اسداللہ خاں غالب کا ذکر ضرورتاً اس لئے کیا ہے کہ ایک اہل الرائے نے غالب کے کلام کو سراہتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا کہ بیدل نے فارسی شاعری کو بگاڑ دیا تھا جس کی اصلاح غالب نے کی۔ اس لئے مجبوراً ہمیں اس دعوے کا جائزہ لینا پڑا۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم دبیر الملک اسداللہ خاں غالب کے فارسی کلام کی قدر و منزلت کم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی سخن گسترانہ بات اس ضمن میں آگئی ہے تو اس کو ان معنوں میں محمول نہ کیا جائے۔

کلیات میں مثنوی عرفان، طلسم حیرت، طورِ معرفت، دیوان، رباعیات، قصائد، قطعات نظم میں ہیں۔ نثر میں چہار عنصر (نکات کی تشریح نظم میں) اور رقعات ہیں۔ تسلسل قائم رکھنے کے لئے جو ہمارے پیش نظر موضوع ہے ہم نے اگرچہ علاحدہ علاحدہ ہر ایک جزو کلیات کو ان اوراق میں جگہ دی ہے۔ مگر جیسا کہ خود بیدل نے نثر کو غزل و رباعی و قطعہ سے مرتب کیا ہے ہم نے بھی اس کا اتباع کیا ہے۔ بیدل نے ایک یا دو رسالے اور بھی لکھے ایک کا نام وہ کلیات کے دیباچہ میں بھی لکھتا ہے۔ لیکن یہ کتاب اب نایاب ہے۔

آخر میں یہ انتباہ بھی بے محل نہ ہوگا جیسے مولانا روم ان لفظوں میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

نطق آب و نطق باد و نطق گل
ہست محسوس حواسِ اہلِ دل

ایک عالم حکیم کے احساسات کا فہم عوام کو نہیں ہوتا۔ اور بعض "ذہن" کی ساخت ہی عام ڈھال سے کچھ علاحدہ ہوتی ہے جو کچھ وہ مشاہدہ کرتے ہیں وہ ماو شما نہیں کرتے۔ بیدل نے چہار عنصر میں بعض واقعات قلم بند کئے ہیں، جس کا وہ خود شاہد ہے۔ ان کی توجیہ کسی علم کی شاخ سے ہم نہ کرسکیں تو نقص ہمارے علم میں ہے۔ واقعات واقعات ہی ہیں ان کا انکار تو نہیں ہو سکتا۔ عدم علم، علم عدم نہیں ہے۔ اور یہ ممکن ہے بلکہ یقینی ہے کہ ذہنی ارتقاء کے ساتھ ان کی بھی توجیہ عقلاً ہو سکے گی۔

فیض معنی در شعور تعلیم ہر بے مغز نیست
نشہ را چوں بادہ نتواں در دل پیمانہ ریخت

ہم نے ان اوراق میں علامہ اقبال کی ایک نظم درج کی ہے جو بیدل کے ایک شعر پر تضمین ہے۔ وہ کافی انتباہ ہے۔

چہار عنصر

بیدل کا کلام اس کے سوانح حیات ہی ہیں۔ اس کے مشاہدات و احساسات و افکار کا مجموعہ ہے۔ چہار عنصر میں اس نے وہ واقعات جنھیں عرفِ عام میں سوانح زندگی کہتے ہیں خود قلم بند کئے ہیں۔ تذکروں میں بھی میر غلام علی آزاد بلگرامی وغیرہ نے بیدل کے حالات لکھے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ اصل چغتائی برلاس ہے۔ ۱۰۵۴ ہجری میں بلدہ عظیم آباد پٹنہ میں ولادت واقع ہوئی۔ تاریخ ولادت بیدل خود لکھتا ہے ؎

بسالے کہ بیدل بملک ظہور　　ز فیض ازل تافت چوں آفتاب
بزرگے خبردار از مولدش　　کہ "فیض قدس" است و "ہم انتخاب"

بیدل کی پیدائش شاہ جہاں کے عہد میں ہوئی۔ مغلیہ شہنشاہیت انتہائی عروج پر اورنگ زیب عالمگیر کے دورِ حکومت میں تھی اس دور سے گزر کر جانشین شاہانِ مغلیہ کا عہد بھی محمد شاہ رنگیلے تک پایا۔ یعنی یہ ایام بھی دیکھے، جب مغلیہ سلطنت پستی کی طرف جارہی تھی۔ یہ چراغِ سحری ٹمٹمارہا تھا اور آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر پر گُل ہو گیا۔

بیدل مؤرخ نہیں۔ اگر وہ اپنے زمانہ کی تاریخ قلم بند کرتا، تو نہایت معتبر

ہوتی۔ کیونکہ وہ جو کچھ لکھتا ہے اس کا صحیح مشاہدہ ہے۔ اس کے رقعات اور چہار عنصر اور بعض رباعیات میں ان واقعات کی طرف بھی اشارہ ہے جو اس کے اپنے زمانہ میں رونما ہوئے۔

"چہار عنصر" بیدل نے اکتالیس برس کی عمر میں لکھی۔ یہ کتاب نثر میں ہے۔ اس میں چند اللہ والوں کا تذکرہ ہے جن کی صحبت اکسیر اثر نے مرزا کو کیمیا بنا دیا۔ وہ انہی کی مدح میں رطب اللسان ہے۔ اور ان شعراء کی دریوزہ گری کی مذمت کرتا ہے کہ فطرت نے ان کو ذہن روشن عطا کیا، لیکن امراء و وزراء کی مدح سرائی میں صرف کیا ؎

ای بسا معنی روشن کہ ز حرص شعرا — خاک جولانگاہ اسپ و خر اہل جاہ است
وی بسا نسخہ کہ در مکتب تشویش طبع — روسیاہ ابد از مدح و وزیر شاہ است
صلہ مشتاق گرا طبع ز مضمون بلند — گر ہمہ پائے بر افلاک نہد در چاہ است
مرجع معنی این شست خیالاں دریاب — تا بدانی چہ قدر فطرت شاہ کوتاہ است

مادح اہلِ صفا باش کہ در علم یقیں
وصف این طایفہ تفسیر کلام اللہ است

وہ ان گدا طبع دریوزہ گر شعرا کو شیطان پرست اور ان کی شاعری کو محض شیطنت سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے ممدوح شاہ و وزرا و امرا کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے :۔

ایکہ تعریف سلاطیں کردۂ — تو بادشاہوں کی مدح گوئی کرتا ہے تو
مشق تعلیم شیاطیں کردۂ — سمجھ لے کہ شیطان تیرا معلم ہے جو کچھ
چیست تعلیم شیاطیں حب جاہ — تجھے سکھاتا ہے وہی کچھ تو کہتا ہے،
ای شیاطیں مرشدت رویت سیاہ — یہ شیطانی علم کیا ہے؟ حب جاہ ہے
فخر طبعت مدح شاہی بیش نیست — تیرا اُستاد اور پیشوا شیطان ہے،
کانہمہ تخت و کلاھی بیش نیست — ابدی روسیاہی کے سوا تجھے اور کیا

امتیاز تا بمانی شاہ کیست
این قفس پروردہ وہم جاہ کیست
بر سرش افتادہ آں زریں رخام
آمدہ پایش بسنگے تخت نام
تخت سیم و افسر زریں دو سنگ
او چو آتش درمیاں ایں دو سنگ
فی الحقیقت آتش است ایں شاہ نیست
لیک ہر آتش پرست آگاہ نیست
قرب ایں آتش بلائی جانِ تست
برق دین و خرمنِ ایمانِ تست
گر بہ بزم شاہ قرب اندیشۂ
بیگماں زردشت کافر پیشۂ
رفتہ گیر آئینۂ زینت زدست
نیست ہرگز حق پرست آتش پرست

ملیگا تو اتنی بات پر فخر کرتا ہے کہ بادشاہ کا درباری شاعر ہوں یہ تو سمجھ کہ بادشاہ خود کیا بلا ہے۔ ایک تخت و تاج ہی تو ہے، اور دونوں پتھر۔ ایک سر پر پڑا دوسرا پاؤں کے نیچے تخت بن گیا چاندی کا تخت اور سونے کا تاج جمادات ہی تو ہیں۔ ان دو پتھروں کی رگڑ سے آگ پیدا ہوتی ہے، اس کا نام ہے بادشاہ‘ لیکن ہر ایک اگنی کا پوجاری اس حقیقت سے آگاہ نہیں، یہ آگ تیرے دین پر بجلی بن کر گرتی ہے اور تیرے خرمن ایمان کو جلا کر راکھ کرتی ہے، اگر تو بادشاہ کا مقرب ہے تو بلا شبہ تو آتش پرست کافر ہے، تیرا دین ایمان گیا، آتش پرست کبھی حق پرست نہیں ہو سکتا۔

❖ ❖ ❖

کافر دین اور ایمان تو سنتے آئے تھے لیکن بیدل نے فتوائے کفر شعر و شاعری ان شعرا کے حق میں بھی صادر کیا جو سلاطین اور وزرا کی شان میں مدحیہ قصائد لکھتے رہے۔ ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ شعرا حرص کی وجہ سے اپنے معنی روشن کو امرا کے گھوڑوں کے پاؤں کی خاک میں ملاتے ہیں۔ اکثر شعراء نے بادشاہوں کے گھوڑوں کی تعریف میں قصائد لکھے۔ انسان اشرف المخلوقات اگر اسپ و خر کی مدح کرے تو ان سے بھی گیا گزرا۔ اور وہ بھی خر دماغ ہی تھے جو اپنے گھوڑے کی تعریف سن کر انعام و اکرام سے شعرا کو مالا مال کر دیتے۔ اسی ضمن میں لکھتا ہے کہ حمد و ثنا تو خاص حق تعالےٰ کے لیے ہے۔ مگر ذات باری

کا کمال ہماری حمد و ثنا سے بے نیاز ہے۔ البتہ "اگر با نجمن مدح خاصانش بار توفیق توانی یافت، حصول دولت عظمیٰ پندار، و اگر بمحفل وصف مقربانش راہی توانی شگافت، وصول مقصد اقصیٰ شمار" اگر خاصاں و مقرباں بارگاہ الٰہی کی مدح کی توفیق حاصل ہو تو یہ سمجھ کہ تجھے سعادت دارین ملی۔ اور وہ اعلیٰ مقصد تجھے حاصل ہو گیا جو دُنیاداروں کو نصیب نہیں۔

بیدل ان لوگوں میں سے نہیں تھا کہ "ناصح برائے دیگراں" ہوتے ہیں۔ اس نے کبھی کسی امیر و وزیر کی مدح میں کچھ نہیں لکھا۔ اوائل عمر میں شہزادہ محمد اعظم پسر عالمگیر کی ملازمت اختیار کی۔ شہزادہ کی مجلس میں شعرائے عصر کا ذکر ہو رہا تھا۔ حاضرین میں سے کسی نے بیدل کی تعریف میں کہہ دیا کہ بلند فکر کا مالک ہے۔ شہزادہ نے کہا کہ اسے کہو کہ میری مدح میں قصیدہ کہے تا کہ اس کی شاعری کی حد بھی معلوم ہو جائے۔ بیدل نے سُنا تو بخشی سرکار کو استعفا حوالہ کیا۔ بیدل کی تصانیف میں "رقعات" بھی ہیں۔ یہ سب اس کے عقیدت مند دوست تھے۔ جن سے خط و کتابت تھی۔ ان کی تعریف میں نثر و نظم میں چند فقرات لکھ دیتا ہے۔ ان میں سے شکر اللہ خان اور شاکر خان دو بھائی شاہ عالمگیر کی فوج میں افسر تھے۔ شکر اللہ خان ولایات دہلی وغیرہ کا صوبہ دار بھی رہا۔ عموماً اپنا کلام بغرضِ اصلاح پیش کرتا۔ اس خاندان سے بیدل کے تعلقات مدت العمر رہے۔ مغلیہ دور دورہ میں عموماً وزراء و اُمرا سخن گو تھے۔ اور اہلِ سخن کی حوصلہ افزائی بھی کرتے۔ شکر اللہ کے منصب میں جب کبھی اضافہ ہوتا، بیدل رقعہ میں مبارک باد کے ساتھ قطعہ تاریخ بھی لکھ دیتا۔ چنانچہ ایک رقعہ میں کہتا ہے کہ ؎

شکر خدا کہ صاحب ما را ز فضل حق جمعیت اضافہ اقبال سرمدیست
تا شکر ایں عطیہ بروں آید از حساب تاریخ او مراتب تائید ایزدیست

میواتی سخت شورہ پشت قوم تھی۔ گاہے گاہے شاہی فوج ان کی سرکوبی کرتی رہتی۔ مگر یہ پہاڑوں میں بیٹھ کر حکومت کو اکثر پریشان کرتے۔ ان کا

سردار "بجے رام" تھا۔ اس کے سات بیٹے تھے۔ ایک دفعہ تو وہ ہڑبونگ مچائی کہ رعایا ان کی لوٹ کھسوٹ سے تنگ آگئی۔ بادشاہ نے شکراللہ خاں کو مامور کیا۔ اس نے تھوڑے عرصہ میں امن قائم کردیا۔ میوات کی صوبہ داری اسی صلہ میں عالمگیر نے شکراللہ خان کو تفویض کی۔ اس فتح کی مُبارکباد اور تاریخ فتح بھی بیدل نے ایک رقعہ میں لکھ کر ارسال کی ؎

سرخیل نرو کہ با بجے رام	از باد و بروت پشم در دست
با ہفت پسر کہ ہر کدامش	چوں کوہ سرے بہ تیغ می بست
عمرے در کوہسار میوات	می بود چو خرس از خودی مست
با شکر خان آسماں جاہ	گردید طرف ز فطرت پست
یعنی بہ پناہ قلعہ کوہ	بر جنگ مبارزاں کمر بست
آتش زندہ بہادراں خورد	چندانکہ ز سنگ چوں شرر جست
بگریخت بصد ہزار تشویش	تا از دم تیغ بی اماں رست
در تاریخش مہندس فکر	فرمود دل نرو کہ بشکست

۱۱۰۷ھ

۱۱۰۶ھ میں بھی کسی مہم پر شکراللہ خان کامیاب رہا۔ بارہ فقروں کا ایک رقعہ لکھا۔ ہر ایک فقرہ تاریخ فتوحات ہے۔ ۱۱۱۴ھ میں جب شکراللہ خان کو منصب صوبہ داری میوات تفویض ہُوا تو نو فقروں کا ایک رقعہ لکھا ہر ایک فقرہ تاریخ مبارکباد ہے۔ آخری فقرہ "خان صاحب مبارک باد" ہے۔

شاہ عالمگیر نے ۱۰۹۷ھ میں بیجاپور اور دوسرے سال گولکنڈہ فتح کیا، بیدل نے ایک رقعہ میں نواب شکراللہ خان کو قطعہ تاریخ لکھ کر بھیجا۔ اور یہ فقرہ بھی لکھ دیا کہ "للہ الحمد اندیشۂ دعاگو بہانہ جوئی تقریبی است کہ بآں وسیلہ تحفہ فقرا پیش گزار دیا مصرعی در آنجناب معروض دارد و گرنہ چہ نواب و کدام مستطاب بلکہ چہ عالمگیر و کدام بدر منیر بطریق شوق بے پروا نگاشتنی دارد، و آہنگ ساز

بے نیازی سراز پردہ برمی آرد"۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیدؔل کو شاہ عالمگیر سے کچھ عقیدت ضرور تھی۔ اس لئے شوقیہ قطعہ تاریخ کہہ دیا اور ساتھ ہی اپنے استغنا کا اظہار بھی کر دیا کہ یہ قطعہ کسی صلہ کی اُمید پر نہیں لکھا گیا۔ قطعہ حسب ذیل ہے :۔

شاہ عالمگیر یعنی حضرت اورنگ زیب — آنکہ دارد تکیہ بر شمشیر او فتح و ظفر
عزمش از اقلیم دہلی کرد آہنگ خروج — تا کند بنیاد شاہاں دکن زیر و زبر
اولیں سالے کہ فتح ملک بیجاپور بود — در غل و زنجیر رفت اسکندر از طوق و کمر
تاخت بر گلکنڈہ رایات ظفر سال دوم — ہمچناں در قلب قطب الملک طوفاں داد سر
گشت از روئے جمل در دیدہ اہلِ حساب — سال فتح اولیں "جمشید نصرت" جلوہ گر

۱۰۹۷ھ

خواستم روشن شود آئینۂ فتح دوم — دار شوخیہائے ادراکم دریں مصرع خبر
ہست ایک معنی کہ تعبیر از دو تاریخش کند — اعظم مطلوب "فتح بادشاہ نامور"

۱۰۹۸ھ ۱۰۹۸ھ

چھ سال چھ ماہ کی عمر تھی کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ یہ دُرِ یتیم والدہ کی آغوشِ تربیت میں تعلیم پاتا رہا۔ دس سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کیا۔ اس کے بعد صرف و نحو عربی پڑھی۔ چچا مرزا قلندر کفیل رہا۔ بیدؔل طالب علمی کے زمانہ کا ایک واقعہ لکھتا ہے کہ جب "احاد" یعنی نو سال سے گزرا تو "عشرہ" یعنی دہائی میں داخل ہوا۔ ایک ہم درس ہمیشہ مُنہ میں قرنفل (لونگ) رکھتا، جب بولتا تو اس کے مُنہ کی خوشبو سے مخاطب کا دماغ معطر ہو جاتا۔ میں نے ایک رباعی کہی ؎

یارم ہرگاہ در سخن می آید — بوئے عجبش از دہن می آید
ایں بوئے قرنفل است یا نکہتِ گل — یا رائحۂ مشکِ ختن می آید

یہ رباعی مشہور ہوئی تو بعض تو حیران ہوئے کہ اس نو عمری میں یہ کلام اور اکثر نے کہا کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک طفل مکتب ایسی برجستہ رباعی کہے۔ غرض جتنے مُنہ اُتنی باتیں۔ میں نے عہد کر لیا کہ آیندہ جو کچھ کہوں گا کسی کو نہ سُناؤں گا۔ مشق تو

جاری رہی مگر کسی کو علم نہ تھا۔

بیدل کے خاندانی شیخ طریقت مولانا شیخ کمال قادری قصبہ رانی ساگر میں جو ملک "بہار" میں واقع ہے اقامت پذیر تھے۔ بنارس سے ایک فرسخ کا فاصلہ ہے۔ بیدل کا چچا مرزا قلندر بھی حلقہ ارادت میں داخل تھا۔ بیدل کو بھی اپنے ساتھ زیارت شیخ کیلئے لایا۔ بیدل چہار عنصر میں مولانا کے زہدو تقوٰے اور تشرع کی بہت تعریف کرتا ہے۔ کہ آپ کا شہرہ باہر اور گردو نواح میں اس حد تک تھا کہ لوگ بصد عقیدت و ارادت حاضر ہوتے۔ اور آپ کا یہ اثر تھا کہ جو بھی ایک دفعہ آپ کے پاس آتا کم از کم منہیات شرعیہ سے ہمیشہ کے لئے تائب ہو جاتا۔ اور بعض ایسے بدقسمت ازلی بھی تھے کہ آپ کے قریب آنے سے ڈرتے تھے۔ کہ مبادا آپ کی صحبت کے اثر سے اور جذبہ توجہ سے فسق و فجور سے ہاتھ دھونا پڑے۔ مولانا لوگوں کو وظائف بتاتے۔ اور جو کچھ مرزا قلندر کو تلقین فرماتے بیدل خاموشی سے اخذ کرتا رہتا۔ و رتنہائی میں لکھ لیا کرتا۔ مولانا کے پاس اکثر بیمار بھی آتے، اور آپ جو کچھ پڑھ کر دم کرتے بیدل یاد رکھتا۔ بعض اوقات تعویذ بھی لکھ کر دیتے۔ بیدل کہتا ہے کہ میں بھی بیمار وں پر اس کا تجربہ کرتا رہا۔ "اگرچہ اس قسم کی حرکات کی وضع کھیل تماشہ ہی تھا مگر رحمتِ ایزدی بہانہ جو ہے بیمار صحت یاب ہو جاتے"۔ مرزا قلندر کو بھی اس کا علم تھا۔ مولانا کی خدمت میں حالات بیان کرتے تو آپ خوش ہوتے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ گلی میں لڑکوں کے ساتھ کھیل میں مشغول تھا۔ اتنے میں ایک لڑکے نے کہا کہ اس گھر کے صاحب خانہ کی زوجہ آسیب جن میں مبتلا ہے۔ گذشتہ دو شبانہ روز سے غلبہ اس حد تک ہے کہ بے ہوش پڑی ہے اور شاید کوئی دم کی مہمان ہے۔ کئی عزائم خواں آئے مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ میرے دل میں شوق بے پرواہ نے چٹکی لی۔ ایک محرم خانہ کو بلوایا اور اس کی انگلی پر اسم اعظم دم کیا۔ اور حسب تلقین مولانا شیخ کمال ہدایت کی کہ مریضہ کے کان میں انگلی ڈال دو۔ اس نے تعمیل کی۔ بمجرد عمل گویا نیزہ دیو رجیم کے سینہ میں لگا۔ دود سپند کی طرح چلایا۔ اور فوراً مریضہ سے جدا ہو گیا۔ یہ واقع ایسا نہ تھا کہ

شہرت نہ ہوتی۔ مولانا نے بھی سُنا۔ مجھے بُلوایا اور کمال التفات سے پوچھا کہ تُو نے کونسا عمل کیا ہے۔ یہ بات محض حرف و صوت وظائف اور تعویذوں سے حاصل نہیں ہوتی۔ میں نے عرض کی کہ حضور ہی کی عنایت ہے اور آپ ہی کا فیض ہے۔ مولانا بہت خوش ہوئے۔ ایک کتاب جس میں اعمال غریبہ وغیرہ مذکور تھے مجھے عنایت کی۔ اور فرمایا کہ میں نے اس عرصہ تک فوائد علمی جو کچھ جمع کئے اس میں درج ہیں۔ "باخبر باش کہ تیرا طالع سلیمانی نظر ہے اور تیرا دم عیسوی اثر ہے۔ ان اشغال میں سے جو اس میں مندرج ہیں تو جس میں مشغول ہوگا مبارک ہوگا"

بیدل لکھتا ہے کہ اس دن کے بعد میں نے جو بھی عمل کیا اس کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔ حالانکہ لوگ ایک عمر کوشش کرتے ہیں پھر بھی گُلِ مقصود ہاتھ نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلے فطری قابلیت اور اس کے بعد مناسب اسباب جمع ہوں تو نتیجہ خاطر خواہ ہوتا ہے۔

فانوس شمع ہا اثر قابلیت است ۔ بیرنگ ہیچ جلوہ مصوّر نمی شود

شمع میں قابلیت موجود ہے۔ اور اسی قابلیت کا اثر ہے کہ جلانے سے جلتی ہے ورنہ جس جلوہ میں کوئی رنگ نہ ہو اس کی تو کوئی صورت ہی محسوس نہ ہوگی۔

از شعلہ کسب نور چراغ فسردہ را
بے روغن و فتیلہ میسر نمی شود

چراغ بجھا ہُوا ہو، ہزار شعلہ دکھاؤ کبھی روشن نہ ہوگا جب تک اس میں تیل اور بتی نہ ہو۔ جب یہ مناسب اسباب جمع ہونگے تو چراغ فسردہ شعلہ سے کسب نور بھی کرے گا۔

ساحل کہ اصل طینش از جوش تشنگی است
دریاست در کنار و لبش تر نمی شود

ساحل کی طینت میں وہ فطری قابلیت نہیں کہ اس کی خشکی دور ہو۔ اگرچہ دریا اس کی کنار میں ہے مگر اس کے لب تر نہیں ہوتے۔

آئینہ آب دارد و نم آشکار نیست
در سنگ آتش ست و منور نمی شود

آئینہ میں آب تو ہے مگر بے نم ہے۔ اسی طرح پتھر میں آگ موجود ہے وہ خود روشن نہیں ہوتا وہ ہمیشہ تاریک ہی رہے گا۔

صدیق وار فیض ازل را نتیجہ ہاست
بوجہل راز دار پیمبر نمی شود

ہر ایک شخص کی فطرت میں خاص خاص قابلیّت فیض ازلی ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے آں حضرتؐ کے دعوائے رسالت کی فوراً تصدیق کی۔ لیکن عمر بن ہشام جو ابوجہل کے نام سے مشہور ہوُا، آخر دم تک منکر ہی رہا۔ اس میں نہ قبولیت کی صلاحیت تھی اور نہ اس نے قبول کیا۔ خواجہ حافظ کہتا ہے کہ

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از شام
ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبیست

خواجہ حسن بصریؒ تابعین میں سے ہیں اور حضرت بلالؓ مؤذن حبشی اور حضرت صہیبؓ دونوں اصحاب رسول کریم ہیں، تینوں سے آں حضرت کا کوئی تعلق قرابت نہ تھا۔ ابوجہل قریشی اور اس سے قرابت بھی تھی اور مکّی بھی تھا۔ اوّل الذکر تین تو آسمانِ اسلام کے درخشندہ ستارے ہیں، اور ابوجہل محروم ہی رہا۔

بیدل جو واقعہ بیان کرتا ہے اس سے ایک نتیجہ بھی اخذ کرتا ہے، اور اس پر حکیمانہ بحث بھی کرتا ہے، ہمارے زمانہ میں وظائف اور اوراد اور تعویذ اور اس قبیل کے عملیات پر تعلیم یافتہ طبقہ کا ایمان نہیں۔ عموماً جہلا ہی ان کی تاثیر پر یقین کرتے ہیں۔ بیدل نے اشعار مذکورہ میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ "سخن" کا اثر ضرور ہوتا ہے مگر "سخن گو" کی فطری قابلیّت اس میں کارفرما ہوتی ہے۔ یہ موضوع نفسیات کا ہے۔ انسان کو حیوانِ ناطق اسی لئے کہتے ہیں کہ دیگر طبقات پر اس کو "سخن" کی وجہ سے امتیاز حاصل ہے۔ لیکن انسانوں میں بھی تاثیر سخن کے مختلف

مدارج ہیں۔ خواجہ حافظ بھی فرما گئے ہیں ؎

چہ رشک می بری اے سست نظم بر حافظ
قبول خاطر و لطفِ سخن خداداد است

لیک موزونی نفس دگر است | آں نفس نیست مطلع سحر است
بحر صد رنگ موج و قطرہ شکست | آنچہ موزوں فتاد گوہر است
ہر کہ موزوں نباشد انساں نیست | فہم نیرنگ معنی آساں نیست
طبع موزوں نہ کسبی و عملی است | از عطیات فیض لم یزلی است
آدمی فطرتست و قطرہ نام | نیست روشن مگر ز لطف کلام
حُسن ایں شاہد سراپا ناز | جلوہ گر نیست جز بخلوت راز
بے تکلف حنا بچنگ نہ بست | تا دے خوں نکرد رنگ نہ بست

باتیں تو سب بناتے ہیں لیکن لطف کلام موزونی طبع میں ہے۔ اور یہ موزونیت کسبی نہیں بلکہ فطری ہے، عطیہ فیض رحمانی ہے "قبول خاطر و لطف سخن خداداد است"۔ بعض اشخاص کی تقریر میں وہ اثر ہوتا ہے کہ ہزاروں آدمی ان کی طرف کھچے چلے آتے ہیں۔ اور چند تقریروں سے انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ بات ہر ایک شخص کو نصیب نہیں۔

خامش نفسی کہ طبع موزوں دارد | صد غنچہ بہار راز دل پر خوں دارد
تسخیر پریزاد سخن آساں نیست | ایں جا نفس سوختہ افسوں دارد

بیدلؔ نے اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے۔ اس کا تعلق علم نفسیات و ارتقاء وغیرہم سے ہے۔ یہ بحث دقیق ہے اور بیدلؔ نے جن لفظوں میں بحث کی ہے وہ ادق ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ بیدلؔ کے نظریہ حکمت کو عام فہم عبارت میں واضح کریں۔

بیدلؔ لکھتا ہے کہ کل کائنات "کلمات" ہیں "قل لو کان البحر مداد الکلمٰت ربی لآیۃ" (کہف ع ۱۲)

بہر رنگ آیات حرف است و بس　　نفس در عبارات حرف است و بس
حقیقت کہ آں سوئے ما و من ست　　چو بے پردہ شد حرف پیراہن ست
چہ مقدار بے تاب اظہار شد　　کہ آخر در انساں نمودار شد

تمام کائنات ایک کتاب ہے۔ اور کائنات حروف ہیں یا کلمات ہیں، "ہر نقشے کہ می بینی حرفیست کہ می شنوی" اشیاء کائنات یا ان کے تصورات جو ہمارے قلب میں ہیں جن کو خیالات سے موسوم کرتے ہیں، فی الحقیقت حروف ہیں جن کے ذریعہ اشیاء کائنات ہم سے ہم کلام ہو کر اپنا ما فی الضمیر واضح کرتی ہیں۔ کتاب کائنات مصوّر ہے اور یہ تصویری حروف یعنی اشیاء کی صورتیں ہم دیکھتے اور سنتے ہیں، اس حقیقت پر تو کل حکماء کا اتفاق ہے کہ کوئی خیال بلا حروف قلب انسانی میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ حقیقت "کلمہ مجردہ" ہے، اور حقیقت مجردہ کا احساس ناممکن ہے۔ جب تک کہ وہ کسی صورت میں ہمیں محسوس نہ ہو، اور یہ صورتیں حروف ہیں، اس لئے بیدل کہتا ہے کہ وجود حقیقی مادہ سمع و نطق ہے "تحقیق جوہر نطق بی آئینہ سمع صورت وقوع نہ بندد، و یقین کیفیت سمع بے ظہور نطق بہ تحقیق نہ پیوندد" یعنی نطق اور سمع لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کی تصدیق دوسرے کے تصور کے بغیر ممکن نہیں۔

گر حرف یقین و گر گماں می شنوی　　از عالم بے نطق و بیاں می شنوی
خاموش شو و بہ بیں کہ بے گفت و شنود　　چیزی می گوئی و ہماں می شنوی

حقیقت مجردہ کلمہ بے حرف و صوت ہے، ما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیاً او من وراء حجاب (۴۲:۵۱)

کلام الٰہی حقیقت مجردہ ہے اور کسی انسان میں یہ تاب و طاقت نہیں کہ اس حقیقت پر مطلع ہو۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا وحیاً یا "من وراء حجاب"۔ "وحی" کلام ہے حروف کی صورت میں قلب انسانی سنتا ہے۔ بیدل "نکات" میں لکھتا ہے کہ "اگر بر نبوت ایمان داری با خطرات دلی جو بہ تعظیم پیش میا، و اگر بر تجلی یقین داری

بیچ جانب چشم بے ادب مکشا" "خطراتِ دل" تحریکات فطری ہیں۔ اسی کو وحی اور الہام اور القا سے موسوم کرتے ہیں۔ عام فہم لفظوں میں خیالات ہیں لیکن یہ کہاں سے آتے ہیں؟ کتاب کائنات سے "اتل ما اوحی الیک من الکتاب" (۲۹) اور "لدینا کتب ینطق بالحق" (۲۳) وحی بلنطہ ہوتی ہے اور اس کے فہم میں کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ حیوانات وحی کے تحت عمل کرتے ہیں اور کبھی غلطی نہیں کرتے، "من وراء حجاب" تصورات میں جو بیداری اور خواب میں رونما ہوتے ہیں، غلطی ان میں بھی نہیں، لیکن ان کی تعبیر کرتے ہوئے انسان غلطی بھی کرتا ہے۔ ان کا فہم تذکرہ و تدبر و تفکر سے عقلاً حاصل ہوتا ہے، یعنی اس نسبت کا دریافت کرنا جو صورتوں کو اپنے حقائق سے ہے لیکن

اے خدا بنما تو جاں را آں مقام
کاندراں بے حرف مے روید کلام

(مثنوی معنوی)

رباعی مذکورہ کا یہ مفہوم ہے کہ جو بھی دل میں خیال پیدا ہوتا ہے خواہ یہ یقینی ہو یا ظنی انسان کا پیدا کردہ نہیں وہ الہام کدۂ بے حرف و صوت سے نازل ہوتا ہے۔ ذرا خاموشی اختیار کرو تو معلوم ہوگا کہ تم خود ہی اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہو اور آپ ہی سنتے ہو۔ اس لئے "ہیچ صورتے در ذہن نقش نتواں بست کہ بخارج جلوہ ننماید، و ہیچ کیفیتے در خیال خارج جلوہ نتواں داد کہ بظاہر جام عبارتے نہ پیماید"

"آں رمز کہ سمع و نطق دریافتہ است نتواں گفتن باصرہ نشگافتہ است"
"شمعے کہ مقیم خلوت فانوس است چوں وانگری جملہ بروں تافتہ است"

دل میں کوئی تصور پیدا نہیں ہو سکتا جس کا مشاہدہ جزواً یا کلاً خارج میں نہ کیا ہو۔ اور دل میں کوئی کیفیت یا مافی الضمیر کا اظہار نہیں ہو سکتا جب تک عبارت تحریر یا تقریر میں نہ ہو۔ اس لئے جو کچھ ہم دیکھتے ہیں سنتے ہیں وہ ایک ہی حقیقت

ہے شمع گو فانوس میں مقیم ہے مگر اس کی روشنی فانوس اور شمع دونوں سے باھر جلوہ نما ہے۔ اقبال کے ہاں بھی اس کے مماثل یہ مضمون ملتا ہے۔ کسوت مینا میں مے مستور بھی عریاں بھی ہے "این جا متحقق گردیدہ سخن روح کائنات است و اصل حقیقت موجودات ہرگاہ باخفائے معنی کوشد جہانے را نفس وزدیدن ست، وچوں افشائے عبارت جوشد عالمے را برخود بالیدن" اس سے ثابت ہوا کہ سخن روح کائنات اور اصل حقیقت موجودات ہے۔ جب اپنے معنی کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ کائنات دم بخود ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔ اور جب عبارت میں ظاہر ہوتی ہے تو ایک عالم کی صورت میں جلوہ افروز ہوتی ہے۔

باخفا حقیقت، بافشا مجاز	بہ تشبیہ عالم، بہ تنزیہ راز
سہ حرف از کتاب کمالش "ابد"	"ازل" را ہماں از سہ حرفش سند
تامل بجدن، نفس در نبات	بحیواں صدا و در انساں لغات
چہ دنیا؟ رہ لفظ سر کردنش	چہ عقبیٰ؟ بمعنیٰ نظر کردنش
ز اسما اگر جملہ اسرار اوست	چو در جلوہ آید سخن نام اوست
ز اعجاز ایں عیسیٰ افسوں میرس	جہاں زندۂ اوست افزوں میرس
نہ ہستی ظہور انتظام است ازو	عدم نیز ممتاز نام است ازو
کدام است جاں آشنائی سخن	چہ مردن؟ تہی گشتہ جائی سخن
امم را رسول از سخن شد دلیل	نیاورد غیر از سخن جبرئیل
بفہمی اگر رمز لوح و قلم	بغیر از سخن چیست آنجا رقم
بسر رشتۂ وہم دیگر مپیچ	کہ غیر از سخن در جہاں نیست ہیچ

یہ کائنات عالم غیب و شہادت ہے۔ عالم غیب میں یہی سخن حقیقت ہے۔ اور شہادت میں مجاز سے موسوم ہے، غیب تنزیہ ہے اور یہ سخن تنزیہ میں راز ہے اور شہادت تشبیہ ہے اور ہم عالم اسی کو کہتے ہیں، کائنات کے دو کنارے "ازل" اور "ابد" ہیں۔ یہ فی الحقیقت اسی سخن کا کمال ہے۔ یہی حقیقت جمادات

میں خاموش ہے، اور نباتات میں نفس، اور حیوانات میں آواز، اور انسان میں لغات کی صورت میں مشاہدہ ہوتی ہے۔ دُنیا کیا ہے؟ اسی سخن کے الفاظ کی صورت۔ عقبیٰ کیا ہے؟ اسی کے معنی کا مشاہدہ۔ اسی سے جہان زندہ ہے۔ یہی روح کائنات ہے۔ ہستی کا نظم و نظام اسی سے قائم ہے، بلکہ عدم بھی اسی کی وجہ سے نام سے ممتاز ہوا، جان کیا ہے؟ جو سخن سے آشنا ہو۔ موت کیا ہے؟ سخن کی جگہ خالی ہونا۔ زندے ہی باتیں کرتے ہیں مُردے خاموش ہیں۔ یہ سخن (وحی) ہی ہے جس سے رسول اُمت کی رہنمائی کرتے رہے اور جبرئیل نے سخن کے سوا کچھ اور نازل نہیں کیا۔ اگر لوح و قلم کی رمز سمجھے تو معلوم ہوگا کہ لوح پر سخن ہی رقم ہے اور قلم سخن ہی لکھتا ہے۔ زیادہ وہم میں نہ اُلجھ اتنا سمجھ لے کہ جہاں میں سخن کے سوا اور کچھ نہیں۔ مختصر یہ کہ محسوسات عالم صورت حروف کی مثل ہیں عقبیٰ عالم حقیقت معنی کی مانند ہے۔

بیدل نے طویل بحث اس موضوع پر کی ہے اور اسی سے استدلال "وحدت وجود" پر بھی کرتا ہے اس پر بحث ہم مناسب مقام پر کرینگے۔ سر دست تحقیق بیدل یہ ہے کہ حقیقت سخن "ارادہ محض" اور "امر الٰہی" ہے۔

کہ ایں صدا نغمۂ ساز کن ‏ ‏ ‏ ہماں دستگاہ ظہور سخن

"بدیع السمٰوٰت والارض وإذا قضی امراً فانما یقول له کن فیکون" (۱/۱۴)

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا جب کوئی امر مقرر فرماتا ہے تو اتنے کہنے پر کہ ہو جا وہ ہو جاتا ہے۔

"انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول له کن فیکون، فسبحٰن الذی بیدہ ملکوت کل شی والیه ترجعون" (۲۳/۴)

یہ تو صرف اس کا امر ہے جب کسی شے کا ارادہ فرماتا ہے تو اتنے ہی کہنے پر کہ ہو جا وہ امر ظہور میں آتا ہے پس وہ ذات پاک ہے جس کے دستِ قدرت میں ہر ایک شے کی بادشاہی ہے اور تمام امور کا رجوع بھی اسی کی طرف ہے۔

خاصان بارگاہ الٰہی اسی امر اسی ارادہ الٰہی کے تحت ہوتے ہیں۔ انہیں معیت حق حاصل ہوتی ہے "گفتۂ او گفتۂ اللہ بود، گرچہ از حلقوم عبداللہ بود" مقربان بارگاہ الٰہی کا کیا مذکور ہے، عوام الناس بھی جب کسی امر کا ارادہ کرتے ہیں تو مناسب اسباب کے ساتھ ظہور میں آجاتا ہے۔

قصبہ رانی ساگر سے ایک کوس کے فاصلہ پر سرائے بنارس میں ایک مجذوب "شاہ ملوک" نامی کی رہائش تھی، "مدتے چوں سایہ بہ پائی درخت درکشیدہ بود" ایک عرصہ سے ایک درخت کے نیچے سایہ کی طرح مقام تھا۔ برہنہ سایہ کی طرح گرم و سرد سے بے خبر تھا۔ دور و نزدیک سے ارادت مند آتے۔ بیدل بھی گاہے گاہے ادھر آنکلتا۔ شاہ صاحب عموماً بڑ ہانکتے رہتے۔ مگر اس ضمن میں باتیں پتہ کی کہتے۔ ایک روز حضرت شیخ کمال مریداں باصفا کو منازل سلوک تلقین فرمارہے تھے، فرمایا کہ ایسے لوگوں کی مجلس سے احتراز کرنا چاہئے جو "جنون کسوت" اور "وحشی مزاج" ہیں اور لوگ ان کو مجذوب خدا رسیدہ سمجھتے ہیں؛ "اگر در بزم صحبت برہنگی از شرائط معقول ہست خرس و بوزنہ افضل ادب کستان خواہد بود، و اگر ہنگام تکلم کف بدہان آوردن از قواعد فصاحت باشد شتر را افصح معنی بیاناں تصور باید نمود۔" یعنی اگر کسی ننگے کی صحبت میں بیٹھنا کوئی معقول بات ہوتی تو ریچھ اور بندر سے بڑھ کر آداب سے واقف اور کون ہوتا اور بڑ ہانکتے وقت منہ سے کف جاری ہونا قواعد فصاحت میں داخل ہوتا تو اونٹ سے بڑھ کر فصیح کلام کس کا ہوتا۔ انسان صاحب "احسن تقویم" ہے۔ اس کو اس رسوائی میں مشاہدہ کرنا بصر و بصیرت کی توہین ہے۔

انبیاء صاحب دعوت بودند | صورت و معنی الفت بودند
عمرہا از اثر سعی و فاق | عرضہ دادند طریق اخلاق
تا نوزاں شوہ مکرّم گشتی | غو بیت محو شد آدم گشتی
اگر ایں وضع بقانون می بود | ہمہ کس اُمت مجنوں می بود

انبیاء لوگوں کے اخلاق درست کرنے کے لئے مبعوث ہوتے رہے اور انہی کے "اُسوۂ حسنہ" اور تعلیم و تربیت کا اثر ہے کہ انسان جو پہلے غول بیابانی کی طرح رہتا تھا آدم بنا۔ اگر یہ وضع جوان برہنہ مادرزاد لوگوں نے اختیار کر رکھی ہے انسانیت ہوتی تو پھر تمام لوگ اُمتِ مجنوں ہی کیوں نہ ہوتے۔

اِدھر تو مولانا شیخ کمال یہ پند و نصائح ارشاد فرماتے، اُدھر شاہ ملوک اپنی بڑ ہانکتے کہ :-

آفتاب کو برہنہ تصوّر کرنا اور آنکھیں چُندھیائیں اور چشمِ انصاف پر پردہ ڈالیں تو اثر خفاشی ہے نہ بینائی "بس مژگاں نمی تواں بست تا غفلت در بی نکشاید و چشم نتواں پوشید تا خواب نما بہ نماید" یہاں برہنہ کون ہے کہ جسے تکلّف سے چھپایا جائے اور مستور کون ہے کہ اسے ظاہر کرنے کی کوشش کی جائے۔ تقوےٰ یہ ہے کہ ماسوائے کے وسوسوں کی طرف توجہ نہ ہو نہ کہ اشیاء کے حُسن و قبح کی تفتیش کی جائے۔

مخور از پاکیٔ داماں زاہد	فریب نور بے ایمان زاہد
صفا در جُبہ و عمامہ اش صرف	طلسم قیرزو اندودۂ برف
چو آتش ظاہر و باطن تباہی	بسرخ اکستر و در دل سیاہی

لیکن اکثر دیکھا گیا کہ کبھی مولانا کمال کا گذر اس طرف ہوتا حضرت مجذوب "بے اختیار خود را بمرقع بپیچیدے و بصد دل تنگی غنچہ مقیم پردہ کسوت گردیدے"۔ مجذوب اپنی برہنگی چھپاتا اور شاہ صاحب بھی بلا توقف گُزر جاتے۔

مولانا یہ بھی فرمایا کرتے کہ اکثر لوگ صاحب عقل و ہوش ہیں اور تمیز خیر و شر بھی کرتے ہیں، مگر بظاہر دیوانہ بن جاتے ہیں تاکہ تکالیف شرعیہ سے معذور سمجھے جائیں اور باوجود قوّتِ عمل بیکاری اور کاہلی وسیلہ تن آسانی اختیار کرتے ہیں۔ اور بعض "جنون سیرت" ارباب سلوک کی نسبت طنزاً عبارت عقلی کے ساتھ فقرے چُست کرتے ہیں جب علم معقولات سے ان کو اتنا بہرہ ہے تو حفظ مراتب میں مجہول کیوں

بنتے ہیں۔

جمعی از پیش خویش آگاہ اند　　بر فلک رفتہ اند و در چاہ اند
ہمچو فرزیں بکج خرامی جہل　　ہمعنان عزیمت شاہ اند
بسہا تا رساندہ ظرف فروغ　　طشت خورشید و ساغر ماہ اند
بحر پیمائی رشحۂ شبنم　　کوہ پرواز و پرہ کاہ اند

تا نگردند خاک جادۂ شرع
گر ہمہ منزل اند گمراہ اند

بعض لوگ غلط فہمی سے فریب نفس میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ ہم ان تکلّفات اور تصنّع سے آزاد ہیں۔ بیدل نے پتہ کی بات کہی کہ تمام کائنات میں تکلف و تصنّع محسوس و مشہود ہو رہا ہے "در عالم ظہور انسانی کہ انجام مراتب حقیقت است۔ بے تکلّف بودن خجلت تحصیل کمال است، و بے تصنع زیستن باعث تشویر و انفعال"

در صومعہ باید بتواضع بودن　　در مصطبہ سرخوش تجرع بودن
یعنی نقص حقیقت یکرنگی است　　در عالم صنع بے تصنع بودن

ارباب تحقیق دریا کے دل میں رہتے ہوئے تو ہم ساحل میں مقیم ہوں تو سمجھنا چاہیئے کہ "خاک بر سر دانش کردن است"، اور اہل یقین تماشہ گاہ میں خیال شب میں آنکھیں موندھ لیں تو بصر و بصیرت کی مٹی خراب کرتا ہے۔

ایک دن قلندروں کی ایک جماعت شاہ صاحب کے پاس آنکلی۔ اور اس "شیر بیشۂ جلال" سے بے ادبی کے ساتھ پیش آئے۔ یہاں تک کہ زبان سے ہاتھوں پر اتر آئے۔ ناگاہ برق غیرت شاہ صاحب کی زبان پر شعلہ بار ہوئی اور رعد کی طرح گرج کر کہا کہ "کتو اس خرقہ میں کچھ نہیں اپنا پوست پھاڑو" یہ سننا تھا کہ سب ایک دوسرے پر چوب و خشت سے حملہ آور ہوئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ "خرقہائے ہستی دریدند و بہاں غبار فتنہ خاک گور بر سر ہم پاشیدند"

الحذر ای غافل از چشم بخود پیچیدگاں ای بسا کشتی کہ در طوفان این گرداب رفت
ہر کجا بینی مراقب طینتی تسلیم شو ہم بپایہ سجدہ باید بر در محراب رفت
کیمیائی دانشی گر کردہ کسب ادب مست جو اکسیر چوں بیتابی از سیماب رفت
جان از راز ادب الفت پرست پیکر است آبروئے زندگی ہم رفت چوں آداب رفت

بیدل یہ جاننے کے لئے مضطرب تھا کہ "آں خمکدہ عالم اسرار از چہ کیفیت مترنم قلقلہ جوش است" کیا بات ہے کہ شاہ صاحب اس حالت میں ہیں اور وہ کیا شئے محرک سلسلہ خروش ہے، اس لئے بوقت فرصت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ شاہ صاحب بھی مہربانی فرمانے لگے۔ ایک روز فرمایا کہ جو میں کہوں لکھتے جاؤ۔ بیدل تین شبانہ روز لکھتا رہا۔ قریب چالیس بیت لکھے۔ شاہ صاحب ایک شعر پڑھتے اور اس کی تشریح کرتے۔ اور اس تشریح میں وہ معارف اور نکات بیان کرتے کہ "مدرکہ در فہم مراتب آں سراسیمہ می گردید"۔ شاہ صاحب نے جو تقریر فرمائی وہ ایک کتاب معنی تھی۔ لیکن چونکہ زبان ہندی تھی اس لئے بیدل نے اسے "چہار عنصر" میں نقل نہیں کیا۔

ای بسا معنی کہ از نامحرمی ہائی زبان باہمہ شوخی مقیم نسخہ ہائی راز ماند
نغمہ ہا بسیار بود اما ز جہل مستمع ہر قدر بے پردہ شد در پردہ ہائی ساز ماند
حسن در اظہار شوخی رنگ تقصیری نداشت چشم ہا غفلت نگر شد جلوہ محو ناز ماند

جذبہ شوق بیدل کو ایک اور یگانہ روزگار "شاہ یکہ آزاد" کی خدمت میں لے گیا۔ عم بزرگوار میرزا قلندر نے شاہ صاحب کی بہت تعریف کی۔ اتفاق سے شاہ صاحب خود ہی میرزا قلندر کے ہاں تشریف لائے۔ گرمی کا موسم زور پر تھا۔ بیدل پنکھا سے ہواداری کی خدمت بجالایا۔ شاہ صاحب مسکرائے اور بیدل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ عنقریب تیرے ریشۂ فطرت سے نہال قامت آرائی کرے گا۔ اور تیرے ہیولائے استعداد سے ایسی صورت ظہور میں آئے گی کہ اس کی کیفیت کے فہم سے بلند آگاہ بھی فائدہ اٹھائیں گے۔

ای نوائی درد دل نومید افسون مباش | آخر از ضبطِ نفس شور قیامت می شوی
دی سرشک ناتواں چندے دگر با صبر باش | مایہ اتِ چوں جمع شد طوفاں علامت می شوی

اس حوصلہ افزائی کے بعد مثنوی معنوی کے چند ابیات پڑھے ۔ یہ رموز خودی تھے ؎

این توئی ظاہر کہ پنداری توئی | ہست اندر توئی تو از بے توئی
او تو است اما نہ این تو کہ منیست | آں توئی کاں برتر از ما و منیست
توئی تو در دیگرے آید وفیں | من غلام مرد خود بین چنیں

اس موضوع پر بیدل نے جو کچھ لکھا ہے مناسب مقام پر زیر بحث لایا جائے گا۔

بیدل شاہ صاحب کی کرامت کا ذکر کرتا ہے کہ ایک دفعہ دریا گنگا سے عبور کرنے کے لئے کشتی میں بیٹھ گئے ۔ کشتی میں اور لوگ بھی سوار تھے ۔ جب منجدھار میں کشتی پہنچی ، ملاحوں نے کشتی سوال ہر ایک شخص کے سامنے پیش کی حسب توفیق سب نے جو کچھ دینا تھا دیا ۔ شاہ صاحب کی باری آئی ، یہاں کیا رکھا تھا ۔ ہرچند عذر کیا کہ بابا میں فقیر بے نوا ہوں مستحق خدمت خیرات ہوں ۔ مگر کون سُنتا ہے ۔ ملاح درپئے آزار ہوئے ۔ شاہ صاحب نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ کھڑے ہو گئے اور دریا میں کود پڑے ، اور "چوں شکن در طرۂ موج نشست" ، کشتی میں لوگوں نے شور مچایا ، شاہ صاحب نے دیکھ کر فرمایا کہ اے بے خبرو ناتوانی کی وجہ سے اتنا لوٹا ہوا نہیں ہوں کہ دوشِ موج میرا بوجھ نہ اُٹھا سکے ۔ اور سبکساری کے فیض سے اتنا آپے سے باہر نہیں ہوا کہ حباب کی پُشت خم پل کا کام نہ دے ۔ اس کے بعد ہوا کے جھونکے کی طرح دریا عبور کر گئے ۔ اور آنکھ کی جھپک میں نظروں سے غائب ہو گئے ۔ سچ ہے "ترا کشتی آوردو ما را خدا"

بیدل نے اس موقع پر جو اشعار لکھے ہیں وہ انگلستان کے مشہور شاعر گرے کی " ایلیجی " (   ) کے ہم معنی ہیں۔

ای بسا روشن دلے کز بے نیازیہای شوق ۔۔۔ چوں فروغ مہر برخاک سیاہ افتادہ است
ای بسا آئینہ کز کسوت زنگار ریش ۔۔۔ یوسفستانے بخلوتگاہ چاہ افتادہ است
معنی اقبال فقر از غافلاں پوشیدہ اند ۔۔۔ ورنہ در ہر خاک چندیں دستگاہ افتادہ است
ہر کجا گرد شکستے سرمہ آرا ید بچشم ۔۔۔ بے تامل نگذری آنجا کلاہ افتادہ است
ذرہ تا خورشید عرفاں جلوہ است اما چہ سود ۔۔۔ دیدہ ہائے خلق بر غفلت نگاہ افتادہ است
عالمے محمل بدوش وہم جولاں می کند ۔۔۔ کیست تا فہمد کہ منزل ہم براہ افتادہ است

ایک اور مقام پر اسی کے ہم معنی ارشاد ہے کہ:

ای بسا آئینہ کز درد تغافل ہائی حسن ۔۔۔ ریشہ داری از زمین یاس سر بالا نکرد
وی بسا تخمے کہ از بے التفاتیہائے ابر ۔۔۔ خاک شد در زیر رنگ و جوہری پیدا نکرد
شیشہ ہا در محفل افسوس امکاں چوں حباب ۔۔۔ خود بخود درہم شکست و بادۂ سودا نکرد
گر ہمہ رنگیست موقوف بہار جلوہ ایست ۔۔۔ ورہمہ بوئیست بے گل بال شوخی وا نکرد

ہمچناں کز حسرت دیدار می بالد نگاہ ۔۔۔ نالہ را ہم جز ہوائی قامت رعنا نکرد
قید کلفت بر ندارد شبنم مہر آشنا ۔۔۔ کیست منظور تو شد کز علم استغنا نکرد

ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ استعداد خواہ موجود ہو جب تک مناسب اسباب مدد نہ دیں اس کا ظہور نہیں ہوتا۔

آئینہ میں استعداد موجود ہے لیکن اگر حسن ہی تغافل برتے تو کوئی صورت نہیں کہ اس کی استعداد ظاہر ہو۔ ریشہ کو حسرت ہی ہے کہ زمیں سے ذرا سر اونچا کرے۔ زمین میں بیج بویا جاتا ہے لیکن اگر ابر ہی آبیاری نہ کرے تو اس کا نشوونما نہیں ہوتا اور وہیں گل سڑ کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح شیشے حباب کی طرح ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اور شراب سے لین دین کی نوبت ہی نہیں آتی، خواہ کوئی شے سرتاپا رنگ ہو اس کا جلوہ بہار پر موقوف ہے اور اگر بو ہے تو گل کے بغیر اس کی شوخی کا ظہور نہیں ہوتا۔ غرض جب تک مناسب اسباب استعداد کے

ساتھ نہ ملیں ظہور کمال نہیں ہوتا۔ بیدل میں بھی فطری قابلیت موجود تھی۔ اگر ایسے صاحبان علم وفضل کی صحبت نصیب نہ ہوتی تو آج یہ بھی ایک گمنام شخصیت ہوتی۔ تاریخ کے صفحات پر کتنے نامور اشخاص کا تذکرہ ہے جن کی تعریف میں لوگوں نے زمین و آسمان کے قلابے ملادئے۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مناسب اسباب اور حالات کی سازگاری نے انھیں نامور بنا دیا ورنہ ممکن ہے کہ بلحاظ استعداد اور بھی ہوں بلکہ بڑھ چڑھ کر ہوں۔ لیکن حالات سازگار نہ ہوئے۔

بیدل نے "چہار عنصر" انہی حضرات کی تعریف و توصیف میں نذر کردئے ہیں۔ خوش قسمتی سے عم بزرگوار مرزا قلندر کی تربیت نصیب ہوئی۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ "تربیت فقیر بیدل بعد از رحلت والد مرحوم تا ادراک نشاء بلوغ بعہدہ التفات خود داشت، و با اشفاق ربوبیت در تعلیم مراتب آداب و تدریس معانی اخلاق توجہ کمال می گماشت۔" ان فوائد کے علاوہ کہ "لمعہ نظمی کہ امروز رونق افزائی کانون تخیل است۔" اسی آفتاب کا پرتو ہے جس کے زیر سایہ میری تربیت ہوئی۔ لطف یہ ہے کہ خود اُمّی تھا مگر

کمالات بے سعی کسبش حصول — حقائق ہماں بے بیانش وصول
نگردیدہ بر حرفے انگشت سا — بمعنی چو معنی بحرف آشنا
بفیض ازل محرم ہر کلام — ولے اُمّی از کسب فضل عوام
فضائل ز ادراک او خوشہ چیں — زہے اُمت خاتم المرسلیں

آخری شعر میں اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ آں حضرتؐ بھی "اُمّی" تھے ؎

"نگار من کہ بہ مکتب نرفت و خط ننوشت
بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد" (حافظ)

ہزاروں رازی اور غزالی اسی "اُمّی" کے فیض یافتہ ہیں، ارشاد قرآن ہے۔ کہ:

"وما کنت تتلوا من قبلہ من کتب ولا تخطہ بیمینک اذاً لارتاب المبطلون بل ھو ایت بینت فی صدور الذین اوتوا العلم" (۲۱)

تو اس سے پیشتر نہ تو لکھا ہؤا پڑھ سکتا تھا اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھنا ہی جانتا تھا اگر ایسا ہوتا تو یہ جھوٹے شک و ریب میں پڑتے حقیقت یہ ہے کہ یہ روشن آیات ان لوگوں کے ذہن میں ہیں جن کو علم عطا کیا گیا ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ :

"الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم" (۳۰/۲۱)

اللہ ہی نے قلم سے سکھایا اور وہ کچھ سکھایا جس کا علم انسان کو نہ تھا۔

لیکن نوکِ قلم پر آنے اور صفحہ قرطاس پر رقم سے پیشتر انسانی ذہن میں آیات بینات تھیں۔ یعنی اہلِ علم کے قلبِ سلیم میں جو کچھ تھا، وہی کچھ قلم نے لکھا۔

چشمے داری و عالمے در نظر است | دیگر چہ معلم و کتابت باید

مدرسہ کی بک بک کی کیفیت بھی ملاحظہ ہو کہ بیدل لکھتا ہے کہ ایک روز مدرسۂ علماء میں ایک مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی "دانش مندِ بے انصاف" نے لاف و گزاف سے مجلس گرم رکھی اور آوازہ ضرب یضرب سے "علم خفت عقل" بلند کر رکھا تھا۔ قیل و قال کی خاک سے وہ دھول ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈالی کہ علم کو رسوا کر کے چھوڑا۔ مرزا قلندر بھی اس مجلس میں موجود تھا، اسی دن سے بیدل کو منع کیا کہ علم مدرسہ بے فائدہ ہے، فرمایا کہ اگر یہی آثار علم ہیں تو بہتر ہے کہ تو جاہل ہی رہے اور اگر تحصیل کا فائدہ بھی کچھ ہے تو مناسب ہے کہ تو بے حاصل ہی رہے۔ کیونکہ اس کا نتیجہ سوائے پشیمانی اور ندامت کے اور کچھ نہیں۔ جب کبھی کسی مسئلہ کی حاجت ہو "قاضی در محکمہ نمردہ است"، اور جب کبھی نصیحت منظور ہو "واعظ را از منبر گرگ نبردہ"۔

"غرہ دانش نگردی از فسون لفظ چند | ای زمعنی بے خبر علم حقائق دیگر است"

"این سخن ہائی کہ یاران دام عرفاں چیدہ اند | جز خموشی آنچہ فطرت راست لائق دیگر است"

آفتاب کو آفتاب کی روشنی میں دیکھنا بدیہی علم ہے، اور کسی کور مادر زاد کو استدلال عقلیہ سے سمجھانا اور شے ہے۔

چوں یقیں منحرف افتاد دلائل بالید راستی رفت کہ ممنون عصایم کردند

اگر ان علماء کی قیل و قال اور بحث و مجادلہ کو دیکھا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ بیدل نے سچ کہا ہے:

ازتعصب جاہلاں دین ہدیٰ را دشمن اند عاقبت در جنگ ایں کوراں عصا خواہد شکست

"دینِ ہدیٰ" تو ان اندھوں کی صراط مستقیم پر رہنمائی کر رہا ہے، اور بمنزلہ "عصا" ہے لیکن یہ اس عصا سے ایک دوسرے کے سروں کی تواضع کر رہے ہیں اگر یہ بے مغز نہ ہوں تو اسے توڑ کر نہ رکھیں۔

آں کیست کہ گرد ظرف مولوی امروز یک تیغ زباں دار دو صد نوک سناں بخش

اکبر مغلیہ شہنشاہ ابتدا میں بہت دیندار آدمی تھا۔ اور علماء کی قدر و منزلت بھی دل میں بہت تھی، علمِ حدیث صدر الصدور شیخ عبدالغنی سے سیکھا جو امام ابوحنیفہؒ کی اولاد سے تھے۔ بدایونی اپنی تاریخ "منتخب التواریخ" میں لکھتا ہے، کہ اکبر کے دل میں اس کا یہ احترام تھا کہ اس کی جوتیاں اپنے ہاتھ سے سیدھی کرتا۔ اسے یہ اختلاف جو مختلف فرقوں میں تھا پسند نہ تھا۔ اس لئے ایک مجلس علمیہ منعقد کی۔ غرض یہ تھی کہ اختلافی مسائل پر علماء باہمی بحث کے بعد ایسے امور پر متفق ہوں کہ اختلاف رفع ہو جائے۔ اس مجلس میں چوٹی کے علماء موجود تھے۔ لیکن حالت یہ تھی کہ اپنا تفوق جمانے کے لئے اگر ایک کسی شے کو حلال یا مباح کہتا تو دوسرا حرام اور مکروہ قرار دیتا۔ اور دونوں فریق روایات اور ائمہ دین کے اقوال تائید میں پیش کرتے۔ بحث کی گرمی میں بادشاہ کی موجودگی کا بھی پاس نہ کرتے۔ لام کاف تک نوبت پہنچ جاتی۔ بدایونی لکھتا ہے کہ ایک روز اکبر نے اس طوفان بے تمیزی سے تنگ آ کر کہا کہ آئندہ جو حضرات آداب مجلس کا پاس نہ کریں گے نکلوا دئے جائیں گے۔ میں بھی قریب ہی بیٹھا تھا دبی زبان سے کہا کہ پھر تو یہ سب نالائق

اسی لائق ہیں۔ اکبر نے یہ فقرہ سُن تو لیا، لیکن تجاہل عارفانہ سے پوچھا کہ کیا کہتا ہے، عرض کی حضور کچھ نہیں آپ نے سچ فرمایا علماء کو اخلاق سے کام لینا چاہیئے۔ ان مذاکرات علمیہ کا ایک نتیجہ یہ ہؤا کہ علما وکرام عوام کی نظروں سے گر گئے۔ اکبر مذہب سے بدظن ہو گیا۔ اور ان علماء کی وہ گت بنائی کہ پھر نہ اُبھرے۔ اس وقت تک دینی حکومت کے ساتھ دنیوی حکومت بھی ان کے ہاتھ میں تھی، اکبر نے چھین لی۔ عبدالنبی اور عبداللہ مخدوم الملک وغیرہ کو مکّہ کا راستہ بتایا اور خود اطمینان سے حکومت کرتا رہا۔ خانقاہوں کے پیروں کو بھی نہ چھوڑا۔ خواجہ اجمیری کا یہ احترام تھا کہ جب کبھی زیارت کے لئے جاتا دس کوس ادھر ہی پا پیادہ چلتا۔ اس کے بوڑھے متولی کو قلعہ گوالیار میں قید کیا۔ حرم نے بہت سفارش کی، کہا کہ یہ گمراہ جب بھی قید سے باہر آئے گا لوگوں کو گمراہ کرے گا۔ وہ قید و بند میں مر گیا۔ اکبر کا پوتا شہنشاہ دین پناہ اکبر کو "جدا کفر" کہتا ہے۔ صحیح، لیکن اس کی تمام تر ذمہ داری علماء کرام ہی پر عاید ہوتی ہے۔ دین کی غرض تو ہدایت ہے اس کو اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کا آلہ کار بنانا کوری نہیں تو اور کیا ہے۔ اکبری عہد کے علماء کی دُنیا طلبی کا یہ حال تھا کہ عبداللہ مخدوم الملک مر گیا تو اس کے ترکہ کا جائزہ لیا گیا۔ کسی مخبر نے خبر دی کہ صحن خانہ میں چند قبریں ہیں ذرا اُن کے "رازِ دروں پردہ" کی خبر لینی چاہیئے۔ اُکھڑوائی گئیں تو سونے اور چاندی کی اینٹیں برآمد ہوئیں یہ ہے علماء دین کی اوقات ؎

"حافظا می خور و رندی کن و خوش باش ولے
دام تزویر مکن چوں دگراں قرآن را"

یہ بے روزگار بیکار جماعت ہے اگر پیٹ پالنے کے لئے دین فروشی نہ کریں تو کیا کریں۔ عقل کے اندھے اور گانٹھ کے پورے بھی ان کو اکثر مل جاتے ہیں۔ بیدؔل ان کے جُبّہ و دستار اور ریش کی خوب خبر لیتا ہے۔ اسی ٹٹی کی آڑ میں وہ شکار کھیلتے ہیں، بیدؔل ہی نہیں شیخ سعدیؒ بھی کہتا ہے کہ

"زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند
حق رابسجودے ونبی رابدرودے"

اللہ اور رسول کو کیا دھوکا دیں گے سادہ لوح لوگوں کو دام تزویر میں پھانس ہی لیتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں جمعیتہ علماء ہند نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ پاکستان نہ بنے اور ابھی تک ہندو کانگرس کے گن گاتے ہیں۔ جس کا کھاتے ہیں اسی کا گاتے ہیں

گرمسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد
وائے گر از پس امروز بود فردائی

ہم نے یہ چند کلمات اس لئے لکھے ہیں کہ بیدل کے کلام کا ایک موضوع یہ بھی ہے۔ جس پر مناسب مقام پر بحث کی جائے گی۔

بیدل شاہ فاضل قدس سرہٗ کا بھی ذکر کرتا ہے کہ میرزا قلندر ان کی صحبت میں بھی لے گیا۔ جو کچھ میں نے ان کے بیان کی شگفتگی سے رنگینی مشاہدہ کی ہزار جوش بہار میں اس کی گل چینی میسر نہ ہوتی۔ اور جو نشہ آپ کی کیفیت تکلم سے اخذ کیا ہزار دور ساغر فکر سے بھی حاصل نہ ہوتا۔ جب کبھی آپ کچھ ارشاد فرماتے میں ہمہ تن گوش ہو کر سنتا اور کامل توجہ کی وجہ سے حافظہ میں محفوظ بھی ہو جاتا۔ شاہ صاحب میرے حال سے بے خبر نہ تھے۔ کبھی کبھی میری رسائی ذہن کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے کہ کاش تجھ جیسا سامع میری باتیں سننے اور سمجھنے کے لائق ہوتا کہ میں بھی قید خاموشی سے آزاد ہوتا۔ اور تیرے جیسا طالب ہوتا کہ میں اپنے عقدہ دل کو کھول کر رکھ دیتا، اب تو یہ کیفیت ہے کہ جو کچھ دل سے لب پہ آنا چاہتا ہے۔ پھر دل کو ہی کہتا ہے۔ سچ ہے کہ

مہل قابل و دانگہ نصیحت قابل
چو گوش ہوش نباشد چہ سود حسن مقال (سعدیؒ)

اندھے کے آگے رونا بھینس کے سامنے بین بجانا ہے۔ اگر لوگوں سے

فہم میں کج روی نہ ہوتی خاموشی کو سخن پر ترجیح بھی نہ ہوتی۔

عندلیبے بہسم نوائی دگر شکوہ سر کرد کائی نوا پرور
شور زاغم دریں چمن بار است گفت خاموش زاغ بسیار است
عالم از جنس ایں خروش پر است از نوا ہائے ہرزہ گوش پر است

ایک عندلیب نے اپنی ہم نوا عندلیب سے شکایت کی، ہم تو اس باغ میں چہچہاتی اور نغمہ سرائی کر رہی ہیں۔ مگر یہ کووں کی کائیں کائیں ایسی سمع خراش ہے کہ دل پر گراں گزر رہی ہے۔ اس نے کہا کہ چپکے رہو اکثریت کوؤں ہی کی ہے۔ ایک دنیا اس جنس کے شور و غوغا سے پر ہے۔ ان کی یاوہ گوئی سنتے سنتے کان بہرے ہو گئے۔

ان اہل علم و فضل اور ارباب صدق و صفا کی صحبت میں جو کچھ ان کے ارشادات تھے بیدل انھیں بھی اپنے لفظوں میں بیان کرتا ہے۔ مثلاً شاہ فاضل کی مجلس میں فقراء کی ایک جماعت "چوں مژگاں بہم پیوستہ خلوت آرائی انجمن یکتائی بودند" ان سے ایک نے سوال کیا کہ منصور نے بھی انا الحق کہا اور فرعون نے بھی "انا ربکم الاعلیٰ" کہا۔ دونوں ایک "مقام" کی راگنی الاپ رہے تھے، منصور میں کونسا کمال تھا کہ قابلِ تحسین ہے، اور فرعون کا نغمہ کہاں سے بے سُرا اور بے تال ہوا کہ قانون آفریں سے خارج ہو گیا۔ فرمایا کہ منصور بے تعینی فقر کی وجہ محرم اسرار یقین تھا۔ یعنی جو کچھ وہ کہہ رہا تھا اس پر اسے کامل یقین تھا اور کسی حالت میں اس کے پائے استقلال نہ لڑکھڑائے۔ یہاں تک کہ اس کے ایمان پر خون شہادت نے مہر تصدیق ثبت کر دی۔ منصور نغمہ وحدت الاپ رہا تھا، فرعون غرور اسباب شوکت میں گمراہ تھا، جب امتحان کا وقت آیا رنگِ استقلال اُڑ گیا۔ جب اس کا دفتر گیر و دار آب نیل میں ڈالا گیا۔ تمام نقوش دعوئے باطل حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے۔ ایک ہی موج کے تھپیڑے نے حواسِ خمسہ درست کر دئے، بے اختیار چلا اُٹھا" آمنت برب موسیٰ و ھارون" میں موسیٰ اور ہارون کے پروردگار

پر ایمان لایا، ثابت ہؤا کہ "کذب لازم کثرت نمائی ست وصدق دلیل وحدت آشنائی"

سلطنت سرمایۂ توحید نتواں ساختن	یعنی ایں جا رشتۂ اظہار وحدت درہم است
اعتبار غیر بسیار است در اسباب جاہ	با فقیری ساز کا ینجا ماسوائے حق کم است
رنگ ہائی ایں چمن یکسر شکست آمادہ اند	ای اسیر رنگ بیرنگی بنائی محکم است
عبرتے حاصل کُن ای غافل ز نخل میوہ دار	چوں تعلق بار دل شد استغنا خم است

ایک دفعہ شاہ صاحب کی خدمت میں ایک دوست نے یہ شعر لکھ کر بھیجا۔

میتواں در کلبۂ باہم شبی را روز کرد
بوریا گر نیست نقش بوریا اُفتادہ است

اسی ایک شعر میں حرفِ مدعا کل واضح کیا۔ شاہ صاحب نے بیدلؔ کو کہا، مجھے اس عبارت آرائی کی زحمت سے نجات دو اور بے تکلفانہ جواب لکھ دو کہ نقش بوریا کا وہم راحت پسندوں کو ہوتا ہے اور کلبہ و کاشانہ عمارت اندیشوں کی عشرت کا تخیل ہے یہاں جو کچھ ہے نقش سادہ کے سوا کیا رکھا ہے۔ بیدلؔ نے بے تامل جواب میں چند اشعار لکھ دئے۔

خود بیا و حال ما بنگر کہ در ملک فنا
روزگار ما ز روز و شب جدا افتادہ است
کلبہ وسواس است ونقش بوریا زنگار طبع
کارہا با شیوۂ صدق وصفا افتادہ است
بوریا و کلبہ را در عالم ما بار نیست
ہر کجا مائیم نقش مُدعا افتادہ است
کلبہ آتش زن، نقوش بوریا را محو کن
در بساط فقر ما بینی چہا افتادہ است
تا نخواہد سوخت از ما بر نخواہد داشت دست

نیستی ما را چو آتش در قفا افتادہ است

حاضرین نے یہ برجستہ جواب بہت پسند کیا، شاہ صاحب بھی محظوظ ہوئے اور تحسین کے بعد دُعاءِ خیر بیدؔل کے حق میں کی۔

بیدؔل کا خال مرزا ظریف فقہ و احادیث میں خوب ماہر تھا، ۱۰۷۱ھ میں جبکہ بیدؔل کی عمر سترہ سال تھی اپنے ہمراہ اوڑیسہ میں لے گیا۔ بیدؔل کو عم بزرگوار مرزا قلندر سے جُدا ہونا پڑا۔ انہی ایام میں شاہ ابو القاسم ترمذی بھی اوڑیسہ میں وارد ہوئے۔ مرزا ظریف آپ کا بہت معتقد تھا۔ تین سال مسلسل بیدؔل کو شاہ صاحب کی صحبت نصیب ہوئی۔ بیدؔل لکھتا ہے کہ میں اکثر اہل اللہ کی خدمت میں گیا۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ان میں سے ہر ایک یگانہ روزگار تھا، اور ان کے فیض صحبت سے مجھے بہت کچھ حاصل ہؤا مگر دل میں ایک تڑپ تھی۔

تمام شوقیم لیک غافل کہ دل براہ کہ می خرامد
جگر بداغ کہ می نشیند نفس باہ کہ می خرامد

شاہ صاحب کی صحبت میں آخر مقصد حاصل ہؤا" بودیم آنچہ بودیم او وانمود ما را"

شاہ صاحب سے پہلی ملاقات کے حالات بھی عجیب و غریب ہیں۔ یہ سمجھنا چاہئے کہ زمین مُردہ پانی کو ترستی ہے ابر کرم آتا ہے اور برستا ہے، نئی زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ بیدؔل لکھتا ہے کہ شہر گنگ دریا کے کنارہ پر صدر مقام صوبہ اڑیسہ کا ہے۔ یہاں میں مرزا ظریف کے ساتھ چند روز ہوئے کہ ٹھیرا ہؤا تھا۔ مرزا حسب معمول درس دے رہے تھے اور ہر ایک آیت کی تفسیر بھی بیان کر رہے تھے، اتنے میں ایک درویش جو شاہ صاحب سے منسوب تھا آیا اور کہا کہ شاہ صاحب آپ کی ملاقات کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ چونکہ اس طائفہ سے اعتقاد وراثت میں ملا ہؤا تھا۔ مرزا ظریف اور میں استقبال کے لئے بڑھے، اور تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا۔ شاہ صاحب نے بیٹھتے ہی فرمایا کہ الحمد للہ کہ آپ

اور میں ایک ہی دن اس شہر میں وارد ہوئے ہیں، "فرصت ہا مُفت شوق است وصحبت ہا غنیمت ذوق" اس کے بعد وہی آیات قرآن حکیم جو ہم تلاوت کر رہے تھے آپ نے پڑھیں اور وہ معانی اور نکات بیان فرمائے کہ کسی مفسّر نے نہیں لکھے تھے، مجھ پر تو ایک بیخودی طاری ہوگئی اور مرزا ظریف باہمہ دعوئ تبحر علمی حیرت میں آگیا۔ اس محیط قدرت کے سامنے اعتراف عذر قطرہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ چالیس سال کا عرصہ گزرتا ہے کہ میں نے مدرسہ ثقات کا اتباع کیا اور تفسیروں سے اتنی سند تحقیق بھی حاصل کی، اگر علم یہ ہے جس پر مجھے ناز تھا افسوس میں نے ایک عمر بے تمیزی ہی کسب کی اور ان اوقات کے ضائع ہونے کا افسوس ہے جو مشقت غفلت پر صرف ہوئے۔

"دریں غفلت سرا عرفان ما، ہم نازکی دارد
سراپا مغز دانش گشتن و چیزے نفہمیدن"

شاہ صاحب نے فرمایا کہ اگر اس مدرسہ عالم کا علم ایک ہی جنس اصطلاح پر منحصر ہوتا تو لوگ اس کے مطالب مختلف عبارت میں ادا نہ کرتے۔ سب بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں۔ ہر ایک ساز اپنے اپنے رنگ میں شوخی آہنگ کا اظہار کر رہا ہے بالخصوص قرآن عظیم ساز حقیقت قدرت ہے اور قانون اسرار عزت، تصنع عبارت سے منزہ ہے کہ باہنگ نقصانش سرایند اور اشارات کے تکلف سے پاک ہے کہ "بمضراب کمالش و استانید" اس کے نغمات کی بے پردگی سازندہ کی استعداد کا پتہ دیتی ہے اور اس کے مقامات کی بے نقابی نوازندہ کی فطرت کی شوخی بتاتی ہے "ہرکس ایں جا از مقام وحال خود گوید خبر" اہل علم و فضل نے جو کچھ اس کے مطالب بیان کئے یہ سمجھنا چاہئے کہ اپنی تحقیق کی حد کا نشان دیا۔ ان کا نغمہ بے سر اور بے تال نہیں۔ اس بحر تحقیق میں من و تو زبانیں ہیں جو موج کی طرح سرگرم گفتگو ہیں، ہر ایک موج سے ایک شور پیدا ہو رہا ہے لیکن سب اپنے شور سے بے خبر ہیں، اگر ذرا خاموشی طاری ہو جائے تو منکشف ہوتا کہ دریا کے

مُنہ میں کتنی زبانیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مراتب کلام تحریر و تقریر بقدر فہم و عقل سامع ہیں۔ آفتاب جب تک خاکِ زمین پر جبّہ سائی نہ کرے سایہ کی طبیعت سے زنگ دور نہیں ہوتا۔ اسی طرح صاحب علم وفضل کو باہمہ بلندی درجات عوام کی دستگیری کے لئے تنزّل کرنا پڑتا ہے تاکہ عوام کی طبیعت سے جہل مطلق رفع ہو۔ اگر حسن تحقیق اپنے ذاتی کمال سے جلوہ نما ہو تو ان آنکھوں پر ظلم ہوگا جو ضعیف نگاہ ہیں۔ اس لئے بقدر طاقت برداشت ہی بات کرنی پڑتی ہے اور اس طرح بات بھی بنتی ہے، اور اسی لحاظ سے نظریوں میں اختلاف اور تفاوت بھی ہے۔

سلسلہ تقریر ختم ہُوا تو شاہ صاحب اُٹھے، مرزا ظریف نے چند قدم مشایعت کی، مگر میں سایہ کی طرح ساتھ ہو لیا۔ چلتے چلتے شاہ صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ میں تو تمہارے ہی درد کی دوا بن کر آیا ہوں، مجھے اپنا شریک حال واشغال سمجھو، اس بزم کے ساقی مستوں کے حوصلہ کے مطابق ہی پلاتے ہیں اور اس محفل کے شاہد مشتاقوں کی تاب و طاقت کے مناسب، نقاب کے بند کھولتے ہیں۔ اس کے بعد دُعا فرمائی کہ اللہ تعالےٰ تیرے مشرب استعداد کو کمال تک پہنچائے۔ شاہ صاحب کی مجلس میں عموماً اہلِ علم وفضل کا مجمع رہتا۔ کسی موضوع پر گفتگو ہوتی تو شاہ صاحب میری طرف بھی توجہ فرماتے کہ ہاں تم بھی کچھ کہو میں جو کچھ خیال میں آتا نظم و نثر میں گذارش کرتا۔ شاہ صاحب تحسین کے ساتھ حوصلہ افزائی اور کبھی کبھی اصلاح بھی فرماتے، ایک دن شاہ صاحب کے بھائی میر عبدالسلام مجلس میں موجود تھے، شاہ صاحب سے کہا کہ ایسا قابل نوعمر اس لائق ہے کہ آپ کی توجہ سے کسی وقت اوج کمال پر پہنچے اور تھوڑے عرصہ میں مشہور ہو جائے۔ شاہ صاحب مُسکرائے اور فرمایا کہ یہ ان لوگوں سے ہے جن کو فضل حقیقی نے ازل سے جوش عطا فرمایا ہے اور ابداً ان کا احوال خزانہ غیب میں پوشیدہ ہے۔

ایک روز مرزا ظریف نے ازراہ تفقد جو بزرگوں کو بیٹوں کی تربیت کے لئے

لازم ہے جب مجھے دیکھا کہ میں پیشوایانِ عالم اور فقر خاکساران طریق فنا سے عموماً اختلاط رکھتاہوں شاہ صاحب کی خدمت میں شکایت کی "یہ زیاں کار نقد آگہی" بے معرفت لوگوں سے جو اہلِ تقلید میں رہتا ہے ناممکن ہے کہ تحقیق سے اسے کبھی کچھ بہرہ ہو۔ اور جس فائدہ کا لالچ ہے وہ آخر نقصان کی صورت میں ملے گا۔ یہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے، اگر یہی وقت جناب کی صحبت میں صرف کرے تو مفت دولتِ عظمیٰ ہاتھ آئے۔ بیدل آنکھیں نیچی کئے خاموشی سے سنتا رہا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ ہر صفت اور ہر استعداد کے ظہور کا ایک وقت ہوتا ہے، مجھے معلوم ہے کہ اس کی بنائے فطرت کمال متانت سے مضبوط ہے اور بساط طینت نہایت صاف اور ہموار ہے لیکن جوانی کا بھی کچھ تقاضا ہے، اور یہ بے پروائی اس لائق ہے کہ نظر انداز کی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ کسی طرح اس کے اوقات میں خلل واقع نہ ہوگا۔ خواہ یہ کسی طرف مشغول ہو تہمت غفلت اس پر عاید نہ ہوگی۔ آپ مطمئن رہیں، بیدل حیران تھا کہ

غافلاں سرگرم طعن و محرماں مست ثنا — من ہماں آئینہ حیرت پرستیہائے خویش
خلقے از مشت غبارم آسمانہا در نظر — من بجشم نقش پا حیراں ز پستیہائے خویش

یہ خوب رہی، شاہ صاحب تو میری تعریف فرماتے رہے اور رخالو صاحب زجر و توبیخ، جب آپ اٹھ کر چلے گئے تو میں ویسے ہی سرنگوں بیٹھا رہا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ بزرگوں کے کہا کا بُرا نہ ماننا چاہیئے۔ ناصح اپنے اعتقاد میں جو کچھ پند و نصیحت کرتاہے تو غرض ترغیب ہے اور معلّم کو بھی تہذیب اخلاق ہوتی ہے۔

بیدل شاہ صاحب کے کشف و کرامات کا بھی ذکر کرتا ہے، کہتا ہے کہ ان ایام سعادت انجام میں سید محمود جو مولانا یعقوب چرخی کی اولاد سے تھا اڑیسہ میں صوبیدار تھا۔ شکنجۂ مرض میں متصدیان امور تقدیر نے ایسا جکڑ رکھا تھا کہ مسندِ صحت پر ایک ساعت بھی بیٹھنا نصیب نہ ہوتا۔ ہاتھ اور پاؤں کے ناخنوں میں زہر سرایت کر چکا تھا۔ اس مرض کو داء الثعلب کہتے۔ ہر چند اطباء نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا

مگر "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"۔ جب دوا بے اثر ثابت ہوئی، فقرا سے استدعا دُعا کی۔ چنانچہ کئی دفعہ شاہ صاحب کی خدمت میں بھی التجا کی مگر "کل امو مرھون باوقتھا"۔ ایک دن مرزا ظریف کی التماس کو شرفِ قبولیت بخشا۔ اور سید کی بیمار پرسی کو خود تشریف لے گئے۔ بیچارہ بسترِ علالت پر پڑا کراہ رہا تھا، اتنی طاقت نہ تھی کہ اُٹھ کر مراسمِ تعظیم بجا لاتا، ہاتھ ماتھے تک لا کر عذر خواہی کی کہ جو کچھ میرا حال ہے ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

براہت مُردہ ام، اما زیارت خانۂ خاکم
تو می آئی و من آسودہ در آتش مزارِ من

شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں نے تجھے اس بیماری سے نجات بخشی۔ حاضرین میں سے ایک رافضی اسد نامی بھی موجود تھا دایم الخمر یہ فقرہ سنتے ہی آپے سے باہر ہو گیا۔ جس طرح شیطان لاحول سے بھاگتا ہے اسی طرح بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔ کہ یہ ہیں آج کل کے فقراء کہ اُمراء کے دروازہ پر آتے ہیں اور دفترِ خوارق و کرامات کھولتے ہیں، بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ خانِ دوراں کو کہتا ہے کہ میں نے تجھے نجات بخشی، اگر یہ ایسا ہی صاحبِ کرامت ہے تو گوشۂ خلوت میں کیوں نہیں بیٹھتا، اغنیاء کے دروازہ پر ایسے ریاکار آتے ہیں اور غرض دُنیا طلبی ہوتی ہے۔ غرض اسی قسم کے کلمات کہتا اور مغلظات بکتا ہوا جو اس قماش کے لوگوں کا شیوہ ہے پالکی میں سوار ہو گیا۔ جب دروازۂ شہر کے قریب پہنچا "صاعقہ از پردۂ غیب خروشید و زلزلہ از بنیادِ زمین جوشید"، پالکی جس میں یہ سوار تھا اُلٹ گئی۔ حمال اور ہمراہی تو اتنے بدحواس ہوئے کہ سمجھے دروازہ ان کے سروں پر آ پڑا۔ ہوش ٹھکانے نہ رہے .... کچھ دیر بعد جب حواس ٹھکانے ہوئے تو اس یاوہ گو کی تلاش ہوئی۔ پالکی میں موجود نہ تھا۔ حیران تھے کہ کہاں گُم ہو گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس گم شدہ خر کا کہیں نشان نہ ملا۔ آخر دیکھا کہ پُل کے ایک طاق کے نیچے جہاں شہر کی گندگی جمع ہوتی تھی غلاظت میں لت پت ہاتھ پاؤں مار رہا

ہے۔ آخر بمشکل اسے باہر نکالا۔ نشہ تو سب ہرن ہو چکا تھا۔ پانی سے مُنہ دھویا مگر چہرہ پر سیاہی ایسی جمی کہ دھوئی نہ گئی۔ گویا ابدی روسیاہی کا داغ تھا جو مٹائے سے نہ مٹا، کہار اُٹھا کر اسی حالت میں گھر تک لے گئے۔

"منکر انسان کامل ہر کجا آید بچشم ✤
بے تامل شد یقیں سگ بود یا خر بودہ است"

انسان کامل کا منکر جہاں دیکھو یہ سمجھ لو کہ یا کُتا ہے یا گدھا۔

"زانکہ در ہم جنس نتواں یافتن بوئے حسد
طبعہائے مختلف از ہم مکدر بودہ است"

ہم جنس تو ایک دوسرے پر حسد نہیں کرتا کُتے ہی ایسا کرتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ایک جنس دوسری جنس سے نفرت ہی کرتی ہے "روح را صحبت ناجنس عذابیست الیم"

"جنس یکسر ہیئت معنی است بے ترکیب لفظ — ژالہ را مشکل اگر گویند گوہر بودہ است"
"گر ز باطن برنخیزد اختلاف ماہیت — آتش و یاقوت در ظاہر برابر بودہ است"

ہر ایک جنس کی حقیقت ایک ہے۔ اور اس کے خواص بھی اسی حقیقت کے مناسب ظاہر ہوتے ہیں، بظاہر اولہ اور موتی کی ایک صورت ہے اور اسی طرح آگ سے دھکتا ہوا کوئلہ اور ہیرا بھی چمک دمک میں ایک جیسا ہے، اگرچہ ژالہ اور گوہر کی اصل پانی اور کوئلے اور ہیرے کی اصل بھی ایک ہی ہے مگر ان کی معنوی صورت جس شکل میں ظاہر ہوئی ہے وہ مختلف ہے خواہ محسوس صورتیں ملتی جلتی ہیں۔

"گردش رنگ از جہان نشہ پیمائے جدا است — چوں بصورت وارسی گل نیز ساغر بودہ است"
غیر معنی گر بہ نقش محض باشد اشتراک — از ہما تا جغد یکسر مُشتے از پر بودہ است
پس یقین شد آدمی معنی بود بیدست و پا — ورنہ خرس اندر بزرگی از کہ کمتر بودہ است
علت اضداد خلق اوج و حضیض فطرت است — زیں سبب بولہب خصم پیمبر بودہ است

در ثبوت ایں حقیقت شاہدے درکار نیست   ہر کہ خصم انبیاء بود است کافر بودہ است"
بیدل ایسی ایسی نئی ترکیبیں "جہان نشہ پیما" آپ ہی اختراع کرتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا شاعرانہ تخیل زبان میں زیادہ وسعت کا مطالبہ کرتا ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کا حکیمانہ تفکر اسی امر کا تقاضا کرتا ہے۔ زبان پر پوری قدرت حاصل تھی، یہ اسی کا حصّہ ہے، اردو میں کوئی ترجمانی کیا کرے۔

ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ اگر صرف صورتوں میں مشابہت پر نظر کی جائے اور معنی یا حقائق کو جو فطری ہیں نظر انداز کیا جائے تو ہما اور اُلّو دونوں مشت پر ہی تو ہیں۔ اس لحاظ سے تو ان میں کچھ فرق نہیں۔ پھول بھی تو پیالہ کی صورت ہیں۔ لیکن پھول میں وہ نشۂ بادہ کہاں جو ساغر میں ہوتا ہے۔ اس عالم صورت میں اہلِ نظر ان حقائق کو دیکھتے ہیں جو ان صورتوں میں رونما ہوتے ہیں، صورتوں میں تو اتنا اختلاف نہیں اور ایک ہی جنس کی صورتوں میں بہت کم ہوتا ہے لیکن جب ان کا مقابلہ دوسری جنس سے کیا جائے خواہ ان کی نوع ایک ہی ہو تو ان کے جوہر واضح ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ آدمی ان ہاتھ اور پاؤں کا نام نہیں، آدمیت ایک حقیقت ہے، ریچھ ہاتھ پاؤں کے لحاظ سے بزرگی میں آدمی سے کمتر نہیں۔

"خلق" اور "خلق" دونوں کی اصل ہی ہے "خلق" کا اطلاق ظاہر پیدائشی صورت پر ہوتا ہے اور "خلق" معنوی یا ذہنی ساخت ہے۔ اور "عادت" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، نوع انسان میں ہر ایک شخص کی فطرت کی بلندی و پستی سے ہی ان کے اخلاق میں اختلاف کی حقیقت مضمر ہے، یہی وجہ ہے کہ ابی لہب آں حضرتؐ کا دشمن تھا، کہ دونوں کے اخلاق ایک دوسرے کی ضد تھے۔

اس حقیقت کو ثبوت کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ مسلّم ہے کہ نبیوں کا جو بھی منکر ہے کافر ہے۔

یہ واقعہ تو ادھر رونما ہؤا۔ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ یہ اسی بے ادبی کا خمیازہ

تھا جو اس مردود ازلی کو بھگتنا پڑا۔ حضرت شاہ اپنے دولت خانہ کی طرف مراجعت فرما چکے تھے، بیدلؔ اور مرزا ظریف بھی ہمراہ تھے۔ ابھی رخصت نہ ہوئے تھے کہ اس واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ اور خان دوران سید محمود کا آدمی بھی آیا اور عرض کی خان کی گذارش ہے کہ جناب اپنے الطاف کریمانہ سے اس بے ادب کا جرم گستاخی معاف فرمائیں۔ ایک عمر میری مصاحبت میں رہا ہے۔

"دریا دلان کہ سینہ بگو ہر جلا دہند
خاشاک را چو گل بسر خویش جا دہند"

بحر کے شکم میں آبدار موتی ہوتے ہیں اور سطح پر خس و خاشاک بھی۔ مفہوم یہ ہے کہ جو دریا دل ہیں اہل صفا ہیں ان کے سینۂ بے کینہ میں وہی موتی کی آب اور روشنی کا نورِ باطن ہے جس سے وہ منور ہے پھول کی طرح پست فطرت لوگوں کو بھی سر پر اُٹھاتے ہیں۔

"رنگینیِ وفاست کہ از سر گذشتگاں
چوں شمع گل تقابلِ تیغ آزما دہند"

شمع کا روشن حصّہ جو سر ہوتا ہے اصطلاح میں "گل" کہلاتا ہے، اور اسی رعایت سے بتی کو "خارِ شمع" کہتے ہیں۔ شمع نے بھی سر ہتھیلی پر رکھا ہوا ہوتا ہے۔ ایسے جانبازوں کی رنگینیِ وفا کا تقاضا ہے کہ شمع کی طرح "تیغ آزما" یعنی قاتل کے سامنے اپنا سر پیش کریں۔ شمع کا گل مقراض سے کاٹتے ہیں، تو اس گل کی رنگینی یعنی روشنی اور شوخ ہوتی ہے۔

"بد طینتے اگر سپرد راہ غفلتے
خوباں ز کف عنان تحمل چرا دہند"

اگر کسی بد طینت نے غفلت کی روش اختیار کرتے ہوئے کوئی ناشائستہ کلمہ کہہ بھی دیا تو نیک سیرت اور خوب سرشت عنانِ تحمل ہاتھ سے کیوں دیں۔

خان دوراں کے فرستادہ کی زبانی عرض سُن کر شاہ صاحب چیں بجبیں ہوئے

اور فرمایا کہ میں مدح وذم کے تاثرات سے بالاتر ہوں۔ اگر کسی ہرزہ گو نے مجھے بُرا کہا تو کیا لیکن فقرا کی غیرت کا تقاضا کچھ اور ہے فی الحال بارگاہ قضا سے یہ حکم صادر ہو چکا ہے کہ اس بے ایمان کی جان اسی بدمستی میں قبض کی جائے۔

شاہ صاحب یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ خبر آئی کہ اس بے ادب کی زبان بند تھی طبیبوں نے ایک قدح مے اس کے مُنہ میں انڈیلا کہ شاید اس کی حرارت سے لقوہ کے شکنجہ سے گلو خلاصی ہو۔ لیکن یہ عمل بھی مؤثر ثابت نہ ہُوا۔ اس کا گلا بند ہو گیا اور غرغر کرتا ہُوا ہلاک ہُوا۔

شاہ صاحب نے حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ جب کوئی حاکم کسی مملکت پر مامور ہوتا ہے اس کا اوّلیں فرض یہ ہے کہ وہ اہلِ فساد کا قلع قمع کرے تاکہ امن قائم ہو۔ آج ان ممالک کا اختیار میرے قبضۂ تصرف میں دیا گیا ہے اگر اس طرح تادیب نہ کی جائے تو نسق آداب حق شناسی کا نظم و نظام بھی درہم برہم ہو جائے۔

اس واقعہ عبرت نما کے ظہور کے بعد شاہ صاحب کی محفلِ قدس میں حکیم طاہر گیلانی بھی باریاب ہُوا۔ بات کرتے وقت مُنہ سے پھول جھڑتے تھے۔ موزوں طبیعت کلمات سنجیدہ میزان وقار میں گوہر فروشی کرتی تھی۔ شاہ صاحب کی اس کے حال پر زیادہ توجہ ہوئی۔ ایک دن فرمایا کہ میں نے حق تعالےٰ سے درخواست کی تھی کہ تیرا باطن بھی تیرے ظاہر کی رنگینی سے متصف اور تیرا اعتقاد بھی تیرے صفائی کلام کے ہم رتبہ ہو۔ اگرچہ تاحال اس کا اثر ظاہر نہیں ہُوا لیکن جو امر ہوتا ہے وہ مقررہ وقت پر ہی ظہور میں آتا ہے۔

ما و تو جُملہ منتظر فضل و رحمتیم — تا شاہد قبول نصیب کنار کیست
در ہر بساط آئینہ ہا دام چیدہ است — تا جلوہ مائل چمن انتظار کیست
از سبزہ تا نہال جگر تشنہ اند لیک — بر رشحۂ سحاب کرم اختیار کیست

تیسرے روز حسب معمول مجلس گرم تھی کہ کسی نے کہا کہ حکیم طاہر بحران سودا میں مبتلا ہو گیا۔ اور آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے، اور آپ کی قدم بوسی کے لئے بے قرار ہے۔

اگر اجازت ہو تو یہاں لائیں۔ شاہ صاحب نے مرزا ظریف اور مجھے بیمار پرسی کیلئے بھیجا، لیکن ساتھ ہی تاکیداً فرمایا کہ اگر یہاں آنا چاہے تو ہرگز ساتھ نہ لانا اور کہہ دینا کہ دو روز اور صبر کرے ارادۂ الٰہی کے مطابق میں ہدایت اسی طریق سے کروں گا۔ اور آپ ہی یہاں لاؤں گا۔ القصہ جب ہم بیمار کے سرہانے پہنچے تو اس کی گریہ وزاری سو قدم پیشتر استقبال کے لئے آئی۔ ہم نے خیر و عافیت دریافت کی، تو کہا کہ میں بیمار نہیں ہوں۔ بات کہنے کی نہیں مگر آپ آں جناب کے محرموں میں سے ہیں۔ آپ سے کیا چھپاؤں۔ بات یہ ہے کہ عرصہ ہؤا میرا والد حکیم نورالدین فوت ہو گیا۔ اور اسی کلفت خانہ کے پائیں باغ کے صحن میں مدفون ہے۔ حقوق پدری کا تقاضہ ہے کہ میں فاتحہ خوانی کے بہانہ زیارت کے لئے جایا کرتا ہوں، جس روز شاہ صاحب سے رخصت ہو کر گھر آیا، حسب معمول شام کے وقت فاتحہ کے لئے گیا۔ معاً بد بو سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ قبر سے ایک عفریت کی صورت نے سر نکالا، جب غور سے دیکھا ریچھ نظر آیا۔ رات کا وقت تھا، میں وحشت زدہ ہو گیا۔

در دل شب چارہ از وحشت نداد ہیچ کس — لوح سود ایک قلم منقوش اوہام است و بس
سایۂ خود ہم سیاہی گر کند بی وہم نیست — خاصہ ہرگہ سایہ آفاق گیرد پیش و پس

میں نے چاہا کہ لوٹ جاؤں ناگاہ خرس نے فریاد شروع کی کہ "اے طاہر میں نورالدین تیرا باپ ہوں مجھ سے کیوں ڈرتا ہے، میری مثالی صورت سے تو عبرت حاصل کر۔ یہ سب کچھ ان گناہوں کا نتیجہ بھگت رہا ہوں کہ اپنا باطل مذہب عبادت سمجھتا رہا، یہ عذاب جس میں تو مجھے مبتلا دیکھتا ہے یوم قیامت کے عذاب کا پیش خیمہ ہے۔ جس کا انتظار کر رہا ہوں، جو مجھ پر گذر رہی ہے کسی دشمن کے نصیب نہ ہو او۔ جو میں دیکھ رہا ہوں کوئی کافر بھی نہ دیکھے، میں جسے ایمان سمجھتا رہا کفر تھا۔

کرد خرسے کہ دین رفض ایجاد — مرکز صد ہزار نفریں باد

حالات دیکھ سن کر میرے حواس بجا نہ رہے۔ بے ہوش ہو کر گرا، مجھے یہاں اٹھا کر لائے اور بستر پر لٹا دیا۔ اب حالت یہ ہے کہ جس طرف نظر کرتا ہوں وہی نقشہ روبرو

ہے، آنکھیں بند کرتا ہوں تو وہی صورت دکھائی دیتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان اسرار کا کشف جو مجھ پر ہوا محض حضرت شاہ صاحب کی توجہ کا اثر ہے۔ اگر اسی حالت کش مکش میں مرجاؤں تو کیا ہوگا۔ خدا را شاہ صاحب کی خدمت میں میرا حال زار بیان کریں۔ میری ہزار بار توبہ، افسوس صد افسوس۔

فرصت از کف رفت و دل کارے نکرد افسوس عمر
کارواں بگذشت و من در خواب غفلت وائے من

میں نے کہا کہ شاہ صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ دو روز اور صبر کرو، اس میں کچھ شک و شبہ نہیں کہ تمہاری عاقبت محمود ہے، غرض ہر طرح تسلّی آمیز باتیں کیں اور رخصت ہو کر شاہ صاحب کی خدمت میں آئے اور تمام حالات عرض کئے۔ تیسرے روز صبح کا وقت تھا، دوست وظائف سے فارغ ہو چکے تھے کہ حکیم طاہر کی آمد کا شور ہوا۔ جونہی شاہ صاحب پر نظر پڑی، نعرہ مار کر قدموں پر گرا۔ شاہ صاحب نے اُٹھایا اور بغل گیر ہوئے۔ اور بکمال لطف سے اپنے سامنے بٹھایا۔ اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ابیات زبان مبارک سے فرمائے۔

ما جام جہاں نمائے ذاتیم ما ہادیٔ عالم صفاتیم
کو مردہ بیا کہ روح بخشیم کو تشنہ درآ کہ فراتیم

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا فیض عام ہے۔ بندہ خواہ کتنا ہی گنہ گار ہو ایک آہِ ندامت سے غفلت کی گرہ کھل جاتی ہے، جہاں اس کا فضل کارفرما ہے وہاں گناہوں کی حقیقت ہی کیا ہے خوش ہو کہ تیری ندامت اشک نے تمام سیاہ کاری کے نقش مٹا دئے اور تیری توبہ "مژدہ ساز محفل رستگاری" ہے۔ اس کے بعد اپنی دستار حکیم کے سر پر رکھی، ہر طرف سے نوائے مبارک باد و مرحبا بلند ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد حکیم نے شاہ صاحب کے قدم چومے اور کہا کہ اس عطیہ کا شکریہ ہزار گانہ سے کم نہیں، ایک دو سانس جو میری زندگی کے باقی ہیں اجازت دیں کہ اپنی منزل گاہ پر جا کر دوگانہ اخلاص ادا کروں۔ شاہ صاحب مسکرائے اور فرمایا

کہ ایسے کارِ خیر میں تاخیر نہ چاہیئے - یارانِ محفل میں سے بعض حکیم کو گھر تک چھوڑنے کے لئے گئے۔ ابھی چند قدم واپس لوٹے تھے کہ چپ و راس سے شور اٹھا اور معلوم ہوا کہ رکوع کے بعد حکیم کا "نقش جبیں بسجدۂ ابدی پیوست"، تمام احباب شاہ صاحب کی معیت میں نمازِ جنازہ میں شریک ہوئے اور شاہ صاحب نے اپنے ہاتھ سے سپردِ خاک کیا۔

ہم چو اخوان عمر باد ربند غفلت کرد صرف — یوسفی در جلوه آمد تا بروں از چاه شد
درد پیدا کن که ایں دریا سراسر مرہم است — نیست محرومِ اجابت گر خموشی آه شد
شوخیٔ نظاره بود افسوں طراز ما و من — چوں مژه آمد بہم افسانہ ہا کوتاه شد

بیدل اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے رافضیوں کے عقائد پر تنقید کرتا ہے کہ

"ستم می پرورد آغوش گل از خار پروردن
زبانے را کز و کار درود آید به سب مکشا"

"دوستی رفضه بائمہ معصومین ظلمے ست صریح، ولاف حب ایں طایفه باآن تقدس نسبتاں تہمتے ست قبیح، که ہر گاه دم از حب می زنند نفس ہا توام بہ بغض می بالد، وتا صرف مہر بر زبان می آرند، معنی مترادف حسد می نالد، فحش درچہ مذہب از شعبہ ہائے عصمت ست و نا سزا در کدام ملت سزاوار ستایش غفلت، می گویند تولائے عمرو بی تبرائے زید صورت نمی بندد، اما نفہمیده اند که اتفاق ایں دو تخیل در یک محل بر جہل فطرت می خندد، ترا از غیر محبوب فراموشی می خواہد نه بر خیال اضداد سرگوشی، پس محبت با عداوت جمع کردن، برق در مزرع آگاہی کاشتن است، و زنگار در آئینہ پروردن ستم بر حقیقت صفا جائز داشتن۔"

مفہوم اس عبارت کا یہ ہے کہ اجتماع ضدین محال ہے۔ حب و بغض اضداد ہیں اور بیک وقت ایک ہی محل میں دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔ ائمہ معصومین کے بارہ میں

لاف حب بھی ہو اور اصحاب رسول کریمؐ سے بغض بھی ہو ایک دل میں کیسے جمع ہوں مناسب تو یہ ہے کہ ماسوئے محبوب جو کچھ بھی ہو بھول جائے نہ کہ غیر محبوب سے سرگوشی جاری رہے اور محبوب سے بھی دعوائے محبّت ہو۔ اس محبت اور عداوت کو جمع کرنا ایسا ہی ہے جیسے برق کو خرمن میں پرورش کرنا یا آئینہ کو زنگار آلودہ کرنا اور پھر اس کی صفائی پر فخر کرنا۔ علاوہ ازیں کس ملّت اور کیش میں کسی کو ایسے الفاظ ناشائستہ سے یاد کرنا جائز ہے، بدی بدی ہے اور نیکی نیکی نہ بدی نیکی اور نہ نیکی بدی ہو سکتی ہے، اگر ایک شخص بد کلام ہے تو اس کو خوش کلام نہیں کہیں گے جس کے دل میں بغض، حسد اور کینہ کے جذبات ہیں اور وہی زبان پر بھی آتے ہیں۔ ایسا دل اور زبان گندی ہے۔ ایک رباعی میں بیدؔل کہتا ہے کہ وہ وقت جو سب وشتم میں صرف ہوتا ہے کاش درود حسنینؓ پر صرف ہوتا جس کا کچھ اجر بھی ملتا۔

ستم می پرورد آغوش گل از خار پروردن
زبانے را کزو کار درود آید بہ سب مکشا

سعدی کہتا ہے :۔

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا — دلِ دشمناں ہم نکردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام — کہ بادوستانت خلاف است و جنگ

بہرحال اس حقیقت سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ سُنّی اور شیعہ کے جھگڑوں نے مسلمانوں کو اس حد تک نقصان پہنچایا کہ یہ تنزّل میں آرہے اور نامسلمان ان پر مسلّط ہو گئے۔ مدح اور سب صحابہ سے تو صحابہ بے خبر ہیں اور نہ ایسی باتوں سے تلافی مافات ہو سکتی ہے، بیدؔل نے ایک رباعی میں شیعہ اور سُنی کے عقائد سے الگ ہو کر ایک بات ایسی کہی ہے کہ اس لائق ہے کہ آب زر سے لکھی جائے۔

ہر سانحہ کہ شد بافسانہ دلیل — بیکاری خلق اوراست کفیل
موسیٰ تاہنوز می شگافد دریا — فرعون تاحال غوطہ خورد بہ نیل

جس واقعہ یا حادثہ میں افسانوی پہلو نکلتا ہو یا پیدا کیا جاسکے بیکار لوگ اس کو

اپنا لیتے ہیں۔ نہ صرف اس میں رنگ آمیزی اور مبالغہ کرتے ہیں بلکہ گرمیٔ محفل اور اور مجلس آرائی اسی میں سمجھتے ہیں کہ انھیں بار بار دہرایا جائے۔ موسیٰؑ اور فرعون کا واقعہ تاریخی ہے جو ایک دفعہ رونما ہوا اور گذر گیا اولی الابصار کے لئے درسِ عبرت چھوڑ گیا۔ لیکن کیا ضرور ہے کہ اس کا تکرار ہر ایک زمانہ میں کیا جائے۔ سوائے اس کے واعظانِ شہر کو اور کچھ مطلوب نہیں کہ اسے افسانوی رنگ میں پیش کرتے ہوئے اپنی محفل گرم کریں۔

"عاقلے را سرگذشت رفتگاں از کار برد
ہر کجا افسانہ باشد ہیچ کس بیدار نیست"

کسی زمانہ میں بے فکرے امیر جو تمام دن بیکاری کی وجہ سے رات آرام سے سو بھی نہ سکتے تھے ان کا محبوب مشغلہ تفریح ہی تھا۔ رات پلنگ پر لیٹے اور قصّہ خوان حسب معمول حاضر ہو گیا، اس نے داستان امیر حمزہ شروع کر دی اور نواب صاحب کو سُلا دیا۔ اس لئے علم ادب میں قصّہ اور خواب نے ایک تلمیح کی حیثیت اختیار کر لی، دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ بیدؔل کہتا ہے کہ جو حضرات گزر گئے اپنے اپنے وقت اچھا یا بُرا جو کچھ بھی کام کیا کر گئے۔ مناسب تو یہ ہے کہ ہم اپنے زمانہ کے حالات سے نپٹیں، یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ:۔

"یکے نیمہ از عمر خود کم کنم ؛ جہانے پُر از نام رستم کنم" (فردوسی)

اپنا وقتِ عزیز "سرگذشت رفتگاں" کو دہراتے دہراتے ضائع کریں جس کا فائدہ ان کو بھی نہیں جن کی یاد تازہ رکھتے ہیں۔ حافظ نے کیا اچھا کہا ہے کہ

عیب رنداں مکن اے زاہد پاکیزہ سرشت ؛ کہ گناہ دگرے بر تو نخواہند نوشت
من اگر نیکم اگر بد تو برو خود را باش ؛ ہر کسے آں درود عاقبت کار کہ کشت

کسی کے عیب بیان کرنا اخلاقاً معیوب ہے، اگر کسی نے کوئی گناہ کیا تو اسی کے نامۂ اعمال میں درج ہو گا یہ تو نہ ہو گا کہ اس کا عیب تیرے نامۂ اعمال میں لکھا جائے۔ اگر کوئی نیک ہے تو نیکی کا فائدہ اسے ملتا ہے اور اگر کوئی بدی کا مرتکب ہوتا ہے

تو اس کا وبال اس کے اپنے نفس پر، جو جیسا بوئے گا ویسا کاٹے گا۔ تو کسی کو بُرا کہہ کر خود بُرا کیوں بنتا ہے " تلک اُمة قد خلت لها ما کسبت ولکم ما کسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون " (پ ۱۴)

بیدل اپنا ایک واقعہ خواب بیان کرتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ شاہ صاحب کی مجلس میں اہلِ علم وفضل بیٹھے ہوئے تھے اور مسئلہ "حیا" پر گفتگو ہو رہی تھی۔

برنگے سخن در حیا می گذشت — کہ شبنم ز روئے ہوا می گذشت
دل از سینہ تا لبِ عرق گشتہ بود — گداز نفس در طبق کردہ بود
بیاں بسکہ تعلیم آداب داشت — نگہ پر زدن در رگِ خواب داشت

شاہ صاحب کا معمول تھا کہ جب کوئی ایسا موضوع زیر بحث ہوتا تو میری طرف اشارہ فرماتے کہ ہاں تم بھی کہو تمہارے خیال میں کیا آتا ہے۔ میں کوئی شعر یا نکتہ موزوں مناسب مقام عرض کرتا جس سے حضارِ مجلس بھی محظوظ ہوتے۔ حسب معمول شاہ صاحب نے فرمایا کہ تیرے خیال میں کیا آتا ہے، میں نے عرض کیا

" حیا خواندم نگہ در گرد خط ماند
ادب کردم رقم خط در نقط ماند "

یہ تو خواب کا معاملہ تھا۔ چند روز گزر گئے۔ ایک روز شاہ صاحب کی مجلس میں "تذکرۃ الاولیاء" پڑھا جا رہا تھا کہ ایک شخص بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے لئے آیا۔ اور باتوں باتوں میں مسئلہ "حیا" کی بابت استفسار کیا، پیر بسطام نے جو کچھ جواب دیا پڑھ کر مجھے تامل ہؤا کہ یہ جواب کس عنوان سے رنگِ عبارت اختیار کرتا ہے، شاہ صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ صحیح تو وہی ہے جو تو نے اس رات نظم میں کہا تھا لیکن طریق بیان میں اشارات بہت ہیں اور بے حرف وصوت عبارات بے شمار۔

دانا نہ ہمیں صوت و صدا می گوید — اکثر بہ اشارات و ادا می گوید
بے کام و زباں ہزار حرف است اینجا — آئینہ بروئے تو چہا می گوید

ملاقی دل کو دل سے ہے براہِ راست خاموشی
جو محرم ہیں زباں کے وہ نگہ سے کام لیتے ہیں (مؤلف)

بیدل نے اس واقعہ کے تحت "کشف" پر لطیف بحث کی ہے، ہمارے زمانہ میں اب تو نفسیات کے عالم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ "دل را بدل رہیست دریں گنبد سپہر" کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اور اسے "ٹیلی پیتھی"[1] وغیرہ اصطلاحات سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ایسے واقعات جن کا تذکرہ بیدل کرتا ہے،

---

[1] ۱۸۸۲ء میں انگلستان میں چند نامور حکماء نے ایک انجمن کی طرح ڈالی۔ اس کا نام "سوسائٹی فار سائیکیکل ریسرچ" (تھا)

ان مشاہیر میں سے چند نام حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ سر ولیم بیرٹ
۲۔ پروفیسر سجوک
۳۔ ایف۔ ڈبلیو۔ ایچ، مائرس
۴۔ ایڈمنڈ گرے
۵۔ سر ولیم کروکس
۶۔ سر اولیور لاج
۷۔ جے۔ آر تھر ہل

ان حکماء کی غرض یہ تھی کہ یہ جو لوگ دعوے کرتے ہیں کہ ہم روحوں سے باتیں کرتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟ ان میں سے ہر ایک حکیم مستند عالم کسی نہ کسی علم کا ہے، اور صاحب تصنیف بھی ہے۔ سوسائٹی نے کچھ سوالات مرتب کئے اور یورپ اور امریکہ میں شائع کئے۔ ان سوالات میں ہر ایک شخص کو دعوت دی گئی تھی کہ روحوں کے بارہ میں اپنا مشاہدہ بیان کرے۔ جو جوابات موصول ہوئے اُن کو ترتیب دے کر کئی جلدوں میں شائع کیا گیا۔ ان پر تبصرہ "مسٹر ہل" نے لکھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "میرا مذہب نہ تو روحانیات ہے اور نہ مادیات اور نہ مجھے علم ہے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے

حکماء یورپ اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ تاحال کسی علم سے جو آج تک معلوم ہو چکے ہیں ان کی توجیہ نہیں ہوتی۔ اس لئے یا تو یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ روحانیات کی دُنیا مادیات سے الگ ہے اور اس کے قوانین بھی علاحدہ ہیں جن کا علم ہمیں نہیں۔ یا یہ بھی مادہ ہی کے خواص اور آثار ہیں، بہر حال جو کچھ بھی ہے ہم اس کی حقیقت سے واقف نہیں۔ اور محض عدم واقفیت کوئی دلیل انکار کی نہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸) بھی کہ نہیں۔ لیکن سوسائٹی کی روئداد سے یہ ناقابل انکار حقیقت اتنی ضرور واضح ہوتی ہے کہ کچھ تو ہے اور واقعات مبیّنہ کی توجیہ اس وقت تک کسی علم کی شاخ سے نہیں ہوتی مگر بعض واقعات ایسے ثقہ لوگوں نے بیان کئے جن کی نسبت یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ دیدہ دانستہ جھوٹ بولتے ہیں۔ شاید ذہنی ارتقاء کے ساتھ کسی آیندہ زمانہ میں اس کی توجیہ تسلّی بخش ہو جائے۔ ان میں سے دو باتیں ایسی ہیں جن کو حکماء نے تسلیم کر لیا ہے۔ ایک "ٹیلی پیتھی" (   )
اور دوسری "سب لیمنل سلف" (   ) آخر الذکر دو لفظوں سے مرکب ہے "سب" بمعنی "تحت" اور "لیمن" بمعنی "دہلیز یا آستانہ" اس کو تحت الشعور کہہ سکتے ہیں، اوّل الذکر کی مثال یہ ہے کہ آپ کا کوئی عزیز یا دوست آپ سے ہزاروں میل فاصلہ پر رہتا ہے' کسی خاص تاریخ اور وقت پر آپ اس کو ایک خاص پوشش اور وضع میں خواب میں دیکھتے ہیں ایک خاص حادثہ آپ اس پر سے گذرتا ہوا دیکھتے ہیں یا وہ یہ حادثہ آپ سے بیان کر رہا ہے۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ ٹھیک اسی تاریخ اور اسی وقت اور اسی مشاہدہ شدہ پوشش وغیرہ میں یہ حادثہ من وعن اس پر واقع ہوا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ اپنے گھر میں ہیں اور آپ کے وہم وگمان میں بھی عزیز یا دوست کا خیال نہیں، لیکن عین بیداری میں یہ آپ کے کرہ میں داخل ہوتا ہے۔ آپ خوش آمدید کہنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں اور وہ صورت غائب ہو جاتی ہے۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ ٹھیک اسی تاریخ اور وقت پر آپ کا عزیز یا دوست رحلت کر گیا"

تحت الشعور کے ضمن میں جو کچھ مسٹر یل نے لکھا ہے وہ ہمارے زمانہ میں علم نفسیات کا موضوع ہے، تجزیہ نفسیات پر "فرؤیڈ" نے بہت بحث کی ہے مگر یہ (باقی حاشیہ صفحہ ۵۰ کے نیچے)

بیدل لکھتا ہے کہ :-

"آگاہی صاحب دلاں از احوال بنا بر آنست کہ اجزائی آب بے غبار موانع بپیوستہ دریک دیگر می جوشند، وغفلت مقیداں بعلت این کہ عنصر سنگ جز بحجاب وافسردگی نمی کوشد، اگر یکسر آب حرکت دہند بسراسر روئے دریا میدود، واگر ہزار سنگ برہم کوبند پہلوہا متاثر جنبشے نمی شود، آئینہ داراں معنی صفا اگر از باطن کدورت طینتاں نیز اسرار واکشند بعید نیست، زیرا کہ جوہر آب بقوت لطافت ہم سیاح ساحت ہواست، وہم غواص طبیعت خارا، در خانہ کہ آئینہ نصب کردہ باشند، ہرچہ در آں خانہ جلوہ نماید ایں جا مرئیست، وآنچہ در آنجا بعرض آید دریں مقام متجلی"

"اسمائی ظہور بانگ ناقوس دل ست — اشیا ہمہ اعتبار محسوس دل است"
"ہر ذرہ دریں دشت چراغے دارد — یعنی ایں جملہ چشم جاسوس دل است"

"ہرچند آئینہ کمال ایں طائفہ بحکم وارستگی تمثال گداز است، وآب ایں چشمہ ہائی استغنا از بلند وپست امواج بے نیاز، اما جوہر صفائی آں بالطبع در امتناع احوال خلائق ناچار است، ودر افشائی رموز مستتر بے اختیار"

"آئینہ آہن ہم دگر نور صفا ست — عکس صور است آنچہ کہ در وے پیدا ست"
"بیدل تو ہمیں بصیقل دل پرداز — کایں آئینہ چوں صاف شد اندیشہ نما است"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹) علم ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہے وہ لکھتا ہے کہ تحت الشعور ہماری قوت ارادی بھی کام کرتی ہے اور ہم خلاق بھی بن جاتے ہیں۔ تحت الشعور ہم پر ایسے اہم انکشافات ہوتے ہیں جو بیداری میں باہمہ ذہنی کاوش نہیں ہوتے۔ بیداری میں خواہ کتنی "آمد" ہو "آورد" سے خالی نہیں ہوتی۔ لیکن تحت الشعور آمد ہی آمد ہے۔ ایک شاعر تحت الشعور اسی طرح شعر موزوں کرتا چلا جائیگا جس طرح بیداری میں بے تکلف گفتگو کرتا ہے۔

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ اہلِ دل کا تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب اس درجہ تک ہوتا ہے کہ جو کچھ آئینہ کے سامنے آئے اس کی صورت بعینہٖ اس میں رونما ہوتی ہے، اگرچہ ان حضرات کی وارستگی اور استغنا اس سے بالاتر ہے کہ لوگوں کے دلوں کے پوشیدہ حالات دریافت کریں لیکن ان کے آئینہ دل کی صفائی بالطبع بلا ارادہ ان حالات سے آگاہ ہوتی ہے جیسے آئینہ میں ہر ایک صورت جو بھی روبرو ہو نظر آتی ہے۔ اسی طرح آئینہ قلب جب صاف ہو "اندیشہ نما" ہوتا ہے یعنی دوسروں کے خیالات کا عکس اس پر پڑتا ہے، اس ضمن میں بیدلؔ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک صاحب دل کی مجلس میں چند آدمی بیٹھے ہوئے تھے، حاضرین میں سے ایک کے دل میں یہ آیا کہ اگر یہ بزرگ صاحب کشف ہے تو میری خواہش انگور ہے ضرور عطا فرمائیگا۔ صاحب دل نے انگور منگوائے اور پیش کیے حاضرین کے دل میں یہ خیال آیا کہ مجمع میں اور آدمی بھی تو تھے صرف اسی ایک کے حال پر اتنی توجہ کیوں ہے، یہ وسوسہ بھی صاحب دل پر منکشف ہوا۔ فرمایا کہ اس شخص کے دل میں رغبت انگور تھی اور دل ہی دل میں چٹخارے لے رہا تھا، یہی کیفیت میرے دل میں بھی پیدا ہوئی "وقوع ایں حرکت بمثال شخص مقابل است، نہ از خواہش ہائی آئینہ صافی منزل، ایں جا جمعے کہ بہ بساط بے طلبی آرمیدہ اند، ارادہ دیگراں را مراد خود فہمیدہ، کشف قلوب از معنی ہائی ایں عبارت ست و اشراق ضمائر از مضامین ایں استعارت است" جسے کشف قلوب کہتے ہیں۔ اس کی حقیقت یہی ہے کہ اہلِ دل کا آئینہ قلب خود تو صورتیں پیدا نہیں کرتا جو شے روبرو ہو اسی کی صورت ہوگی۔ اور یہ صورت اس شخص کی خواہشات اور ارادہ کی ہوگی جو مقابل ہے۔ بہرحال کشف احوال خواہ ارادتاً ہو یا بلا ارادہ تصفیہ قلب پر موقوف ہے اور یہ تقوے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ اہلِ دل کی مثال پانی کی ہے کہ اس کے اجزاء ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور ان میں لطافت اس درجہ ہے کہ ہر ایک شے میں خواہ ہوا ہو یا جمادات نفوذ کرتے ہیں۔ جو لوگ اہلِ غفلت ہیں ان کی مثال پتھر کی سی ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ لیکن پانی کو ایک سرے سے حرکت دیا

توتمام اجزا متحرک ہوتے ہیں جو اہلِ صفا ہیں نہ صرف اہلِ صفا کے حالات سے واقف ہوتے ہیں بلکہ جو کدورت طینت لوگ ہیں ان کے باطن سے بھی باخبر ہوتے ہیں کیونکہ پانی، ہوا اور جمادات میں یکساں نفوذ کرتا ہے، مزید بحث مناسب مقام پر کی جائیگی۔

۱۰۸۳ھ کا واقعہ ہے، بیدل دہلی میں تھا۔ ایک رات شاہ صاحب کو خواب میں دیکھا، اس حالت میں کہ پانی کا پیالہ بیدل کے ہاتھ میں تھا، دل میں آیا کہ پی جاؤں، آئین ادب وحیانے پسند نہ کیا اس لئے پیالہ شاہ صاحب کے پیش کیا۔ آپ بے تکلف پی گئے۔

دوسری رات بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ کہ شاہ صاحب کے ہاتھ میں ساغر ہے اور شیشہ بغل میں، جس طرح مست ایک دوسرے کو پلاتے ہیں شاہ صاحب نے ساغر میرے پیش کیا۔ مجھے معاً خیال آیا کہ "اطوار آں محفل عصمت از آرائش و مینا معرا وادضاع آں انجمن تمکین از تہمت اسباب بے اعتدالی مبرا"، لیکن بحکم تسلیم میں نے قدح پر کیا اور پیش کیا، فرمایا کہ میرا دور پیمانہ کل رات ختم ہو گیا۔ اتنا اب تیری قسمت ہے جو تجھے دے رہا ہوں ؎ بعد ازیں سرخوش قدح پیمائی شوق میباش، و دماغ اندیشہ بخار ہائی کدورت مخراش"

"سیر ایں میکدہ ہنگامۂ دورے دارد ہوش ہر کس قدم جادۂ طورے دارد"
"ما گذشتیم ازیں ورطہ تو خود را دریاب ہر گریباں سر کیفیت غورے دارد"

ساقی اسرار نے چند ساغر پے در پے دیئے، اسی عالم قدس میں میرے پاؤں مستوں کی طرح لڑکھڑانے لگے چنانچہ آج تک یہ نشہ نہیں اُترا۔

ان دو واقعات سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ شہسوار میدانِ عزت اس وادی امکان کے غبار سے گزر گیا۔ تیسری رات عالم رؤیا میں مشاہدہ کیا کہ چند نورانی صورتیں جمع ہیں، میں داخل ہوا تو سب مجھ سے کہنے لگے کیا ہی اچھا ہو اگر شاہ صاحب کی رحلت کی تاریخ کہو میں نے فوراً کہا:

"زبی تعینی ذات" رفت نام "صفت" ۱۰۸۳ھ
۵۷۰ ۱۶۵۳

سن کر وجد میں آگئے اور کہا کہ الحق اس سے بڑھ کر لطیف تاریخ نہیں ہوسکتی۔ میں بیدار ہوا تو یہ مصرع صفحۂ خیال پر نقش تھا۔ ظاہر الفاظ شمار کئے تو تحقیق واقعہ درست نہ تھی، ذرا غور کیا تو بطریق تعمیہ حساب اعداد موافق سال درست تھے۔ "بی تعینی ذات" کے اعداد ۱۶۵۳ ہیں اور ان میں سے صفت کے اعداد ۵۷۰ منفی کئے تو ۱۰۸۳ھ ہے۔

یہ واقعہ تو خواب میں رونما ہوا۔ چھ ماہ کا عرصہ گذر گیا۔ اوڑیسہ میں کوئی خبر نہ ملی، حیران تھا۔ کبھی یہ شبہ گزرتا کہ شاید یہ محض وہم وخیال ہو۔ اگرچہ اس قسم کے واقعات میں وہم عقل سے زیادہ پیش بیں ہوتا ہے یعنی عواقب امور میں باہمہ شکوک زیادہ صاحب یقین ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی خیال آتا کہ ایک عمر ہم درس ملہم اسرار رہا ہوں اس قسم کی معانی کا وارد ہونا عالم خطا سے نہیں ہوسکتا۔ اور ایسے مضمون کا ظہور عبارت لغو نہیں ہوسکتی۔ آخر الامر چند دوست اوڑیسہ کی طرف سے آئے اور شاہ صاحب کی رحلت انہی ایام میں تحقیق ہوئی ناچار میں نے تاریخ پر چند مصرعے اور کہے:

شہ سر پر یقین قاسم ھو اللہی	کہ داشت ذات حقش ملک انتظام صفت
دماغ ہمت عنقائش رسائی کرد	پرے فشاند ز آشوبگاہ دام صفت
حضور ذات مے شوق وحدتش پیمود	تغافلے زد و برہم شکست جام صفت
بعافیت کدہ غیب بردشمع شہود	رساند تا احدیت پے خرام صفت
زسال واقعہ اش بیخودی بگوشم گفت	زبی تعینی ذات رفت نام صفت

یاد رہے کہ بیدل جیسا کہ ہم مناسب مقام پر واضح کرینگے "ذات بحت" کو منزہ از اسما وصفات کہتا ہے، یعنی ذات کسی نام یا صفت سے متعین یا مشخص نہیں ہوسکتی وہ بے تعین ہے، لیکن اسما وصفات جن سے ہم ذات کو معین اور مشخص کرتے ہیں یہ تعلق کائنات سے ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ بحیثیت ذات بے تعین منزہ از صفات ہے اور بہ تعلق کائنات صفات سے مشخص ہوتا ہے، ذات

"ایمپرسنل" اور صفات "پرسنل" ہے متکلمین نے اس موضوع پر بہت بحث کی ہے۔ یہ تصوف کا اہم مسئلہ ہے۔

شاہ کابلی | بیدل لکھتا ہے کہ میں اوڑیسہ تھا۔ ایک رات عالم افکار و غلبۂ وجد میں بے اختیار یہ شعر میری زبان پر جاری ہوگیا۔

"از ہر چہ سرایمت فزونی   خود گوئی چہ گویمت کہ چونی"

مصرع اولی کا مفہوم وہی کچھ ہے جو شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے کہ:

ای برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم   وز ہر چہ دیدہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر   ما ہمچناں در اوّل وصف تو ماندہ ایم

مصرع ثانی میں بیدل نے ایک بات پیدا کی ہے کہ جب یہ مسلم ہے کہ جو کچھ میں تیری حمد و ثنا میں کہوں تو اس سے بالاتر ہے تو یہ جاننے کے لئے کہ تو کیا ہے تیرے سوا اور کون بتا سکتا ہے، تو ہی اپنے آپ کو جانتا ہے، غرض میں اس شعر کو عالتِ وجد میں تکرار کرتا رہا یہاں تک کہ مجھ پر غنودگی طاری ہوگئی ناگاہ الہام کدہ بے حرف و صوت سے یہ ندا سُنی:

"از ما با ماست ہر چہ گویم   ما ہمچو توئی دگر چہ گویم"

اس شعر کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جس طرح ہر ایک شخص اپنے آپ کو جانتا ہے دوسرا شخص جو اس کا غیر ہے نہیں جان سکتا جب تک عین وہی شخص نہ بن جائے۔ اس لئے جو کچھ میں اپنی نسبت کہوں وہ میں ہی سمجھ سکتا ہوں کوئی اور نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن بیدل نے اس شعر کی شرح خود ہی اس کے بعد ایک غزل میں کی ہے کہ:

"من آں شوقم کہ خود را در غبارِ خویش می جویم
رہے در جیب منزل کردہ ام ایجاد و می پویم"

میں وہ شوق ہوں کہ اپنے آپ کو نہ کہ کسی غیر کو اپنے ہی غبار میں ڈھونڈھ رہا ہوں، منزل کی جیب میں ایک راستہ ایجاد کیا ہے اور اسی پر چل رہا ہوں۔

یعنی جادہ و منزل دونوں میں آپ ہی ہوں یا دونوں مجھ سے باہر نہیں ہیں :

"بروں از رنگ و بُو طرح بہار حیرتے دارم
دماغے می کشم در خون، گل تحقیق می بویم"

بہار کی رنگینی تو محسوس ہوتی ہے مگر میں اس عالم رنگ و بو سے باہر "طرح بہار حیرت" رکھتا ہوں، خون سے دماغ رنگین کر رہا ہوں اور "گل تحقیق" پیدا کرتا ہوں، یعنی محسوسات سے جو صرف صورتیں ہیں الگ ہو کر میں اس حقیقت کی تلاش میں ہوں جو ان صورتوں میں رونما ہوتی ہے۔

"نگہ در دیدہ می دزدم خیالے نقش می بندم
نفس در سینہ می کارم ہجوم نالہ می رویم"

میں نے نگاہ آنکھ کے پردہ میں چھپا لی یعنی محسوسات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے باطن کی سیر کر رہا ہوں، میرا سانس بیرونی ہوا سے بے نیاز ہو کر میرے سینہ ہی میں سرگرم عمل ہے اور "ہجوم نالہ" پیدا کر رہا ہے۔ یعنی میں عالم تشبیہ یا محسوسات خارجی کے اسباب سے بے تعلق اور بے نیاز ہو کر اپنے ہی دل میں وہ بات مشاہدہ کر رہا ہوں جو اصل حقیقت عالم شہادت کی ہے جسے غیب کہتے ہیں۔ اور منزہ اسما و صفات سے ہے۔

"حدیث غیر تنزیہ دماغم بر نمیدارد
زبان وحدتم حرفے برائے خویش می گویم"

تنزیہ کے سوا کسی بات کی برداشت میرے ذہن کو نہیں، میں وحدت کی زبان ہوں، خود ہی کہتا اور خود ہی سنتا ہوں۔

"بچندیں اختلاف صورت و معنی من بیدل
جز او دیگر چہ خواہم وانمود آئینہ ادیم"

کائنات عالم کثرت ہے اس میں جتنی صورتیں اتنے ہی معانی بھی ہیں۔ لیکن باہمہ اختلاف میں (بیدل) حقیقت نما آئینہ ہوں جس میں، اگرچہ صورتوں کی کثرت

جلوہ گر ہے مگر ان میں حقیقت ایک "وحدت" ہے میں چونکہ اسی وحدت کا آئینہ ہوں اس لئے اسی حقیقت کو جلوہ دیتا ہوں، "ما ہچو توئی دگر چہ گویم" آئینہ میں بھی وہی صورت حقیقت ہے جو آئینہ کے مقابل ہے، اس موضوع پر بیدل نے دادِ تحقیق اکثر اشعار میں دی ہے، مناسب مقام پر تشریح کی جائے گی۔

۱۰۷۶ھ کا واقعہ ہے کہ بیدل دہلی میں چند دوستوں کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ مجذوبوں کا ذکر چھڑ گیا۔ ایک نے کہا کہ ان دنوں ایک مجذوب آیا ہوا ہے اس کا عجیب حال ہے۔ سیروں کھانے پینے کی چیزیں بے تکلف ہضم کر جاتا ہے اور اگر کچھ نہ ملے تو کئی ہفتے بے آب و نان پڑا رہتا ہے، کسی سے بات نہیں کرتا، جب کبھی زیارت کے لئے جانا ہوتا ہے اکثر اوقات لمبی تانے سویا ہوا پایا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسے کابل میں دیکھا اس لئے آپ کو شاہ کابلی کہتے ہیں:

آں نشۂ غیب فارغ از عرض ظہور — از بسکہ تعینے ندارد منظور
جائے ہمہ ہوش است ندارد خبرے — در جائے دگر بے خبر د جملہ شعور

وہ خود تو کسی سے بات کرتے نہیں اس لئے آپ کا نام و حسب و نسب کیسے معلوم ہو۔ اب شاہ کابلی لوگوں نے نام رکھ دیا اسی نام سے مشہور ہیں:

مارا کہ علم است نہ معلوم شدن — نے خواہش منثور نہ منظوم شدن
مضمون ظہوری بخیال آمدہ است — باید بزبان خلق موسوم شدن

اگر غور کیا جائے تو ہر ایک شخص زبان خلق ہی سے موسوم ہے۔ خود شناس لاکھوں میں شاید ایک ہو اکثر اپنے آپ کو وہی کچھ سمجھتے ہیں جو لوگوں نے ان کے دماغ میں ٹھونس رکھا ہے۔ اشیاء کائنات ہوں یا ذات باری تعالےٰ زبان خلق سے ہی موسوم ہیں:

از و ہر چہ بگفتند از کم و بیش — نشانے دادہ اند از دیدۂ خویش
منزہ ذاتش از چند و چہ و چوں — تعالےٰ شانہ عما یقولون

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ یک لخت شاہ کابلی نمودار ہوئے۔ سب سرو قد

تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے۔ آپ مسکرا رہے تھے اور نگاہ میری جانب ہی تھی، اور میرے ہی پاس بیٹھ گئے۔ دسترخوان بچھا ہوا تھا، کھانا چنا گیا۔ چند لقمے بھی نہ کھائے اور مجھ بے دست و پا کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی طرح شہر کے باہر اس مقام تک لائے جہاں بیٹھا کرتے تھے، میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا، میں تو ادب و آداب کی وجہ سے چپکا بیٹھا منتظر تھا کہ شاہ صاحب کچھ فرمائیں اور شاہ صاحب خاموش۔

حق خامش است با تو بصد رنگ گفتگوست   شوق آرمیدہ است و فلک تاز جستجوست
موقوف اضطراب اگر نیست عرض راز   گرد از رہی اشارہ تحقیق مو بموست
ہر گہ نظر خطاب کند حرف خامشیت   ہر جا بہار ساز شود نغمہ رنگ و بوست
عشق است چنگ و غلغل این چنگ بینواست   دل شیشہ است و قلقل این شیشہ بے گلوست
کثرت حجاب جلوۂ وحدت نمی شود   مژگاں بہر چہ باز کنی دیدہ محو اوست

نماز عصر سے شام اور شام کے بعد رات کا کچھ حصہ اسی طرح خاموش بیٹھے بیٹھے گزر گیا۔ ناگاہ شاہ صاحب قہقہہ مار کر ہنسے اور وہی بیت جو عالم غیب سے اوڑیسہ میں میں نے سنا تھا کہ "از ما با ماست ہر چہ گوئیم
ما ہیچ و توئی دگر چہ گوئیم"

شاہ صاحب نے پڑھا۔ معاً سن کر میرے حواس باختہ ہو گئے۔ آخر ضبط نہ ہو سکا، پوچھا کہ یہ بیت کس کا ہے؟ پھر ہنسے اور کہا کہ میرا ہے۔ اس میں شبہ کی کونسی بات ہے۔ اتنا کہا اور پاؤں دراز کئے اور کہا کہ "ایں جا کشاد چشم غیر از حیرت چیزے ندارد، باید خوابید"

"شور تعمیر ہوس گرد دماغت جستہ نیست   گوشۂ امنی بغیر از چشم بر ہم بستہ نیست"
"عاقبت خواہی بر فع جرأت نظارہ کوش   بوئی راحت نیست تا مژگاں بہم پیوستہ نیست"

یہ بیداری کا کرشمہ ہے کہ ہوس کی عمارت کا شور و شغب دماغ میں بلند ہوتا ہے آنکھیں موندھ لو تو گوشۂ امن ہے آرام و آسائش تو اس وقت نصیب ہوتی ہے جب پلک سے پلک ملی رہے، آنکھیں کھلی ہوں تو نظارہ کثرت کب چین سے بیٹھنے دیتا ہے۔

شاہ صاحب تو سوگئے اور میں وہیں عالمِ حیرت میں بیٹھا دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ رات آخر ہونے کو تھی مجھ پر بھی خواب کا غلبہ ہو رہا تھا۔ اونگھتے اونگھتے سو گیا۔

شوخے کہ بہ بیزبانم افسوں کرد　　　آمد بزباں وحیرتم افسوں کرد
حرفے کہ بہ پردۂ خیالم می گفت　　　بررو آوردہ از خودم بیروں کرد

وہ شوخ جو چپکے چپکے مجھ پر جادو کر رہا تھا، بات کی اور میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی، وہ بات جو میرے خیال ہی میں کہی تھی میرے مُنہ پر کہی اور میں آپے سے باہر ہو گیا۔

صبح ہوئی، آنکھ کھُلی، میں تو وہیں تھا، مگر شاہ صاحب موجود نہ تھے، اِدھر اُدھر دیکھا کہیں نظر نہ آئے، دہلی کی خاک کئی دن چھانتا پھرا نہ ملے، آخر تھک کر بیٹھ رہا۔

آں جلوہ غیب کایں تحیر آراست　　　وانگہ چو نگہ زپیش چشمم برخاست
گر گویم خضر بود ترک ادب است　　　آنجا کہ حق است خضر والیاس کجاست

جو کچھ میں نے مشاہدہ کیا وہ جلوہ غیب ہی تھا جس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا، پھر میرے دیکھتے دیکھتے نظروں سے غائب ہو گیا۔ اگر کہوں کہ خضر تھا تو ترکِ ادب ہے۔ جہاں "حق" ہے وہاں خضر والیاس کا کیا مذکور ہے۔

دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ بیدؔل کو بھی ایک جگہ چین نہ تھا۔ موسم گرما کی شدّت، آشوب چشم کا عارضہ، "بندرابن" سے گزر کر شہر متھرا میں پہنچا۔ بازار لگا ہؤا تھا۔ دو کانوں میں سوائے جنس مروّت اور متاعِ ناشناسی سب کچھ تھا۔ بیدؔل چاہتا کہ کہیں تھوڑی دیر بیٹھ کر سستا لے، لیکن کوئی شناسا نہ ملا۔

حضور وعدتم جز در دل محرم نمی گنجم　　　می مینائی تحقیقم بظرف کم نمی گنجم
چہ ساماں داشت یارب دشتگاہ بے سروپائی　　　کہ من در ملک دل ہمچوں نفس یکدم نمی گنجم
بایں وحشت کہ دارد گرد تمثال "جنون من"　　　بہشتم گر شود آئینہ چوں آدم نمی گنجم
گہے صد آسماں در چشم مور ی می کنم جولاں　　　گہے در صد محیط آغوش یک شبنم نمی گنجم

گہے زاں رنگ میکاہم کہ سر در ذرہ میدزدم گہے زاں شوق می بالم کہ در خود ہم نمی گنجم
چو گو ہر وقت طبعم بروں افگندہ زیں دریا بخود گنجیدہ ام چندانکہ در عالم نمی گنجم

بیدلؔ یگانۂ روزگار تھا اس کی یکتائی کسی محرم رازِ وحدت کی تلاش میں تھی، کہ جہاں اس کی گنجائش ہو مینائے تحقیق کی شراب کسی کم ظرف میں کہاں رہ سکتی ہے۔ یہ وحشت جو میرے جنوں کی شکل و صورت گرد آلود رکھتی ہے اگر بہشت بھی پیش نظر ہو تو وہاں بھی آدم خاکی کی طرح میری گنجائش نہیں، کبھی تو ضعیف چیونٹی کی آنکھ میں سو آسمانوں کو گردش میں لاتا ہوں، اور کبھی سو سمندر بھی ہوں تو ایک قطرۂ شبنم کے برابر میری ان میں گنجائش نہیں۔ کبھی تو اس وضع سے اتنا حقیر ہوتا ہوں کہ ایک ذرّہ میں سما سکتا ہوں، کبھی شوق مجھے اتنا بڑا بنا دیتا ہے کہ اپنے آپ میں سما نہیں سکتا۔ جس طرح دریا موتی کو باہر پھینک دیتا ہے اسی طرح اس بحرِ ہستی سے میری دقتِ طبع مجھے باہر لے آئی میں اپنے آپ میں اتنا گنجان بن گیا ہوں کہ ایک عالم میں میری گنجائش نہیں ہے۔

اتفاقاً ایک رفوگر پر نظر پڑی، جس دوکان پر بیٹھا ہوا سوزن کاری کر رہا تھا اس کا متاع بھی اکیلا تھا۔ نگاہ کی طرح دیدہ تصوّر میں غیر کی گنجائش ہی نہ تھی، جب تک خود پہلو تہی نہ کرے کسی دوسرے کی اس میں سمائی نہ تھی مگر دیدہ سوزن میں رشتہ کی طرح مجھے بھی جگہ دمی، اب مجھے رہ رہ کر خیال آتا کہ کہیں میں بارِ خاطر نہ ہوں، میری گراں جانی اس کے پہلوئے اخلاق میں سوئی کی طرح ٹوٹ کر نہ رہ جائے؛

بیک دو روزہ سر و برگ زندگی مپسند کہ بہر خلق پے سود خور زیاں باشی
اگر غبار شوی محو دامن خود باش چناں مباش کہ تشویش دیگراں باشی

ابھی ایک ساعت نہ گزری تھی کہ ایک شخص دوکان کے سامنے آیا۔ رفوگر کھڑا ہو گیا اور عرض کی کہ اگر تشریف رکھیں مجھے اٹھنے کی عزّت بخشیں۔ اس نے کہا کہ نہیں یہ دردمند میرا دوست ہے پرسش احوال چاہتا ہوں۔ میں آنکھیں بند کئے

بیٹھا تھا آواز سے شناسا معلوم ہوا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ شاہ کابلی رفوگر کی جگہ بیٹھے مسکرا رہے ہیں، میں اُچھل پڑا۔ فرمایا کہ تھوڑی دیر سو رہو یہ عالم بیخودی عین شعور ہے اور صحبت خواب آئینہ حضور" میں نے آنکھیں بند کیں اور نیند کا غلبہ اتنا ہُوا کہ سو گیا۔ آنکھ کھلی تو وہی دوکان اور وہی رفوگر، شاہ کابلی غائب تھے، لیکن عارضۂ چشم بالکل رفع ہو چکا تھا۔

آں طبیب افسون نیرنگی نمایاں کرد و رفت
درد چشم را علاج از چشم حیراں کرد و رفت

حیران تھا کہ میرے حال پر اتنی التفات بھی ہے۔ اور دور دور ہی رہتے بھی ہیں، یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ دو سال اَور گذر گئے۔ اس عرصہ میں مَیں عقد نکاح میں جکڑا جا چکا تھا۔ اور آبائی پیشہ سپاہ گری بھی اختیار کر لیا، کہ سایۂ تیغ ہی میں امان ملے۔

بروں تا زاز درشہرت کہ شہرت بوئی خون دارد	بدفع چشم زخم خلق گمنامی فسوں دارد
جنوں کن یا سپاہی شو سپاہی ہم جنوں دارد	سلامت پیشہ را نبود بہ از دیوانگی کسبے

وجہ معاش کی وجہ سے ایک گونہ سہولت اور اطمینان تو تھا مگر وہ وارستگی کہاں جو تجرد میں میسر تھی، آخر مجھ پر حقیقت کھلی مخمصۂ توہم فقر و غنا سے نجات ملی اور یہ منکشف ہُوا کہ طلب مقصد بلا جہد ہمت سے دور ہے اور آرزوئے طلب کے ساتھ اگر رنج کوشش پسند نہیں کرتا تو تیرے ہی فقر کا قصور ہے۔ جو کچھ تجھے دولت فقر سے ملا تو نے گم نہ کیا کہ اس کے لئے زحمت جستجو کرنی پڑے۔ اور جو تیرے پاس تھا دور نہیں گیا کہ اس کے پیچھے دوڑنا پڑے، "صاحب لباس پیوستہ عریانی در بغل دارد، و شخص عریاں دامن کسوت بے سعی بدست نمی آرد" پس فقر بہر حال موجود ہے۔ اور غنا اکثر مقام میں مفقود ہے۔ ہمت کا تقاضا ہے کہ مشکلات پر کوشش سے غالب آئے نہ آرزوئے تن آسانی۔ بیدل اس مقام پر فقر و غنا پر بحث کرتا ہے کہ:

ای تحیر لعبت بزم فنا   چند باشی منکر وضع غنا
اعتبارات جہاں عز و وقر   جمع اسباب است بے ترتیب فقر
گر زہستی فقر باشد مدعا   جلوۂ بیرون عدم تازد چرا
عرض قدرت خارج اسباب نیست   شوخی طوفان بیرون آب نیست
ذات موسوم است بے ساز صفات   پس غنا ہا وصف باشند فقر ذات
فرصتے می خواہد ای بے معرفت   تا برآید ذات در رنگ صفت
یک سامان صفت چوں برق رنگ   بہر معدومی نمی خواہد درنگ
او بصد قدرت صفت پیدا کند   ایں بیک تغییر ذات انشا کند
خاک را یک عمر باید خورد خوں   تا برنگ شاخ و برگ آید بروں
شاخ و برگ آندم کہ خواہد ریختن   نیست دشوارش بخاک آمیختن
رشتہ ہا باموم باید جمع کرد   تا شرارے را توانی شمع کرد
شمع گر صد شعلہ بر تو افگن است   چوں خمش خواہی نفس ہم دامن است
ایں ہمہ عرض غنائے پیش و پس   تا تغافل کردۂ فقر است و بس
مدعا ایں است کز ہر وہم و ظن   ربط اسباب غنا برہم مزن
خاصہ اسبابے کہ بے دردسرت   اتفاق آوردہ باشد دربرت
فقرت از سیر گریباں حاصل ست   وین غنا بے جمع اشیا مشکل ست
گر بآسانی شود اسباب جمع   تیرگی در خانہ باید نور شمع
بے تردد جمع اسباب معاش   خوش تراست از کسب فقر بے تلاش
در معیشت مایہ عیش تو بس   آنقدر جہدیکہ نتواں زد نفس
از تردد ہرچہ یابی کلفت است   گر ہمہ خواب است خصم راحت است
کو غنا کو فقر ای غافل توئی   مفت یکتائی ست اظہار دوئی

ان ابیات کا مفہوم یہ ہے جیسے مولانا جامی نے اپنے شیخ طریقت خواجہ عبید اللہ احرار کے وصف میں لکھا ہے کہ:

چو فقر اندر لباس شاہی آمد ز تدبیر عبید اللہی آمد

بیدل کے ابیات میں ایک خاص بات ہے فقر بلا غنا اور غنا بلا فقر ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص مادر زاد ننگا ہو یا لباس ہو مگر کسی کے بدن پر نہ ہو۔ وہ عریانی کی پوشش ہے۔ خواہ جسم عریاں ہو آخر جسم ہے۔ محض لباس اگر جسم کی پوشش اور زینت نہ ہو بے معنی ہے۔ اس لئے فقر تو بہر حال مقدم اور مقصود حقیقی ہے۔ "فقر" کے معنی لغوی زمین شور ہے جس میں کچھ پیدا نہ ہو، اصطلاح میں احتیاج اس کا مفہوم ہے "اللہ غنی وانتم الفقراء" غنی تو اللہ ہی ہے۔ انسان تو پیدائشی فقیر ہے۔ جو کچھ دیا ہوا ہے اللہ ہی کا دیا ہے۔ اس پیدائشی احتیاج کو بقدر ضرورت رفع کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مناسب اسباب بھی پیدا کئے ہوئے ہیں۔ یہ جمع ہوں تو احتیاج رفع ہو جاتی ہے اس لئے وہ اسباب جو احتیاج رفع کرتے ہیں "غنا" سے موسوم ہیں۔ بیدل استدلال یہ کرتا ہے کہ اگر ہستی کا مدعا محض فقر ہی ہوتا تو "جلوہ بیرون عدم تا زد چرا" تو عدم سے ہستی کا ظہور ہی کیوں ہوتا۔ اور یہ اسباب غنا جو رفع احتیاج ہیں پیدا ہی کیوں ہوتے آخر ان کی کچھ غرض اور مقصد بھی ہونا چاہئے ورنہ یہ کائنات ہی باطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ قدرت الٰہیہ کا ظہور انہی اسباب سے ہوا ہے۔ دریا میں پانی تو ہے لیکن شوخی طوفاں بھی اسی میں پیدا ہوتی ہے۔ اگر یہ ساکن ہی رہے تو شوخی طلاطم کیوں ہو، بیدل نے اسی ضمن میں ایک اہم مسئلہ کو حل کیا ہے جو ہمیشہ بحث کا موضوع رہا، یعنی:

ذات موہوم است بے ساز صفات پس غناہا وصف باشند فقر ذات

یہ متکلمین اور تصوّف کا دقیق مسئلہ ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ذات صفات سے منزہ ہے۔ لیکن جہاں تک ہمارے فہم کی رسائی ہے ہستی مطلق یا ذات باری تعالےٰ موہوم ہوتی اگر صفات نہ ہوتی۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ فقر ذات کا وصف غنا ہے، اسی وصف اسی صفات سے ہم نے اتنا سمجھ لیا کہ "ہست" وہ واجب الوجود ہے۔ اب زیر بحث فقر و غنا کے ضمن میں ذات و صفات ہیں۔ ذات بے صفات عریاں ہے

صفات بے ذات وہی جسم اور لباس کی مثال ہے۔ غلط فہمی نہ پیدا کرنی چاہئے۔ یہ مثالیں فہم تفہیم کے لئے ہیں۔

او برون از وہم و قال و قیل من
خاک بر فرق من و تمثیل من (عارف رومیؒ)

ذات کو بھی رنگ صنعت کے ظہور کے لئے عرصہ درکار ہے لیکن یہ سامان صفات بجلی کی سرعت کی طرح معدوم ہو جاتا ہے۔ مٹی ایک عمر میں خون جگر پی کر شاخ و برگ کے رنگ میں ظاہر ہوتی ہے لیکن شاخ ٹوٹ جاتی ہے اور پتے جھڑ جاتے ہیں تو مٹی میں مٹی ہوتے دیر نہیں لگتی۔ دھاگہ اور موم جمع ہوں تو ایک شعلہ شمع کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ دھاگہ اور موم کو بننے میں کافی عرصہ چاہئے لیکن ایک پھونک شمع گل کرنے کے لئے کافی ہے، یہ تمام اسباب غنا جو تو اپنے آگے پیچھے دیکھ رہا ہے اگر تو ان سے تغافل برتے تو فقر ہی فقر ہے۔ اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ یہ ربط جو اسباب غنا میں ہے تو اسے توڑ پھوڑ کر نہ رکھ، لیکن یہ بھی تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ ان اسباب کی فراہمی کے لئے کچھ تردد کچھ جدوجہد بھی کرنی پڑتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ "آزار" ہے۔

"مدعا از ہستیٔ ما بس ہمیں آزار بود
ورنہ در کنج عدم آسودگی بسیار بود"

یہ شعر اسی بیت کے ہم معنی ہے کہ :

"گر ز ہستی فقر باشد مدعا جلوہ بیرون عدم تازد چرا"

لیکن ہر ایک کوشش کی ایک حد ہے۔ اسباب غنا سے بقدر ضرورت ہی لینا چاہیئے۔ اور اس کو مقصد بالذات نہ سمجھنا چاہیئے۔ نفس انسانی "کثرت" پسند ہے، اور فراہمی کثرت کے لئے انتہائی جدوجہد کرتا ہے۔ کثرت مال، کثرت اولاد، غرض کثرت کی طلب جو ضرورت سے زیادہ ہے مذموم طمع ہے۔

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب معاش
آنچہ ما درکار داریم اکثری درکار نیست

یہ شعراس بیت کی شرح ہے کہ:

"در معیشت مایۂ عیش تو بس
آنقدر جہد یکہ نتواں زد نفس"

اتنی دوڑ دھوپ کہ سانس پھول جائے اور آخر ٹوٹ کر رہ جائے۔ اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اور حد اعتدال سے تجاوز کرنا ہے، یہ اخلاقاً مذموم ہے۔

بیدل لکھتا ہے کہ جب یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی کہ

"کو غنا کو فقر امی غافل توئی
صفت یکتائی ست اظہار دوئی"

تو مجھے اطمینان ہو گیا اور میں نے ہوس سے کنارہ کیا۔

در مخموری و مستی نزدم | بیرون عدم ساغر ہستی نزدم
تا چوں گرہ شش جہت مساوی نمود | خورشید صفت بہ پستی نزدم

میں نے مخموری اور مستی کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا، عدم سے باہر میں ساغر ہستی سے سرشار نہیں ہوا۔ یعنی اتنا بدمست نہیں ہوا کہ اپنی اصل حقیقت کو بھول جاتا۔ جب تک گرہ کی طرح شش جہت میں توازن مساوی نہ ہوا سورج کی طرح پستی کی طرف توجہ نہ کی۔ یہ تو لفظی ترجمہ ہے، مفہوم یہ ہے کہ "تعدیل بہر امر کمال عرفاست"۔ سورج شش جہت مساوی روشن کرتا ہے، سورج تو بلند مقام پر ہے اور اپنی بلندیٔ مرتبہ سے نیچے نہیں آتا اس لئے کہ شش جہت کو مساوی درجہ پر رکھتا ہے، اگر یہ میزان عدل کائنات میں نہ ہوتی تو نظام عالم درہم برہم ہو جاتا۔ اسی طرح ہمارے نظام معاشرت میں اگر تقسیم معیشت مساوی نہ ہو تو توازن قائم نہ رہے گا اور فتنہ و فساد شش جہت میں رونما ہو گا اور ہوتا ہے۔

ایک دن میں گھوڑے پر سوار دہلی کے بازار سے گزر رہا تھا، دور سے دیکھا کہ کچھ آدمی جمع ہیں اور سب میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ گھوڑے کو ایڑی دی کہ نزدیک ہو کر دیکھوں کہ معاملہ کیا ہے۔ اور کیوں میں ہی ان کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا ہوں۔

جب نزدیک آیا۔ ایک شخص کو کہتے سنا کہ یارو دیکھو دیوانہ اس سوار کے پیچھے دوڑتا رقص کرتا آرہا ہے۔ میں نے پیچھے پھر کر دیکھا تو شاہ کابلی تھے، ایک عالم بیخودی میں میں گھوڑے سے نیچے اُترا، اور شاہ صاحب کی طرف سایہ کی طرح جھکا، کمال شفقت سے مجھے گلے لگایا۔

شوق جوشے زد کہ می پنداشتم میخانہ ام
تادوچار ناز گرداں نرگس مستانہ ام
ای رفیقاں نوبہار آمد کنوں دیوانہ ام
یار شد بے پردہ دیگر تاب خود داری کراست

قریب ہی ایک دوکان خالی تھی اس کے گوشہ میں ہم دونوں بیٹھ گئے۔ جو کچھ گفتگو اس وقت دونوں میں ہوئی اس کا آغاز تو بیدؔل نے اپنی موجودہ حالت خانہ داری سے کیا کہ "تخم تجرد بریشۂ تاہل تنیدہ است و بہار آزادی بشاخ و برگ تعلق گردیدہ، اما نسیم گلشن بایں روایح مخبراست، کہ نہال یکتائیم، با بیاری نیرنگ علائق ثمری کہ عبارت از نتائج باشد، نخواہد بست تاآں قدر بار خاطر تواند گردید، حدیقہ بے تقسیم باغبانی اوہام، اسباب شگوفہ دورنگی نخواہد آورد، تااین ہمہ تشویش دلبستگی تواں کشید" یعنی بظاہر اب تو میں امور خانہ داری کے جھمیلے میں اُلجھا ہوا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اتنا نہیں کہ مجھے اتنا بھی شعور نہ رہے کہ یہ برگ وبار علائق دنیوی میرے نہال یکتائی کو مجھ سے پوشیدہ کردیں، فرمایا کہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے سمجھا ہے، ہم "لم یکن لہ کفواً احد،" کے افراد ہیں،

تانشۂ مختیم در بزم تفرید
فارغ زخیال صاف ودرد تقید
بوئے زبہار رنگ رویم بس است
زیں پیش نمیتواں باعیاں جوشید

اسی موضوع گفتگو سے شاہ صاحب نے تصوّف کے اہم نکات بیان فرمائے۔

ما روح مجسیم وغیب مشہود
یعنی عدمیم سحر پرداز نمود
چوں آب وہوا عالمے زندہ بما
چوں حرج وبخار خلقے از ماموجود

یہ تو ایک طویل اور دقیق بحث ہے، سردست ہم بیدؔل کے سوانح حیات

لکھ رہے ہیں آخر گفتگو میں شاہ صاحب نے فرمایا کہ "جسے ہم عالم کہتے ہیں وہ صفحۂ دل کا مطالعہ ہی ہے اور جنھیں ہم اشیاء سمجھتے ہیں وہ سطر نگاہ ہے جو تحریر ہو رہی ہے، دل اجتماع کیفیت علوم ہے، اور علوم ادراکات معانی نامفہوم، اپنی طرف سے وسوسہ پیدا کرنا بھی ایک صفت ہے اور اوہام کو نشو و نما دینا بھی قدرت ہے، وادیِ ظہور میں تلاش کسب غیریت ہے نہ اظہار غیبت، جہاں تک ہو سکے" در لباس کوش و تا ممکن است در خود بپوش"۔

باشوخی لباس ہماں سر بجیب باش — درعالم شہود ز مردان غیب باش
ناز حقیقتے ست نیاز مجاز ما — یک چند شوق مو منی و در دشعیب باش
ہنگامہ خیال دوئی گرم کردہ ایم — مائیم و عرض آئینہ گو جلوہ غیب باش

صفت بے ذات خود نما ہو تو معدوم ہے۔ اور ذات بے صفت موہوم، کسی شے کی نمود متصور نہیں ہو سکتی، جہاں کہیں ہم صفات سے موسوم نہیں ذات ہیں، اور جہاں اسما سے مشخص ہیں صفات ہیں۔

شاہ صاحب کی باتیں میں ہمہ تن گوش ہو کر سن رہا تھا، مجھ پر ایک بیخودی سی طاری تھی، جب ہوش میں آیا شاہ صاحب کو موجود نہ پایا۔

دلدار رفت و بیخودیم در کنار ماند — تمثال جست و آئینہ حیرت شکار ماند
مژگاں نبرد صوفۂ آغوشۂ از وصال — آخر نصیب دیدۂ ہماں انتظار ماند

اس واقعہ کو بیس سال کا عرصہ گذر چکا ہے میں ابھی تک اسی ساغر کے خیال میں مست ہوں۔

"چہار عنصر میں بیدل نے جو بھی واقعات لکھے ہیں ان کو "خرقِ عادت" ہی کہنا چاہیئے، لیکن بیدل ہر ایک واقعہ پر حکیمانہ بحث بھی کرتا ہے، بہرست ہم واقعات معرا بیان کرتے ہیں اور مختصر بحث بھی بیدل کے ہی لفظوں میں لکھتے ہیں۔

بیدل پر ایک وقت ایسا بھی گذرا ہے کہ نان شبینہ تک محتاج تھا۔ یہ

واقعہ اکبر آباد میں رونما ہوا۔ خود لکھتا ہے کہ اس مقام میں جو کچھ اسباب معاش تھا ختم ہو گیا۔ اور فاقہ کشی کی نوبت پہنچ گئی۔ جب بھوک نے سخت تنگ کیا نہ معلوم کیا جی میں آیا کہ بازار میں نکل آیا۔ "شرم افلاس از ہر جنس چشم می پوشید و خجلت بیدرمی از ہر متاع داغے می خرید" بازار میں ہر ایک قسم کی چیزیں اکل و شرب کی موجود ہوتی ہیں۔ لیکن افلاس کا بُرا ہو مارے شرم کے ان کو آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھ سکا۔ جیب میں پیسہ ہو تو کسی شے کی خریداری کا حوصلہ ہو۔ خجلت بیدرمی کی وجہ سے ہر ایک چیز سے داغِ حسرت ہی خرید کر سکتا تھا۔ میری وضع ایسی نہ تھی کہ کوئی محتاج تصوّر کر کے کچھ دیتا۔ اور نہ میری غیرت گوارا کرتی تھی کہ آشنا و بیگانہ میری موجودہ حالت سے واقف ہو۔ منعم حقیقی نے استغنا میرے مزاج میں اس حد تک پیدا کر رکھا تھا کہ میں کسی حالت میں اپنے آپ کو اس کے غیر کا محتاج نہیں سمجھتا تھا۔

جز حق سوئے ہر کہ حاجت بست احرام　　پیش آیدت ایں چار غم یاس انجام
ننگ کم ہمتی، و تشویش سوال　　رسوائی احتیاج، و نومیدی کام

میں بازار سے گزر کر دریا کی طرف گیا۔ دو گھونٹ پانی پیا کہ شاید حرارت سے معدہ کو کچھ تسکین ہو۔ مگر اس نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ غرض اسی حالت میں پھر لوٹا جب میں "مدار دروازہ" کے قریب آیا، سر چکرایا، گرنے کو تھا، کہ پیشاب کے بہانہ ایک دیوار کے پاس بیٹھ گیا۔ استنجا کے قصد سے دیوار کو ناخنوں سے کریدنے لگا۔ میرے ہاتھ میں ایک سنگ ریزہ آیا۔ دیکھا تو دَورِ اکبری کا ایک سکّہ تھا جو وزن میں عہد عالمگیری کے پانچ سکوں کے برابر تھے۔ سبحان اللہ کس وقت سے بیدؔل کے احتیاج کا انتظار کر رہا تھا۔ عالم غیب سے جو کچھ عطا ہوا اس نے سر دست میرا اضطرار تشویش رفع کر دیا۔ اور ایک مدّت تک میری قناعت کا دستگاہ سرمایہ رہا۔

صد شکر کہ احتیاج کوشش تعلیم　　آگاہم کرد آخر از فضلِ کریم

ہر چند بدیوار رجوع آوردم — دستم نرسید جز بداماں کریم

اللہ تعالیٰ کے احسان و انعام و کرم و عنایت کا شمار و بیان کرنا ایسا ہی ہے جیسے شعاعِ آفتاب کی ترجمانی ایک ذرّہ کرے۔

جس سال شاہ جہان کی بیماری کی خبر سلطنت کے طول و عرض میں مشتہر ہوئی بیدل مرزا عبداللطیف کے ہمراہ تھا جو مرزا قلندر عم بیدل کے رشتہ داروں میں سے تھا۔ مرزا عبداللطیف شاہ شجاع کی فوج کا سر لشکر ہی تھا۔ شاہ شجاع نے "بیماری پدر سکتہ مضمون سلطنت اندیشید" اور وہ جنون سر پر سوار ہوا کہ پایہ تخت دہلی کی طرف فوج کشی کی، بنگالہ سے سرحد ممالک بہار تک سپاہ پھیلا دی، تمام راجے اور جاگیردار فرمانبردار ہی نظر آئے۔ اور سپاہ کا دل بھی بڑھا ہوا تھا۔ اتنے میں پرچہ لگا کہ اورنگ زیب عالمگیر نے دہلی کی فرمانروائی کے لئے پیش قدمی کرتے ہوئے پیش دستی کی "حقوق خدمت پدرش پیش از دیگران بجا آوردہ" سواد الہ آباد میں اس کے موکب اقبال نے "ادبار بر شوکت شجاع ریخت" ہزاروں میدان جنگ میں کھیت رہے۔ شاہ شجاع تو ورطۂ ہلاکت سے نکل کر جان بچا کر بھاگا۔ مگر عالمگیری لشکر تعاقب میں تھا۔ ہرچند مرزا عبداللطیف نے کوشش کی کہ کہیں پرجم کر مقابلہ کیا جائے مگر بے سر فوج کے پاؤں اکھڑ چکے تھے۔ اس لئے خیریت اسی میں دیکھی کہ کسی طرف کنارہ کر جائے۔ ایک جماعت کے ساتھ دس روز مارے مارے پھرتے رہے۔ آخر امن آباد پٹنہ میں پہنچے۔ ایک روز بمقام "چاند پور" خیمے ایستادہ تھے اور ہمراہی اِدھر اُدھر نظر دوڑا رہے تھے، ابھی آفتاب غروب نہ ہوا تھا۔ دور سے ایک تل سفید نظر پڑا۔ لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا ہے۔ ہماری جماعت میں سے سرمست خاں اور مبارز خاں اور میں تینوں سوار ہو کر تفتیش حالات کے لئے ادھر گئے۔ ایک احاطہ باغ دیکھا۔ اس کے چاروں طرف طواف کیا، دروازہ میں داخل ہوئے، اس میں

دو بنگلے تھے اور درمیان ایک تالاب تھا۔ ہم نے اور گھوڑوں نے پانی پیا، اب خیال آیا کہ واپس لوٹیں، ادھر اُدھر جا سو سانہ نظر کی تو دیکھا کہ تالاب کے دوسرے کنارہ سے دھواں اُٹھ رہا ہے، سمجھ میں نہ آیا کہ یہاں تو کسی متنفّس کا نشان نہیں یہ دھواں کس آتش کدہ سے اُٹھ رہا ہے۔ چونکہ ایسے مقام میں خوف بھی تھا اس لئے تلواریں نیام سے نکال لیں آگے بڑھ کر دیکھا کہ ایک حجرہ زمین دوز ہے، اتنے میں ایک پری زاد پر نظر پڑی، کہ فرش پر بیٹھی ہوئی ہے، اپنے چہرہ آتشیں کے سامنے آگ جلا رکھی ہے، اور حقہ پی رہی ہے، چہرہ سے کچھ وحشت ٹپک رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے خرمنِ حُسن پر کسی کے عشق کی بجلی گری تھی، لباس سے عطر کی خوشبو نے فضا معطر کر رکھی تھی۔ القصہ حُسن تھا جو لباسِ عشق میں محجوب تھا۔ میں نے ذرا جرأت پرسشِ احوال کی، بے دماغانہ دیکھا، گویا بجلی کوند گئی، اس کی گردشِ چشم سے لڑکھڑا کر گرا۔ آخر ایک اضطراب کی حالت میں کھڑا دیکھتا رہا، ناگاہ اس نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور دل سے ایک آہ کھینچی اور یہ بیت پڑھی:

سالہا در طلب روئے نکو در بدر ایم
روئے بنما و خلاصم کن ازیں در بدری

تھوڑی دیر کے بعد حقہ ہاتھ میں لئے حجرہ سے باہر آئی اور بنگلہ کی طرف خراماں خراماں گئی، میں بھی پیچھے ہو لیا۔ صدر بنگلہ پر بیٹھ گئی۔ میں بھی مثال آئینہ مقابل بیٹھ گیا۔ اس کی زبان پر اگر کوئی حرف آتا تھا تو وہی بیت تکرار ہو رہی تھی، ناگاہ پھر گردشِ چشم میری طرف ہوئی۔ نگاہیں خنجر تھیں کہ میں تاب نہ لا سکا۔ جب ذرا ہوش درست ہوئے تو ان دونوں جوانمرد ہمراہیوں کو قریب بیٹھا دیکھا مگر وہ مجسمۂ حُسن غائب تھا۔ مجھ پر پھر بے ہوشی طاری ہوئی۔ جب میرے حواس کچھ بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ مرزا عبداللطیف بہت پریشان ہو رہا تھا کہ اتنی دیر ہوئی تینوں میں سے کوئی واپس نہ لوٹا۔ آدمی تلاش میں بھیجے۔ حالانکہ

فاصلہ ایک کوس کا تھا مگر وہ اِدھر اُدھر خاک چھانتے رہے۔ آخر اس مقام پر پہنچے جہاں میں پڑا ہوا تھا۔ مجھے اٹھا کر لائے۔ میری زبان سے وہی شعر بار بار جاری تھا۔ مرزا نے علاج کیا، آخر خدا خدا کر کے حواس بجا ہوئے۔ میرے ہمراہیوں کا خیال تھا کہ یہ مقام آسیب زدہ تھا۔ مگر اُنھوں نے کچھ نہ دیکھا۔ ایسے مشاہدات کا انکار تو نہیں ہو سکتا، کئی ثقہ لوگ اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

بعض مقامات پر جہاں کبھی جنگ ہوئی شور و غل کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح "گراموفون" میں آواز کا نقش ثبت ہو جاتا ہے اسی طرح بعض واقعات کے نقوش بھی قائم رہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ سائنس اور بالخصوص علم النفس کی ترقی کے بعد ان واقعات کی علمی توجیہ بھی تسلّی بخش کسی وقت ہو جائے۔ سردست ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں۔

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست
سخن شناس نۂ دلبرا خطا ایں جاست

لیکن وہ واقعات جو بیدل بیان کرتا ہے ان کے مشاہدہ کرنے والا ہر ایک دیدۂ دل نہیں ہوتا، عارف رومی کہتا ہے:

نطق آب و نطق باد و نطق گل ہست محسوس حواس اہلِ دل

بیدل کا ارشاد بھی بالکل صحیح ہے کہ "ہر نقشے کہ می بینی حرفیست کہ می شنوی" اشیاء کے خواص ہمیں کیسے معلوم ہوتے اگر وہ خود ہی نہ بتاتیں، اس تماشا گاہ عالم میں یہی چلتی پھرتی مُنہ بولتی تصویریں نقوش حیرت ہیں جو آئینہ دل پر چھوڑ جاتی ہیں۔

۱۰۷۰ھ کا واقعہ ہے کہ مرزا قلندر بنگالہ میں سفر کر رہا تھا، اسباب علائق قصبہ "مہسی" میں چھوڑ آیا تھا، یہ قصبہ آن روئے دریائے گنگ "پٹنہ" سے بیس

کوس کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ وہ ایام ہیں جب شاہ شجاع آوارہ دشت ادبار ہو رہا تھا اور بادشاہ عالمگیر کا اقتدار ممالک ہند پر چھا رہا تھا، بدنظمی اور بدامنی کا دور دورہ تھا۔ ان دنوں جبکہ یہ حالات تھے سفر کرنا جان کو خطرہ میں ڈالنا تھا بالخصوص دیہات سے گزرنا سخت مشکل کا سامنا تھا۔ مرزا قلندر نے مجھے قصبۂ "مہسی" سے اسباب لانے کے لئے بھیجا، ایک خادم ساتھ کر دیا۔ میں پیدل سفر کرنے کا عادی نہ تھا۔ پہلے ہی دن دریا کے اس طرف تین کوس چلا تھا کہ پاؤں میں چھالے پڑ گئے اور تکان اس شدت سے محسوس کی کہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ ہر چند نوکر نے راستہ کے خطرہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے حوصلہ افزا باتیں کیں، پاؤں دابے، آخر اُٹھنا ہی پڑا۔ دوپہر کے بعد رات کا کچھ حصہ سر میں کٹا اور صرف دو کوس کا فاصلہ طے ہوا۔ "جمناپور" پہنچے، دن بھر کی کوفت کی وجہ سے آتے ہی سو گیا۔ صبح اُٹھا تو کوئی اثر کوفت کا باقی نہ تھا، مگر مناسب یہی خیال کیا کہ کوئی کرایہ کا ٹٹو مل جائے تو سفر بسہولت طے ہو جس سے دریافت کیا اس نے کانوں پر ہاتھ دھرے کہ موجودہ حالات میں کون خطرہ مول لے۔ ناچار پھر پا پیادہ چل پڑا۔ تین کوس چلا تھا کہ گرمی کی شدت نے آگے قدم بڑھانے کی اجازت نہ دی۔ آفتاب سر پر غضب آلود شعاعیں برسا رہا تھا، دور سے ایک درخت نظر پڑا یہاں پہنچ کر اس کے سایہ میں دم لیا۔ آفتاب حدِ زوال سے گزر گیا۔ اور ہوا میں گرمی بھی اعتدال پر آ رہی تھی ہمت کر کے پھر اُٹھا تو سہی مگر وہی پہلے دن کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہیں بیٹھ گیا۔ خادم بیچارہ بھی بحکم تسلیم خاموش رہا۔ اب ہم دونوں شام کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ ابھی ایک پہر دن باقی تھا کہ میں نے دیکھا، کہ ایک نحیف منحنی بوڑھا ایک گھوڑی بچہ دار پر سوار ہماری طرف آ رہا ہے۔ ایک لڑکا لکڑی ہاتھ میں لئے ہم رکاب ہے۔ نزدیک آیا تو نہایت تپاک سے ملا۔ اور کہا کہ ان وقتوں میں پیادہ پا سفر کرنا آپ جیسوں کا کام نہیں۔

میں نے دل ہی دل میں کہا کہ اس بے تکلفی اور گرم جوشی سے ملنا کسی ناواقف سے بعید ہے۔ حافظہ پر بہت زور دیا مگر دیدہ تصوّر میں کوئی ایسی شناسا صورت سامنے نہ آئی۔ مسکراتے ہوئے کہا کہ شاید آپ نے مجھے نہیں پہچانا، میں جان محمد ہوں۔ قصبہ مہسی میں خواجہ شاہ محمد کا ملازم ہوں جس کا مکان مرزا قلندر کی ہمسائیگی میں دیوار بدیوار ہے۔ خواجہ صاحب نے مجھے حکم دیا تھا کہ دریائے گنگ سے آپ کو قصبہ میں لاؤں، مگر آپ نہ ملے، میں لوٹ آیا، اچھا ہوا کہ آپ یہاں مل گئے۔ یہ گھوڑی حاضر ہے۔ آپ سوار ہوں میں ہمرکاب چلوں گا۔ میں نے انصاف سے بعید خیال کیا کہ میں باوجود جوانی سوار اور یہ ضعیف بوڑھا پیدل چلے۔ اور تو کچھ عذر نہ تھا، میں نے کہا کہ اس درخت کے سایہ میں کچھ دیر آرام بھی غنیمت ہے۔ آپ سوار ہو کر آگے چلیں، میں بھی آپ کے نقش قدم پر آپ سے آملوں گا۔ اور استنجا کے بہانہ سے اُٹھ کر ایک طرف چلا گیا جب واپس آیا تو لڑکا گھوڑی کی لگام تھامے اسی جگہ کھڑا تھا مگر وہ پیر بادیا وہاں سے چلا گیا تھا۔ ناچار میں سوار ہوا۔ نماز شام کا وقت تھا کہ تین کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم سرا میں جو راستہ میں پڑتی تھی پہنچے۔ وہ بوڑھا پہلے ہی یہاں موجود تھا۔ میں نے بہت معذرت کی اور اس کے احسان کا شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگا کہ نوکروں کا کیا احسان اگر میں آپ کو مذبذب نہ پاتا، تو ہمرکاب ہی چلتا۔ بہرحال رات یہاں ہی ٹھہریے۔ آرام و آسائش کا ہر ممکن سامان موجود ہے۔ اتنا کہہ کر وہ تو چلا گیا دسترخوان پر کھانا چنا گیا تو میں نے کہا کہ بھئی ہمارے پیر طریقت کو بھی تو بلواؤ، تلاش کے بعد بھی نہ ملا۔ رات آرام سے میٹھی نیند سویا۔ صبح اُٹھا تو وہی لڑکا گھوڑی لئے سرا پر حاضر تھا۔ کہنے لگا کہ نزدیک ہی قصبہ ہے۔ اور یہ سرا اسی کے مضافات میں واقع ہے، میں اور بوڑھے میاں رات وہاں رہے۔ مجھے یہاں آپ کی خدمت میں بھیجا اور آپ علی الصباح ہی قصبہ مہسی کی طرف روانہ ہو گیا۔ آپ جس وقت

چاہیں سوار ہوں میں حاضر ہوں، لیکن وہ آپ کو راستہ میں نہ ملے گا۔ میں سوار ہو کر چل پڑا۔ نو کوس کا سفر تھا، عصر کے وقت مہسی میں خواجہ شاہ محمد کے مکان پر پہنچا تو پیر مرد وہاں دروازہ پر منتظر پایا۔ گھوڑی تو لڑکے کے حوالہ کی اور بار بار شکریہ ادا کرتا رہا وہ انکسار اور ندامت سے جواب دیتا رہا۔ آخر رخصت چاہی، میں اپنے گھر پر آیا۔ دوسرے روز خواجہ صاحب کے بیٹوں کو اطلاع ہوئی تو برسم قدیم ملاقات کے لئے آئے۔ میں نے بوڑھے کا ذکر چھیڑ دیا کہ بہت با اخلاق آدمی ہے۔ وہ حیران ہوئے اور کہا کہ اس نام اور حلیہ کا آدمی تو آج تک ہم نے دیکھا تک نہیں، اب میری حیرت کی بھی کوئی انتہا نہ رہی۔

"تصور جوہر آگاہی قدرت کجا دارد
بہار فضل آنسوی تعقل رنگ ہا دارد"

قدرت کے کرشموں کی نیرنگیاں ایسی نہیں کہ ہم عقلاً ان کی کُنہ تک پہنچیں، ماننا پڑتا ہے کہ عقل سے پرے بہار فضل خدا کی رنگینیاں بھی ہیں۔

"نہال آید بروں تخمے کہ بنشانند درخاکش
درین وادی زپا افتادن، ایجاد عصا دارد"

ایک بیج سے درخت نشو ونما پاتا ہے جسے قضا و قدر مٹی میں گاڑ دیتی ہے، اس وادی امکان میں جو پاؤں سے نہیں چل سکتے ان کو بھی سہارے کے لئے عصا مل جاتا ہے۔

"ندیدا از آبلہ ریگ رواں منع جنوں تازے
بہ نومیدی زپا منشیں کہ ہر واماندہ پا دارد"

پاؤں میں خواہ چھالے پڑ گئے ہوں۔ ریگ رواں کسی جنوں تاز کی مانع رفتار نہیں، تو مایوس ہو کر پاؤں توڑ کر نہ بیٹھ رہ، ہر ماندہ و درماندہ کو بھی چلنے کے لئے پاؤں خدا کے فضل و کرم سے مل ہی جاتے ہیں۔

"بگرد دں میبرد نظارہ را وا ماندن مژگاں
مشو غافل ز پروازے کہ بال نارسا دارد"

آنکھیں کھلی ہوں تو ایک نگاہ بے دست و پا نظارہ کو آسمان تک پہنچا دیتی ہے۔

یہ سمک سماک کا فاصلہ تیری اک نگاہ نے طے کیا
جسے تو سمجھتا ہے دور تر، ہے قریب راہِ دراز میں (مؤلف)

اگرچہ نگاہ میں بال و پر نہیں لیکن اس کی پرواز دیکھ کہ باوجود بے سرو سامانی کتنی رسا ہے۔

"اثر ہائی غنا روشن نشد بی احتیاج ایں جا
ز اسرار کرم گر آگہی دارد گدا دارد"

طلب ہو تو مطلوب ملتا ہے۔ درد ہو تو دوا بھی ہے اور اس کا اثر بھی ہے "ای خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست" اسی طرح جہاں احتیاج ہو وہاں غنا کا بھی ظہور ہوتا ہے، بخشش کے راز سے اگر کوئی واقف ہے تو گدا ہی ہے۔

"بجناب کرم افسوں ورع پیش میر
بے گناہی گنہے نیست کہ آنجا بخشند" (بیدل)

صاحب مغفرت کے حضور تقویٰ کا جادو نہیں چلتا۔ بے گناہی گناہ تو نہیں کہ وہاں بخشا جائے، پہلے گنہ گار بنو پھر مغفرت طلب کرو۔

مری غرض گنہ سے نہیں لذّتِ گناہ
بندہ تیرے فضل سے رحمت پرست ہے (مؤلف)

"سراپا محو شو تا جملہ آگاہی شوی بیدل
بقدر گم شدنہا ہر کس این جا رہنما دارد"

اے بیدل جتنا اپنے آپ سے غافل ہوگا اتنا ہی آگاہ ہوگا۔ جتنا کوئی گمراہ ہوا اتنا ہی رہبرِ کامل کا طالب ہوتا ہے۔

شاہ عالمگیر تو دکن کی تسخیر میں مصروف تھا۔ ادھر دہلی اور اکبر آباد کے گرد و نواح میں ہڑبونگ مچی ہوئی تھی، حکام نے خود سری اختیار کر رکھی تھی۔ ہر ایک کے سر میں ہوائے حکومت و تسلّط سمائی ہوئی تھی۔ جوالی متھرا کے اکثر پرگنوں میں لوٹ کھسوٹ اور تعدی کا دَور دورہ تھا۔ شرفاء کا ننگ و ناموس لٹ رہا تھا، دادگری بغیر بیداد متصور نہ تھی، ہر روز دکن سے ایک نیا عالم آتا یہاں تک پہنچتے پہنچتے پرانا ہو جاتا۔ تجارت پیشہ کا کوئی قافلہ ان راستوں پر آتا تو لٹ جاتا، بیدل دو سال سے متھرا میں تھا۔ متمول آدمی تو اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہے اور تیر و تفنگ سے اپنی جان و مال کی حفاظت بھی کر رہے تھے، بیدل کے دل میں خیال آیا کہ یہاں سے چلنا چاہیئے، جس طرح ہو دہلی پہنچو، اس مخمصہ آفات سے تو نجات ہو۔

فرصتے داری، ز گرد اضطراب دل بر آ
ہمچو خوں، پیش از فشردن از رگ بسمل بر آ
خلقے آفت خرمن است ایں جا بقدر احتیاط
عافیت می خواہی از خود اندک ای غافل بر آ
از تکلّف در فشار قبر نتواں زیستن
چوں نفس دل ہم اگر تنگی کند از دل بر آ

اگر فرصت ہے تو دل سے اضطراب کی گرد جھاڑ کر نکل آ، پیشتر اس کے کہ لہو کی طرح بہے رگِ بسمل سے آپ ہی باہر آ جا یہ سمجھ لے کہ خلق کا خرمن آفت ہے۔ اس لئے اگر خیر چاہتا ہے تو احتیاط برتتے ہوئے اے بے خبر تھوڑا سا اپنے آپ سے باہر آ، فشار قبر میں بھی تکلّف کے ساتھ زندگی

دو بھر ہے جس سے دم گھٹتا ہے اگر دل بھی تنگی کرے تو دل کو بھی چھوڑ کر باہر آ۔

دوستوں سے جب میں نے ارادہ کا ذکر کیا تو ہنسنے لگے کہ آپ کو یہ کیا سوجھی، اگر آپ عزم مصمم اعتماد خوارق پر کئے ہوئے ہیں تو جب اس کی آزمائش ہوگی اور آپ صحیح وسلامت گھر پہنچ جائیں گے تو ہم بھی آپ کی کرامات پر ایمان لے آئیں گے۔ اور اگر اپنے زور بازو اور شجاعت پر بھروسہ ہے تو فتح کے وقوع کے بعد حق مبارک باد ادا کریں گے، ورنہ ظاہر حالات جو کچھ ہیں آپ بھی دیکھ رہے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیسے دہلی کہ ہنوز دور است پہنچ سکتے ہیں، کسی کی نہ سُنی ایک "بہلی" کرایہ کی۔

رنج و غم ایں مرحلہ پیوستہ نماند	محمل کشی آثار خیال ست گذشتن
چندانکہ دل خوں شدۂ خستہ نماند	موقت است ز صاحب اثرے جوہر قدرت
ای بے خبراں کار کسی بستہ نماند	بر ناخن امداد شکستن بگمارید

پہلے دن کا پڑاؤ "اعظم آباد" تھا، اس مقام پر قریب پچاس "بہلیاں" ایک ماہ سے بدرقہ کے انتظار میں پڑاؤ ڈالے کھڑی تھیں۔ یہاں نہ کوئی فوجی سوار نہ پیادہ نظر آیا کہ اس کی حفاظت میں آگے بڑھتے، دوسرے روز میں سفر پر آمادہ ہوگیا تو دوسروں کے دل میں بھی گدگدی ہوئی مگر وہاں کے لوگوں نے روکا اور کہا کہ آج کل بے بدرقہ سفر کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے مگر قافلہ چلنے کے لئے تیار ہو چکا تھا، اتنے میں ایک فقیر ہاتھ میں طوطے کا پنجرہ لئے آیا اور میرے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اور آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا کر صدا کی آفتاب عالم اقبال ہم سفر ہے، کسی قسم کا وہم خطرہ دل میں نہ لاؤ۔ غرض قافلہ روانہ ہوا۔ میرے ہمراہ دو خادم تھے۔ ایک بیمار اور دوسرا ضعیفی کی وجہ سے خدمت سے آزاد۔ راستہ میں اتفاقاً یہ پڑی کہ بہلی کے دونوں پہیے دُھرے سے نکل گئے۔ بیل

بھی زخمی ہوا۔ قافلہ والوں نے یہ بدفال سمجھی، غرض ہزار خرابی کے
بعد شیر گڑھ پہنچے۔ رات تو جوں توں کرکے یہاں بسر کی، ابھی پہر رات
باقی تھی بہلی بانوں نے کہا کہ قافلے والے اسباب باندھ رہے ہیں اگر وہ
آگے نکل گئے تو ہم بچھڑ جائیں گے۔ میں نے کہا کہ تمہیں کس نے روکا ہے
چلو، شیر گڑھ کی آبادی کے قریب ہی ایک قلعہ تھا۔ قصبہ کی وجہ تسمیہ
بھی یہی تھی۔ اور اس قلعہ سے ایک کوس کے فاصلہ پر اور گاؤں تھا۔
جہاں کے قزاق اکثر چھاپہ مارتے۔ اہل قلعہ قلعہ میں بیٹھے تیر و تفنگ بے اثر
کی ہائے ہوسے انھیں پراگندہ کرنے کی بے فائدہ کوشش بھی کرتے۔ ہمارے
بہلی بان مقراض واران قزاقوں سے جوڑ میل رکھتے تھے، ابھی رات باقی
تھی کہ ہم بہلی کے ساتھ ایک اور راستہ پر ہو لئے۔ عرصہ گزر گیا اور
میں حیران تھا کہ چاروں طرف قافلہ کی گرد تک دکھائی نہیں دیتی،
ممکن ہے کہ ہم کارواں سے پہلے ہی آگے دور نکل آئے، یہاں تک کہ ہم
گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔ دیکھا کہ سواروں کی ایک جماعت چپ و
راست گھوڑوں کو دوڑا رہی ہے۔ لیکن غبار میں انھوں نے ہمیں نہیں
دیکھا۔ میں نے بہلیانوں کی منت کی واپس لوٹو، مگر وہ تو ارادتاً اس جگہ
لائے تھے سنتا کون، اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک نیلے گھوڑے پر
مسلح سوار اسی جماعت سے باہر نکلا۔ تازیانہ ہاتھ میں تھا۔ گھوڑا دوڑاتا ہوا
ہماری بہلی کے قریب آیا۔ شکل و صورت سے مسلمان نظر آیا۔ آتے ہی
بہلی بانوں پر برس پڑا، او بدبختو تم اندھے ہو گئے تھے کہ محبوبانِ الٰہی سے
ایسی ناشائستہ حرکت کی، بہلی بان کانپ رہے تھے اور ہاتھ باندھ کر
عرض کی حضور خطا ہوئی معاف فرمائیں۔ بات یہ ہے کہ راستہ بھول گئے۔
خیال یہ تھا کہ یہاں کے رہنے والوں سے راستہ دریافت کرینگے ادھر
آنکلے، اب جس طرف ارشاد ہو ادھر چلیں۔ سوار نے تازیانہ سے

ایک طرف اشارہ کیا اور کہا کہ خبردار ذرا بھی اِدھر اُدھر نہ ہونا ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ پہلی باتوں نے وہی راستہ اختیار کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے اپنے آپ کو قافلہ کے درمیان دیکھا۔ اس کے بعد کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔

جن دنوں بیدل کا قیام متھرا میں تھا، قلعہ دار دوست تھا ایک دن اس نے باتوں باتوں میں کہا کہ قلعہ کیا ہے جنّات کا گڑھ ہے، تین سال سے میں یہاں ہوں مختلف مقامات سے پتھر برستے ہیں یا کسی گوشہ سے آگ بھڑکتی ہے۔ کئی افسوں طراز آئے مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ فوراً ایک شعر بیدل کے خیال میں آیا۔ "با عفاریت جہانے دیگر جائے کم نیست مکانے دیگر" ایک کاغذ پر لکھ کر قلعہ دار کو دیا کہ قلعہ میں ایک نیزہ پر آویزاں کرو۔ جب تک بیدل وہاں رہا یعنی تین سال کے عرصہ میں پھر یہ شکایت نہ ہوئی۔ بیدل اسے "اثر سخن" سے منسوب کرتا ہے۔

اے دماغ فطرتت سرگرم سودائے سخن
زیں بیاں دریاب اسرار اثرہائے سخن

نقطہ و خطے کہ از پرکار امکاں دیدہ
فہم کن قدرت نگار یہائی اجزائے سخن

دستگاہ رنگ و بوئی عالم غیب و شہود
نیست غیر از صورت پنہان و پیدائے سخن

جن و انس آئینۂ تاثیر این حکم اند و بس
آہ از اں طبعیکہ غافل شد ز ایمائے سخن

کیست زیں تمثال نیرنگی نباز د رنگ ہوش
میرود از خود سخن ہم در تماشائے سخن

از زمیں تا آسماں یک حلقۂ آغوش اوست
تنگ نتواں کرد از بیدانشی جائے سخن

تہمت مضموں دیگر بر طلسم خود مبند
جز سخن دیگر چہ داری ای معمائے سخن

بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ تمام کائنات تحریر سخن ہے۔ انسان خود ایک پہیلی ہے اور یہ سخن ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں، لیکن یہ نقطہ و خط اور حروف اور عبارت جو کتاب کائنات میں تصویری نقوش ہیں محض اتنی ہی بات نہیں، اصل شے تو معانی ہیں اور یہ حقیقت ہے، اور اسی کا اثر ہے جو تمام عالم میں جاری و ساری ہے۔ اس موضوع پر ہم پہلے بھی بیدل کے نغمون میں بحث

کر چکے ہیں، وہ بھی اسی حقیقت کے اثر پر زور دیتا ہے۔

نہ ہمیں صوت و صدا پردہ ساز سخن است
خامشی نیز اثر پرور راز سخن است
گوش گو تا بتامل نظرے باز کند،
کہ حقیقت زا سیراں مجاز سخن است

تصویر | چہار عنصر میں بیدؔل نے چند اور واقعات بھی نقل کئے ہیں۔ اور نظم و نثر میں دادِ سخن دی ہے، ان میں سے ایک واقعہ بیدؔل کی اپنی تصویر کے متعلق ہے۔ عقیدت مندوں میں ایک شخص "انوپ چتر" نامی نقاش تھا کہ "روح مانی بکسوت غبار رنگ گرد قلمش می گردید، و فطرت بہزاد در پردہ ناموس خاک انفعال تر دستیش می کشید"۔

خامہ او ہر کجا تصویر شمع می کشید — تا قیامت داشت از رنگش چراغ افروختن
ہئیت پروانۂ گر در نظر می بست نقش — نقش دود انگیخت تا محشر ز بالش سوختن
ریشۂ نخلے کہ از کلکش نم پرواز یافت — در بہارش شاخ خم می شد ز بار اندوختن
زیں ادا ہر جا نقاب رنگ صنعت می شگافت — محو بود اندیشہ چشم از تحیر دوختن

اس مصوّر کے ورق دل پر نقش عقیدت اتنا گہرا تھا کہ اکثر التجا کرتا کہ اجازت دیں کہ آپ کی تصویر کھینچوں تاکہ صفحہ روزگار پر یادگار رہے۔ "چوں فضولیہائی ایں جنس اشغال غیر از آئینہ لہو نمی زدود، طبیعت نیرنگی مسرت ساغر التفات کم می پیمود"۔ میں اس قسم کے شغل کو محض تفریح ہی خیال کرتا تھا اس لئے طبیعت ادھر نہ آئی۔ ایک روز بہت منت و سماجت سے کام لیا اور کہا کہ میں کسی اور خدمت کے لائق تو نہیں اگر اجازت ہو تو میری سعادت ہے۔

آئینہ چہ دارد ز سرو برگ قبول
جز آنکہ ترا جلوہ دہد در نظرت

میں نے بھی اس خیال سے کہ اس کی دل شکنی نہ ہو اجازت دے دی،
اس نے اس "عجز سرشت" کا نقش "صفحۂ اثر" پر باندھا، دیکھا تو میں
خود حیران رہ گیا کہ یہ میں ہوں یا میری تمثال۔

آشنا را داشت مستغنی ز وصل سیر او درا امتیاز فرع و اصل
بیدلم می گفت بے کام و زباں تا شود بیگانہ ہم محرم نشاں

اگرچہ تصویر نقل اور میں اصل تھا، مگر دونوں میں فرق نہ تھا، اگر کسی
دوست کے پاس ہوتی تو وہ یہ سمجھتا کہ بیدل میرا ہم نشین ہے، اور بیگانہ کو
بھی پوچھنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ تصویر خود بول رہی ہے کہ میں بیدل
ہوں۔ اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ منہ اور زبان کے بغیر ہی بولتی ہے،
اس تصویر کو کتاب میں تہ کر رکھا، دس سال تک اس نگارستان کا
تماشا دیکھتا رہا، ۱۱۰۰ھ میں "بہ مقتضائے عجز بشری" مجھ بے دست و پا
کے قویٰ پر عارضہ زور پکڑ گیا۔ یہاں تک کہ احباب زندگی سے مایوس
ہو گئے۔

پرواز بباد رفتہ و ریختہ بال بودم گرد ے فسردہ یاس مآل
چوں صبح نفس میزدم اما بخیال چوں عکس نمود داشتم لیک بوہم

ایک رفیق اسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا، ناگاہ اس تصویر پر
نظر پڑی، کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا کہ "آہ، اس تصویر کو نظر بد کھا
گئی۔ غالباً کسی لڑکے نے نم آلود ہاتھ اس پر پھیرا ہے، اس لئے اس کا رنگ
اڑ گیا" حاضرین نے بھی یکے بعد دیگرے تصویر دیکھی اور افسوس کرتے
رہے۔ ایک نے کہا کہ نمی کا نشان تو معلوم نہیں ہوتا، نم کا اثر صفحۂ کتاب
کے حروف پر بھی ہونا چاہئے تھا۔ میں نے حاضرین کی گفتگو سن کر کہا کہ
میں بھی دیکھوں کہ کیا بات ہے۔ تصویر دیکھی تو واقعہ میں ایک مدھم سا نقش
رہ گیا تھا۔ میری یہ حالت نہ تھی کہ افسوس میں رفقاء کا شریک ہوتا۔

تصویر ہاتھ سے گر پڑی، جب میں رُو بصحت ہُوا اور رفتہ رفتہ جسم ناتواں میں پھر سے قوت و توانائی محسوس کی اور اپنے آپ کو تندرست پایا تو ایک دن اسی تصویر کا خیال آیا کہ بیچارہ نے کس ذوق و شوق سے کھینچی۔ تصویر اسی کتاب میں نقش معنی فراموشی اور اسی محفل حروف میں دود مشعل خاموشی تھی۔ کتاب کھول کر دیکھی تو حیران رہ گیا۔ وہی شوخی رنگ نمایاں تھا گویا ابھی ابھی کھنچی ہے۔ گویا بیدل بے زبان گرم گفتگو شعلہ نوائی متکلم ہو رہا ہے، اور بہار گذشتہ پھر سے اسی رنگینی کے ساتھ جلوہ نما ہے، رفقاء نے بھی دیکھی اور سب تصویر حیرت بن کر رہ گئے۔ سب کا رنگ ہوش اُڑ گیا کہ یہ کیا بلا ہے۔ مجھے اب سوچنے کی فرصت نہ تھی، جنون بے اختیاری اجزای صفحہ را بچاک گریباں رسانید، و اضطراب بے حوصلگی ہمچناں بخاک مدفون گردانید"۔ یعنی پھاڑ ڈالی۔

بیدل تا سیر رنگ و بو ہا کردیم — صد عقدہ زنیرنگ جہاں وا کردیم
اما تو چہ عالمی کہ حشر تصویر — در پردۂ نقش تو تماشا کردیم

اس واقعہ کے ضمن میں بیدل لکھتا ہے کہ اس قسم کے واقعات جہاں بیچونی کی قدرت کے عجائبات سے ہیں کہ فہم انسانی خواہ کتنی ذہنی کاوش سے کام لے یہ گتھی سلجھنے میں نہیں آتی۔ کہنا پڑتا ہے کہ یہ اسرار عالم غیب ہیں۔ اگر فطرت بشری میں یہ جوہر ہوتا کہ اس قسم کے اسرار کی حقیقت اس پر منکشف ہوتی تو عاجز نہ ہوتی، اس طرح ہر ایک صاحب عقل اس کی کُنہ کو پہنچ جاتا۔ اگر زمین کو پر لگ جاتے، تو آسمان کو بغل میں دبا لیتی، اور اس طرح ننگ پستی و پامالی سے ذلیل و عاجز نہ ہوتی، اور اگر ذرہ کے ہاتھ میں کچھ اختیار ہوتا تو آفتاب بن جاتا اور اسے حرارت اخذ کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ پس آدمی جمیع امور میں مجبور ہے اور تمام افعال و اعمال میں معذور۔

ای آنکہ ہیچ عالمے بار تو نیست — جز تہمت وہم گرد آثار تو نیست
برخیز بکار خویش مژگاں وا کن — ہر چند کشاد مژہ ہم کار تو نیست

مرقد | بیدل کی ولادت ۱۰۵۴ھ میں ہوئی، تاریخ "خود ہی انتخاب" سے نکالی،
پیدا عظیم آباد پٹنہ میں ہوئے اور فوت دہلی میں جہاں مستقل رہائش رکھی تھی، وفات
۱۱۳۳ھ میں واقع ہوئی۔ بیدل محض شاعر نہ تھا، سنائی اور عطار اور رومی اور
سعدی وغیرہم کی طرح صاحب حال بھی تھا۔ معاصرین اولیاء اللہ میں شمار کرتے،
چنانچہ ایک رباعی میں اشارہ کرتا ہے کہ:

بیدل بدو روزہ عمر مغرور مشو — بنیاد تو نیستی ست معمور مشو
ہر چند ابدال و قطب و غوثت خوانند — ای خاک پاین غبار مسرور مشو

یہ عمر دو روزہ ہے اس پر اترانا نہ چاہئے۔ جس ہستی کی بنیاد ہی نیستی ہو وہ آباد
ہوتے سے رہی، کوئی ابدال یا قطب یا غوث بھی ہو اور لوگ یہ سمجھ کر احترام بھی
کریں تو فوق البشر تو نہیں ہو سکتا۔ اس آدم خاکی سے یہ غبار شہرت کشف و کرامت
اڑ کر چلے تو اس پر خوش نہ ہونا چاہئے۔

سودا کے ایک مخمس سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا کے زمانے میں بھی شعرا بیدل
کے مزار پر تقریب عرس پر جمع ہوتے اور اپنا چیدہ کلام سناتے۔ اس میں تو کچھ
کلام نہیں کہ تمام شعرا بطور پیرو مرشد اور استاد فن بیدل کا اتباع کرتے رہے۔
۱۹۴۰ء میں مجھے دہلی میں چند ماہ قیام کا اتفاق ہوا۔ جو عقیدت مجھے تھی اس کا
تقاضا تھا کہ میں اولیں فرصت میں فاتحہ خوانی کے لئے مزار پر حاضر ہوتا۔ مجھے
معلوم نہ تھا کہ کہاں واقع ہے۔ میرے تصور میں روضہ کا ایک ایسا ہی نقشہ تھا
جیسا کہ مشاہیر کا عموماً دیکھ چکا تھا۔ دریافت پر مجھے اتنا معلوم ہوا کہ قبر ریس کورس
کے قرب میں ہے۔ میں اس سڑک پر ہو لیا جو دہلی سے نظام الدین اولیاء کو جاتی
ہے۔ مگر مجھے راستہ میں کہیں نشان نہ ملا۔ یہاں تک کہ میں پیدل ہی مقبرہ
نظام الدین اولیاء پر پہنچ گیا۔ یہاں میں نے مجاورین سے دریافت کیا تو ایک
نے کہا کہ آپ بیدل کی نسبت دریافت کرتے ہیں جو شاعر تھا۔ مجھے یہ فقرہ
سن کر دھکا سا لگا۔ کہا کہ ہاں شاعر تو تھا، اس نے کہا کہ آپ اسی سڑک پر

واپس لوٹیں، داہنے ہاتھ بلندی پر مٹکے شاہ کا مزار ہے، وہاں آپ کو لکڑیوں پر مٹکے آویزاں دکھائی دیں گے، عین اس کے سامنے ایک قبرستان ہے وہاں اس شاعر کی قبر ہے۔ آتے ہوئے میں نے مٹکے لٹکتے ہوئے دیکھے تھے۔ اس لئے اطمینان ہو گیا کہ اب مرزا صاحب کے مزار کا پتہ مل گیا۔ میں اس مقام پر واپس آیا۔ سڑک کے کنارے بائیں طرف ایک قبرستان تھا۔ میں نے ان قبروں کو پہلے دیکھا جن کے گرد چار دیواری تھی، اور کتبوں کو بھی پڑھا ان میں بیدل کا نام نہ ملا۔ یہ مزار بھی بہت پرانے تھے، دیواروں کا کچھ حصہ گر چکا تھا اور کچھ گر رہا تھا، اسی طرح اور قبریں بھی دیکھیں جن کے سرہانے کتبے غائب تھے۔ اس فہرست رفتگاں میں بھی مرزا صاحب کا نام نہ تھا۔ کتبوں کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ان میں بعض اللہ والے بھی تھے، جب مجھے یقین ہو گیا کہ ان قبروں میں آپ کا پتہ نہیں چل سکتا۔ تو سخت افسردہ خاطر ہوا۔ اور حسرت بھری نظر سے اس عبرت گاہ کو دیکھتا ہوا پھر سڑک پر اتر آیا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ آپ کی قبر آخر انھیں میں ایک ہے، چلو یہیں کھڑے کھڑے فاتحہ پڑھ لیں۔ سڑک کے کنارے ایک قبر کے سرہانے میں نے فاتحہ خوانی کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ اس کے بعد شہر کی طرف لوٹا۔ راستہ میں مجھے رہ رہ کر ایک واقعہ کا خیال آتا، جب میں پہلی دفعہ دہلی میں چند روز کے لئے آیا تھا۔ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ میں امراء و وزراء کے مقبرے دیکھتا ہوا صفدر جنگ کے مقبرہ پر کتبہ پڑھ رہا تھا۔ میرے قریب ہی ایک بنگالی ہندو میری طرح ہی سیر کرتا ہوا آ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے دریافت کیا کہ کیا پڑھتے ہو، اس میں کیا لکھا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ کتبہ ہے اور متوفی کا سنہ وفات شعر کے آخری مصرع کے حروف سے نکلتا ہے۔ صنعت جمل بھی سمجھائی تو کہا کہ یہ نہایت اچھی صنعت ہے۔ اس کے بعد مجھ سے پوچھا کہ تم طالب علم معلوم ہوتے ہو، بتاؤ تم نے یہاں عجیب چیز کیا دیکھی، میں نے کہا کہ ہر ایک چیز ہی عجیب ہے۔ کیسی عالی شان عمارتیں ہیں۔ مسکرایا اور کہا کہ عالی شان عمارتیں تو ہر جگہ ہیں، میں نے کہا کہ آپ ہی فرمائیں آپ نے کیا عجیب چیز دیکھی، میرے خیال میں

تو کوئی خاص بات نہیں آئی۔ کہا اور کیا اچھا کہا کہ میں نے ایک بات دیکھی ہے، ان امرا و وزرا کے مقبرے اُجاڑ پڑے ہیں۔ اور مسجدیں اور اولیا و فقرا کے مقبرے آباد ہیں، تم سمجھے کیوں، میں نے پھر قصور فہم کا اعتراف کیا، کہا کہ یہ دنیا دار لوگ تھے، جب تک دنیا میں رہے دُنیا نے ان کا ساتھ دیا، جب دُنیا چھوڑی، دنیا انھیں بھول گئی۔ مقبروں میں اللہ والے ہیں اور مسجدوں میں اللہ ہی کا ذکر ہوتا ہے۔ اللہ حی قیوم ہے اس لئے جو بھی اس سے وابستہ ہؤا وہ بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔ یہ وجہ ہے کہ دنیا داروں کے ہاں اُلو بولتا ہے اور مقبروں اور مسجدوں میں زندگی کی رونق ہے، اس واقعہ کا خیال مجھے بار بار آتا اور یہ وسوسہ بھی کہ کیا بیدل بھی دنیا دار تھا کہ آج مجھے اس کی قبر کا نشان تک نہ ملا۔

میں مکان پر آیا تو میرا لڑکا میرا انتظار کر رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی پوچھا کہ آپ کے چہرہ پر پژمردگی سی چھائی ہوئی ہے، کیا کہیں دور نکل گئے تھے۔ زیادہ کوفت تو نہیں میں نے کہا کہ برخوردار نہیں وجہ کچھ اور ہی ہے۔ میں نے اس کو تمام واقعہ من وعن سنایا اور یہ بھی کہا کہ دیکھو نظام الدین اولیاء کے مقبرہ پر کتنی رونق ہے۔ اور کیسی عالی شان عمارت روضہ پر ہے۔ لڑکے نے ایک اور ہی نظریہ پیش کیا اور کہا کہ بات یہ ہے کہ ان حضرات کی زندگی ہی میں لوگ ان کو پوجتے تھے، تب سے پوجاریوں کا ایک سلسلہ قائم ہے۔ بیدل ایک قلندر تھا۔ وہ ان باتوں کی بیہودگی سے خوب واقف تھا۔ وہ کسی بادشاہ کو بھی جب تک زندہ رہا خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اور نہ اس نے پیری مریدی کا ڈھونگ رچایا۔ عقیدت مند سینکڑوں تھے اور اب بھی ہیں۔ وہ اپنے سخن میں زندہ ہے۔ اور زندہ رہے گا۔ اس کا احترام کرنے والے اہل علم وفضل ہیں، وہ جہلا کی تحسین ناشناس کا دلدادہ نہ تھا جو قبروں کو پوجتے ہیں۔ اب میری بھی آنکھیں کھلیں اور کہا کہ سچ کہتے ہو اور یہ بھی سچ ہے کہ "پیر شو یا موز"۔

جو کچھ میرے لڑکے نے کہا خود بیدل نے بھی ایک قطعہ میں اس کو واضح کیا ہے :-

مگو گذشتہ رفیقاں ز دل فراموش اند کدام نالہ کہ در پردہ اش نمی جوش اند
تو سخت بے خبری ورنہ رفتگاں یک سر ز خجلت مژہ وا کردن تو رو پوش اند
چراغ انجمن حیرت نظـر بودند کنوں بہ پردۂ دل داغ ہائی خاموش اند
ہنوز زحمت سعی تو می کشند بخاک تو تا نہ بار تعلق ز رستۂ دوش اند
بچشم بستہ نگاہی کہ ایں پری صفتاں نزاہت انجمن شیشہ خانۂ ہوش اند
نرفتہ اند از یں بزم تا سخن باقیست ز دیدہ رفتہ حریفاں ہنوز در گوش اند

اب میں نے سمجھ لیا کہ بیدؔل تو مجھ سے کلام کر رہا ہے۔ قبر والے تو کسی سے بولتے نہیں۔ مُردے نہیں بولتے زندے بولتے ہیں۔

ایک ماہ بعد مجھے پھر اسی سڑک پر جانے کا اتفاق ہُوا۔ دل میں تھا کہ وہیں سڑک کے کنارہ پر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھ لوں گا۔ جب یہاں پہنچا تو میری حیرت کا اندازہ کون کر سکتا ہے کہ یہی قبر جس کے بالیں پر میں نے گذشتہ ماہ فاتحہ خوانی کی تھی "سیمنٹ" کے "پلستر" سے پُختہ بنی ہوئی تھی اور سامنے اس پر جلی حروف میں لکھا ہُوا تھا کہ :۔

"مرقد مرزا عبد القادر بیدؔل رحمۃ اللہ علیہ"

قبر کے ایک پہلو پر یہ الفاظ تھے "بہ توجہ اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن" آج اتنے عرصہ بعد مجھے الفاظ یاد نہیں رہے مگر یقیناً یہی کچھ تھے، اگرچہ میری حیرت آمیز مسرّت کی انتہا نہ رہی مگر افسوس بھی ہُوا کہ خیر بیدؔل کو تو اس کی پرواہ نہ تھی کہ اس کے قول کے مطابق بعد وفات اس کا کیا فائدہ ہے کہ "گل کند مقبرہ ام بہزادم" مگر اعلیٰ حضرت کی شان کے شایاں تو کسی طرح نہ تھی۔ اتنا تو مجھے بھی معلوم تھا کہ موجودہ والئی دکن کا مورث اعلیٰ آصف جاہ اوّل بیدؔل کا شاگرد اور عقیدت مند تھا، مگر یہ راز نہ کُھلا کہ اتنی پشتیں گزرنے کے بعد حضور نظام کو تعمیر مرقد کا خیال کیسے آیا۔ اب مجھے یقین ہو گیا، کہ یہ سب اہتمام ایک عقیدتمند کی خاطر ہی ہُوا کہ افسردہ نہ ہو، ورنہ

ای مُردہ دل آرائش مرقد چہ تمناست نام تو ہماں بہ کہ لب گور نگیرد

تذکرہ

مرزا عبدالقادر بیدل کی نسبت تذکرہ نویسوں نے جو کچھ لکھا ہے اگر بلفظہ اس کا حوالہ دیا جائے تو ایک دفتر بن جائے گا۔ ہم صرف دو تذکرہ نویسوں کی رائے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ایک موافق ہے اور دوسری مخالف، موافق میر غلام علی آزاد بلگرامی "خزانہ عامرہ" میں لکھتا ہے کہ

"بیدل مرزا عبدالقادر عظیم آبادی می کدہ پیری کدہ سخندانی و افلاطون خم نشیں یونان معانی است۔"

ترجمانی

بیدل مرزا عبدالقادر عظیم آبادی سخندانی کا پیر مغاں ہے (بلحاظ شاعرانہ تخیل) اور بلحاظ حکیمانہ تفکر اس کو شعراء میں وہی رتبہ حاصل ہے۔ جو افلاطون کو حکماء یونان میں۔

مشہور روایت ہے کہ افلاطون "خم" میں سالہا سال گوشہ نشیں رہا، می کدہ کے تلازمات میں "خم" نے عبارت میں لطف پیدا کر دیا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ معانی کو اگر ملک یونان تصوّر کیا جائے تو بیدل کو افلاطون کہنا چاہیئے۔

"کرا قدرت کہ بطرز تراشی او تواند رسید و کرا طاقت کہ کمان بازوئی او تواند کشید چنانچہ خود جرس دعویٰ می جنباند، مدعی درگذر از دعویٰ

کس میں یہ طاقت ہے کہ اس طرز کو جو اسکی اپنی ہے پہنچ سکے اور کس میں یہ قوت ہے کہ وہ کمان جو بیدل ہی کا زور بازو کھینچ سکتا ہے کوئی اور کھینچ سکے۔ چنانچہ اس دعویٰ کا

طرزِ بیدؔل، سحرِ مشکل کہ بہ کیفیّت اعجاز رسد؛" اعلان بانگِ دہل وہ خود کرتا ہے۔ اسے مدعیٔ طرزِ بیدؔل کا دعوٰے نہ کر، جادو بھی بھلا معجزہ کی کیفیّت پیدا کر سکتا ہے۔

راقم الحروف کہتا ہے کہ اگرچہ بیدؔل نے اس تعلی سے کام نہیں لیا جو شعراء کا عموماً خاصہ ہے مگر کبھی کبھی اسے خود بھی اپنی بلند خیالی کا احساس ضرور ہوتا تھا چنانچہ ایک غزل کا ایک شعر ہے:

"سر بے نیازی فکر را، بہ بلندی نہ رسانده ام
کہ بجز تتبع نظم من، احدے خیال زمیں کند"

مؤلف خزانہ عامرہ بیدؔل کے دعوٰے کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"رساند پایہ معنی بہ آسماں نہم بلند طبع شناسد کلام بیدل را"

"نشہ فقر جزو دماغش و فروغ روشن دلی نورِ چراغش" بیدؔل کے دماغ میں فقر کا نشہ اس حد تک تھا، کہ اس کے دماغ کا جزو بن گیا تھا۔ اور اس کی روشن دلی اس کے چراغ جان کے نور سے جلوہ فروز تھی۔

میر آزاؔد نے جو کچھ بیدؔل کی نسبت لکھا ہے اس کی تصدیق واقعات سے ہوتی ہے۔ چنانچہ آغاز شباب میں شہزادہ محمد اعظم کے ہاں ملازمت اختیار کی۔ شہزادہ کی مجلس میں شعرائے عصر کا ذکر آیا تو کسی نے کہا کہ آج بیدؔل کا بھی جواب نہیں۔ شہزادہ نے کہا کہ اچھا اسے کہو کہ ایک قصیدہ لکھے، تاکہ اس کے مرتبہ کا بھی اندازہ ہو سکے۔ دوستوں نے بیدؔل کو کہا کہ اس میں کیا قباحت ہے اگر ایک قصیدہ ولی نعمت کی مدح میں لکھو۔ بیدؔل نے مناسب یہی سمجھا کہ مستعفی ہو گیا۔ میر آزاد لکھتا ہے کہ میرا مشرب بھی یہی ہے یعنی ترک مدح اور رد صلہ، امرا کی طرف سے عطا ہوتی ہے اور یہ امرا کی ہمت کا تقاضا ہے لیکن ردِ صلہ فقرا کی ہمت کے مناسب ہے۔ چونکہ مرزا بیدؔل اہلِ دولت و ثروت سے ہمیشہ کنارہ کش رہا، حق تعالےٰ اُمراءِ عصر کو اس کے آستانہ پر لایا، چنانچہ غازی

اورنگ زیب عالمگیر کے آخری عہد اور محمد شاہ رنگیلا کے جلوس کے اوائل تک ارکان ہر سلطنت اس کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور ہدیہ نیاز پیش کرتے رہے، جب نواب آصف جاہ ۱۱۳۲ھ میں کشورِ دکن پر مسلط ہو گیا تو مرزا بیدل کی خدمت میں لکھا کہ یہاں تشریف لائیں۔ یاد رہے کہ اوّل نواب آصف جاہ بیدل کا شاگرد بھی تھا۔ مرزا نے یہ بیت لکھ کر بھیج دیا:

دنیا اگر دہند نہ خیزم زجائے خویش
من بستہ ام حنائی قناعت بپائے خویش

اگر مجھے دنیا جہان کا مال اس غرض سے دیا جائے کہ میں اپنا گوشۂ فقر و قناعت ترک کر کے کسی صاحب جاہ کے درِ دولت پر حاضر ہو کر جبہ سائی کروں تو یہ مجھ سے بعید ہے اس لئے کہ میں نے حنائے قناعت پاؤں پر باندھ رکھی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مرزا بیدل نے فقر و فاقہ قبول کیا اور قناعت پیشہ تھا لیکن جو دولت علم و فن اس کے پاس تھی اس کی احتیاج امراء کو تھی۔ اور یہی حاجت ان کو خود مرزا بیدل کی خدمت میں بصد نیاز کھینچ کر لائی۔

میر آزاد لکھتا ہے کہ میر عبدالولی عزلت سورتی سے منقول ہے کہ بعد وفات مرزا بیدل شعراء شاہجہان آباد دہلی ہر سال مرزا کی قبر پر بتقریب عرس جمع ہوتے، اور کلیات مرزا حسب معمول نکال کر مجلس میں لاتے۔ میں اس نیت سے کہ آیا مرزا کو میری یہاں آمد کی بھی کچھ خبر ہے، کلیات کھولی تو پہلا شعر یہ تھا:۔

چہ مقدار خوں در عدم خوردہ باشم
کہ بر خاکم آئی و من مردہ باشم

تو میرے مزار پر آئے اور میں مُردہ تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ عدم میں کتنا پیچ و تاب کھا رہا ہوں، حاضرین نے بھی یہ شعر پڑھا اور میر عبدالولی کی نیت سے واقف ہوئے تو بیدل کی کرامت کے قائل ہو گئے۔

بیدل کی کلیات میں ایک لاکھ سے زیادہ ابیات ہیں، غزلیات میں ردیف "ت" میں پانچ سو سے زیادہ اشعار ہیں۔ اکثر شعرا کی کلیات میں اتنے ابیات نہیں ملیں گے۔

بیدل کے بارہ میں صرف اعتراض یہ ہے کہ خارج آہنگ ہے، یعنی زبان فارسی میں ایسی ترکیبیں اختراع کیں جس سے اہلِ زبان مانوس نہ تھے اور اسے غیر محاورہ کہتے، مثلاً بیدل نے اپنے بیٹے کی وفات پر ایک مرثیہ مخمس میں لکھا، ایک شعر یہ ہے کہ

ہر گہ دو قدم خرام می کاشت
از انگشتم عصا بکف داشت

جو کبھی دو قدم چلتا تو میری انگلی اُس کے ہاتھ میں عصا کا کام دیتی، شعر کی لطافت کے علاوہ امرواقعہ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ عصا کی ضرورت بوڑھوں کو ہوتی ہے جس کے سہارے چلتے ہیں۔ بوڑھاپا بھی دوسرا بچپن ہوتا ہے کہ دونوں کو چلنے میں سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچّہ اپنے والد کی انگلی پکڑکر قدم بقدم چلتا ہے گویا یہ عصاء پیر ہے۔ انگلی اور عصاء میں مشابہت معنوی اور صوری شعر کی خوبی کو اور بڑھا رہی ہے۔ لیکن "خرام می کاشت" ایک نیا محاورہ ہے، اور اسی پر اعتراض ہوا کہ غیر محاورہ ہے۔ بات یہ ہے بیدل نے اس میں وہ بات پیدا کی ہے جو کسی کے ذہن میں اس وقت تک نہ آئی تھی۔ "خرام می کاشت" کا مفہوم یہ ہے کہ چلنا سیکھتا تھا۔ انگریزی زبان میں محاورہ ہے (   ) اور دوسری زبانوں میں بھی ہے۔ گویا "خرام" بمنزلہ ایک بیج کے تھا جس کو وہ طفولیت میں بو رہا تھا۔ آگے چل کر اسی بیج کا نشو ونما ہونا تھا۔ لیکن نہ ہو سکا ورنہ میری پیری کا عصا ہوتا۔

خان آزاد "مجمع النفائس" میں لکھتا ہے کہ بیدل نے صرف پُرانی لکیر کو پیٹنا پسند نہ کیا بلکہ از راہِ قدرت نمایاں تصرف بھی کیا۔ ولایتی اور ان کے کاسہ

لیس ہندی اس بزرگوار کے کلام پر حرف رکھتے ہیں۔ لیکن میں تو اس تصرف میں خوبی ہی خوبی دیکھتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ حسد بُری بلا ہے جب اہلِ سخن جن کو اس بات پر بھی فخر تھا کہ اہلِ زبان ہیں بیدل کے شاعرانہ تخیل اور حکیمانہ تفکر کی بلندی تک نہ پہنچ سکے تو اتنی بات کہنا کیا مشکل ہے کہ خارج از آہنگ ہے۔ شبلی نعمانی مرحوم ہندی "شعر العجم" میں جہاں کہیں بیدل کا ذکر کرتا ہے تو ایسے لفظوں میں کہ قابلِ ذکر ہی نہیں سمجھتا، چنانچہ صائب کے محاسن بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ صائب اگرچہ تمام اساتذہ بلکہ ہم عصروں تک کو ادب سے یاد کرتا تھا لیکن خاص خاص اساتذہ کا نہایت معتقد تھا، سب سے زیادہ خواجہ حافظ کا معترف تھا؛ یہ اس کے صحیح مذاق کی بہت بڑی دلیل ہے، نظیری کو عرفی سے زیادہ مانتا تھا، چنانچہ کہتا ہے کہ:

صائب چہ خیالی ست شوی ہمچو نظیری
عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

یہاں تک تو مضائقہ نہیں لیکن افسوس ہے کہ عام خوش اعتقادی یا شہرت عام کی بنا پر ظہوری اور جلال اسیر کی بھی مداحی کرتا ہے بد مذاقی کا یہ پہلا قدم تھا، جس نے آخر ایک شاہراہ قائم کر دی اور نوبت یہ پہنچی کہ آج لوگ ناصر علی، بیدل، شوکت بخاری کے کلام پر سر دُھنتے ہیں

"بنیادِ ظلم در جہاں اندک بود ہر کہ آمد براں مزید کرد"
(فزود؟)

اسی طرح مرزا غالب کی تعریف کرتے ہوئے مولانا ارشاد فرماتے ہیں کہ "مرزا غالب کی طبیعت میں نہایت شدت سے اجتہاد اور جدت کا مادہ تھا، اس لئے اگرچہ قدما کی پیروی کی وجہ سے نہایت احتیاط کرتے ہیں تاہم اپنا خاص انداز بھی نہیں چھوڑتے۔ عجیب بات ہے، ایران کے انقلاب کی اگرچہ ہندوستانیوں کو خبر نہ تھی، لیکن خود بخود یہاں بھی

انقلاب ہوا یعنی شاعری کا مذاق جو ناصر علی وغیرہ کی بدولت سینکڑوں برس سے بگڑا چلا آتا تھا، درست ہو چلا، مرزا غالبؔ نے شاعری کا انداز بالکل بدل دیا، ابتدا میں وہ بھی بیدل کی پیروی کی وجہ سے غلط راستہ پر پڑ گئے تھے، لیکن عرفی، طالب آملی، نظیری، حکیم کی پیروی نے ان کو سنبھالا، چنانچہ دیوان فارسی کے خاتمہ میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔"

یہ اشارہ خاتمہ دیوان فارسی پر ایک تقریظ میں پایا جاتا ہے۔ اس میں وہ عرفی و طالب و نظیری اور علی حزیں کے اتباع کا تو ذکر کرتا ہے مگر بیدؔل کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا۔ یہ اجتہاد اور جدت" جس کی تعریف میں مولانا شبلی رطب اللسان ہیں اشارتاً اسی تقریظ میں ایک شعر میں بیان کیا گیا ہے۔

"درسلوک از ہرچہ پیش آمد گزشتن داشتم
کعبہ دیدم نقش پائے رہرواں نامیدمش

سلوک میں جو کچھ بھی میرے سامنے آیا اس سے میں گذر گیا۔ کعبہ کو دیکھا تو اسے راستہ چلنے والوں کے نقش قدم سے تعبیر کیا۔ بیدؔل کہتا ہے کہ

"کعبہ و بت خانہ نقش مرکز تحقیق نیست
ہر کجا گم گشت رہ سرمنزلے آراستند"

بیدؔل نے اس موضوع پر مختلف پیرایہ میں کئی اشعار لکھے ہیں، یہ تخیل جو غالبؔ کے اس شعر میں ہے بیدل ہی سے لیا گیا ہے، بیدؔل کہتا ہے کہ

درطلب باید گذشت از ہرچہ می آید بہ پیش
گر ہمہ سرمنزل مقصود باشد جادہ است

چہ دنیا و چہ عقبیٰ سد راہ تست اے غافل
بیا بگذر کہ از بہر گذشتن ہاست حائل ہا

گر ز دنیا بگذری تشویش عقبیٰ حائل است
تا زخود نگذشتۂ میبایدت صد جا گذشت
نیست در دشت طلب با کعبہ مارا احتیاج
سجدہ گاہ ناست ہر جا نقش پا افتادہ است

اگر از دیر وارستیم شوق کعبہ پیش آمد
تگ و پوی نفس یارب کجا ہا میبرد مارا

تخیل بیدل کا ہے غالب نے جن الفاظ میں اس کا اظہار کیا ہے اس سے وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو بیدل کے اشعار میں ہے، غالب سے بہتر تو ہمارے علامہ اقبال مرحوم نے کہا ہے۔

زاہد کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

غالب نے صرف اتنی بات بیان کی ہے کہ سلوک میں جو بھی پیش آئے اس سے گزر جانا چاہیئے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ کیوں گزرنا چاہیئے اور یہ کہ منزل بھی کوئی ہے کہ نہیں۔ یہ بات بیدل نے بتائی ہے۔ اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ سر دست ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کا نظریہ در بارہ بیدل اور غالب کس حد تک صحیح ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ شبلی کا ممدوح غالب بیدل کی تعریف میں تو رطب اللسان ہے اور آپ بیدل کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فارسی شاعری بیدل جیسے شعرا نے بگاڑ رکھی تھی غالب نے نہ صرف اس کی اصلاح کی بلکہ شاعری کا انداز بالکل بدل دیا۔ ابتدا میں بیدل کی پیروی کی وجہ سے وہ بھی غلط راستہ پر پڑ گیا تھا۔ مولانا بالفضل اولنا نے یہ تصریح نہیں فرمائی کہ ابتدا سے آپ کی کیا مراد ہے۔ اور یہ کہ کس وقت اس کو اس کا احساس ہؤا کہ وہ غلط راستہ پر چل رہا ہے۔ غالب کا

فارسی اور اُردو کلام غالب نے خود اہتمام کے ساتھ چھپوایا۔ فارسی کلام جس پر خود غالب کو ناز ہے اسے تو کوئی پوچھنے والا ایران میں بھی نہیں، البتہ اردو کلام کو خاص شہرت خاص وجوہ سے ہوئی۔ غالب فارسی اور اُردو کلام دونوں میں بیدل کا مداح ہے۔ اُردو میں اس کا ایک شعر ہے۔

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا اسداللہ خاں قیامت ہے

میری ایک غزل کا یہ شعر ہے:-

کوشش تو بہت کی غالب نے اور اختر نے بھی ریختہ میں
انداز وہ طرز بیدل کا اشعار میں پیدا ہو نہ سکا

یہ کہنا زیادہ حقیقت کے اقرب ہے جو میں نے اس شعر میں واضح کیا ہے کہ غالب نے کوشش تو بہت کی کہ بیدل کا انداز پیدا کر سکے لیکن نہ کر سکا۔ اس لئے اسے چھوڑنا پڑا، فارسی میں بھی بیدل کا مداح ہے۔

مرزا غالب نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اہلِ علم تو تھوڑے ہوتے ہیں اور ان میں اہلِ تقلید محققین سے زیادہ ہوتے ہیں۔ شہرت عوام میں ہوتی ہے۔ جس کو عوام قبول کریں اسی کا کلام زبان زد ہو جاتا ہے۔ دوسرے بات یہ ہے کہ معاصرین کو خیال میں بھی نہ لانا چاہیئے اور جو ان میں سے مشہور ہو اسے کسی نہ کسی طرح نیچا دکھانا چاہیئے اور خود اس کی جگہ متمکن ہونا چاہیئے۔ بدقسمتی سے اس وقت مرزا قتیل کی شہرت عام تھی اور اس کے شاگرد بھی بہت تھے، قتیل فوت ہو چکا تھا۔ غالب نے حسب عادت کہہ دیا کہ قتیل ایک ہندو تھا اسے فارسی سے کیا لگاؤ ہو سکتا ہے، قتیل کے شاگرد بھڑک اٹھے تو غالب کی یہ بھی عادت تھی، کہ پھر عذر خواہی پر اُتر آتا۔ چنانچہ معذرت کرتا ہوا لکھتا ہے کہ عموماً بزم سخن میں احباب کہتے ہیں کہ غالب قتیل سے بہتر نہیں کہہ سکتا۔ جواب میں لکھتا ہے کہ:

فیضے از صحبت قتیلم نیست رشک بر شہرت قتیلم نیست

یہ صحیح ہے کہ میں قتیل کی صحبت کا فیض یافتہ نہیں ہوں اور نہ مجھے قتیل کی شہرت پر رشک آتا ہے۔

مگر آناں کہ پارسی دانند ہم بریں عہد و رائے و پیمانند

مگر جو پارسی داں ہیں ان کا اس پر اتفاق ہے۔

کز اہلِ زباں نبود قتیل ہرگز ز اصفہاں نبود قتیل

کہ قتیل اہلِ زبان نہ تھا اور ہرگز اصفہان کا رہنے والا نہ تھا۔

لاجرم اعتماد را نسزد گفتہ اش استناد را نسزد

اس لئے ماننا پڑے گا کہ اس کی زبان چونکہ ٹکسالی نہیں قابلِ اعتبار بھی نہیں اور اس کا کلام سند میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد غالب اپنی نسبت لکھتا ہے کہ میں علی حزیں اور جلال اسیر کو چھوڑ کر قتیل کا اتباع کیوں کروں۔

دامن از کف کنم چگونہ رہا طالب و عرفی و نظیری را

خاصہ روحِ رواں معنی را آں ظہوری جہانِ معنی را

میں طالب آملی اور عرفی اور نظیری کا دامن کیسے چھوڑ دوں، بالخصوص ظہوری جو روحِ رواں اور جہانِ معنی ہے اس کے بعد ظہوری کی تعریف میں چند ابیات ہیں جس کی نسبت مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ صائب جیسا شاعر ظہوری اور جلال اسیر کی تعریف عام خوش اعتقادی یا شہرت عام پر کرتا ہے۔ جب مولانا کا ممدوح غالب ان حضرات کا مداح ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا ان شعرا کو ان کے اصلی مرتبہ سے گرانے کی کیوں کوشش کرتے ہیں، صائب نے سچ کہا ہے:

صائب دو چیز می شکند قدرِ شعر را
تحسینِ ناشناس و سکوتِ سخن شناس

غالب بیدل، ظہوری اور جلال اسیر کی تعریف کرتا ہے۔ وہ سخن شناس

ہی نہیں سخن گو بھی ہے اور مولانا ان کی مذمت کرتے ہیں۔

اسی مثنوی میں غالب قتیل کے شاگردوں کو مخاطب کرتا ہوا کہتا ہے کہ تم نے جو میرے کلام پر اعتراض کیا ہے کہ میں نے "زدہ" کو غیر محاورہ باندھا ہے۔ می زدہ، غم زدہ، شراب زدہ کونسی ترکیب ہے۔ غالب کہتا ہے کہ "تقلیب" ہے:

ہمچناں آں محیط بے ساحل — قلزم فیض میرزا بیدل
از محبت حکایتے دارد — کہ بدیساں بدایتے دارد
"عاشقے بیدے جنوں زدۂ — قدح آرزو بخوں زدۂ"
کردہ ام عرض ہمچناں "زدۂ" — طعنہ بر بحر بیکراں زدۂ
گرچہ بیدل ز اہل ایران نیست — لیک ہمچوں قتیل نادان نیست
صاحب جاہ و دستگاہے بود — مرد نے زیں نمد کلاہے بود

اسی طرح محیط بے ساحل اور قلزم فیض مرزا بیدل نے "زدہ" اپنی مثنوی میں باندھا ہے، یہ بیت داستانِ محبت کے شروع میں لکھا ہے کہ:

عاشقے بیدے جنوں زدۂ — قدح آرزو بخوں زدۂ

میں نے بھی اسی کا اتباع کیا ہے۔ تم نے مجھ پر نہیں بلکہ اس بحر بیکراں پر اعتراض کیا ہے۔ اگرچہ بیدل ایرانی نہیں ہے لیکن قتیل کی طرح نادان بھی نہیں یعنی فارسی سے خوب واقف ہے، زبان پر اس کو پوری قدرت حاصل ہے، جسے غالب "محیط بے ساحل" اور "قلزم فیض" اور "بحر بیکراں" کہے، ایسے شخص کا کیا حق ہے کہ بیدل کے کلام پر حرف لائے جبکہ وہ خود غالب کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا ہے۔

جس "اجتہاد" اور "جدت" کی تعریف غالب سے منسوب کی جاتی ہے، وہ اس کا خود مدعی نہیں۔ لیکن یہ عقیدت کا کرشمہ ہے کہ یہ دعویٰ اس سے منسوب کیا جاتا ہے، جن کا وہ اتباع کرتا ہے ان کو نام بنام شمار کرتا ہے، اس نے قتیل کی نسبت

لکھنے کو تو لکھ دیا کہ وہ اہلِ ایران نہیں۔ لیکن وہ خود بھی ایرانی نہیں ترکمانی ہے، اور اہلِ زبان شعرا کا اتباع اس نے کیا تو کیا قتیل نے نہیں کیا۔ غالب کو معلوم تھا کہ فارسی شروع سے مسلمانوں کی حکومت کی زبان رہی ہے اور یہ کہ اہلِ زبان ظہوری و نظیری و عرفی وغیرہم نے ہندوستان ہی میں فروغ پایا۔

اجتہاد اور جدّت بیدل کے کلام میں پائی جاتی ہے اور غالب نے سخت کوشش کی کہ بیدل کی طرز اس کے کلام میں پیدا ہو جائے، وہ خود کہتا ہے کہ وہ کامیاب نہ ہوا۔ غالب کا اُردو کلام اس کا اپنا انتخاب کردہ ہے، اگر زبان اور اہلِ زبان ہی ایک معیار پرکھنے کا ہو جس پر غالب قتیل کے مقابلہ میں زور دیتا ہے تو ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ غالب کا اُردو کلام اس پایہ سے گرا ہوا ہے۔ بلکہ اسے اُردو کہنا ہی صحیح نہیں ایک ولائتی اُردو میں کہتا ہے۔

برہمن کی بیٹی آج میری آنکھ میں پری
غصّہ ہوا، و گالی دیا، و دگر لری

اسی قسم کی زبان اُردو غالب کی بھی ہے۔

شمارِ سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

یہ تمام غزل ایک لفظ آمد سے فارسی بن سکتی ہے۔ وہ فارسی مصادر کا عام استعمال کرتا ہے، آخر اس نے مومن کا اتباع کیا اور جو چند غزلیں اس نے حکیم مومن خاں کی طرز میں لکھی ہیں وہی اس کا شاہکار ہے، مومن کی زبان اتنی شستہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ سے اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اس کی زبان ہمارے زمانہ کی زبان ہے، بلاشبہ ذوق اہلِ زبان ہے اور اس کے کلام میں بھی روزمرہ ہے لیکن حشو و زوائد اور حروف جار کی بھرمار جو اس کے اشعار میں ہے مومن کا کلام اس سے پاک ہے۔ لیکن ذوق و غالب کو ایسے شاگرد ملے جنھوں نے حق شاگردی ادا کیا۔ اور مومن کو کوئی ایسا آدمی نہ ملا۔ غالب ان سب کا جانشین تھا جو غدر

سے پہلے گزر چکے تھے، اب وہ میدان میں اکیلا رہ گیا۔

یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ غالب کے بہترین اشعار فارسی اور اُردو میں وہ ہیں جن کا تخیل بیدل کے کلام سے لیا گیا ہے۔ چند اشعار کا ہم حوالہ دے چکے ہیں۔ لیکن یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے[1]

---

[1] بیدل کہتا ہے:

آہم ز نارسائی شد اشک و باعرق ساخت
پستیت گر خجالت شبنم کند ہوا را

غالب کہتا ہے:

ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

بیدل نے تو ایک بات پیدا کی ہے کہ آہ نارسا ہوئی تو اس نارسائی پر آنسو نکل پڑے یعنی آہ اشک میں مبدل ہوگئی۔ آہ تو بلندی کی طالب ہے اور جبتک رسا ہے ہوا کی طرح بلند ہے۔ لیکن نارسائی کی خجلت نے اس ہوا کو شبنم میں تبدیل کر کے زمین کی طرف پستی میں گرا دیا۔ محاورہ ہے کہ مارے شرم کے پانی پانی ہوگیا۔ خجالت نارسائی کی اور نارسائی پستی کی دلیل ہے۔ غالب کے شعر میں آنسو دمِ سرد بن گئے، اس لئے پانی کا ہوا ہو جانا باور آیا۔ ایک بدیہی امر جو روز مرہ مشاہدہ ہوتا ہے اس کے لئے "باور" استعمال کرنا کوئی عجیب بات نہیں، پانی میں حرارت ہوا سے کمتر ہے پانی ہوا حرارت سے ہوتا ہے، سردی سے منجمد ہوگا۔ اس لئے شعر غلط ہے، بیدل کا مشاہدہ صحیح ہے۔

"مطلبم از مے پرستی تر دماغیہا نبود
یک دو ساغر آب دادم گریۂ مستانہ را" (بیدل)

غالب کہتا ہے کہ

بیدل نے کبھی کسی شاعر ہم عصر یا متقدم کی ہجو نہیں لکھی، اگرچہ اس کے اپنے زمانہ میں حاسد موجود تھے اور اس کے کلام کو "خارج آہنگ" کہتے جو در حقیقت

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

غالب نے "مطلب" کی جگہ "غرض" اور "تر دماغی" کی جگہ نشاط استعمال کئے ہیں، بیدل اور غالب کے تصوف میں یہی فرق ہے کہ بیدل گریہ مستانہ کو آبدار بناتا ہے اور غالب بیخودی چاہتا ہے۔

بیدل کہتا ہے:

بسینہ داغ، و بدل نالہ و بدیدہ سرشکم
محبتم ہمہ جا شعلہ کار سوختہ گی ہا

سینہ پر داغ ہے اور دل سے نالہ نکلتا ہے، آنکھوں میں آنسو ہیں، ہر ایک مقام پر بوجہ محبت شعلہ کی طرح میرا کام جلنا ہی ہے:

شمع محفل برخموشی بست و مینا بشکست
ہر کسے زیں انجمن طرزِ دگر نالید و رفت

شمع محفل تو چپکے روتی رہی اور آخر خاموش ہوگئی یعنی بجھ گئی شراب کی صراحی ٹوٹی تو شراب کے آنسو انڈیل دئے اس انجمن سے ہر ایک اپنی اپنی طرز پر روتا ہوا چلا گیا۔

محملے بر شعلہ، اشکے توشہ، آہی راہبر
شمع در شبگیر فرصت طرفہ ساماں کرد و رفت

شمع بزم میں تین باتیں ہیں ایک تو شعلہ اور دوسرے اشک تیسرے دھواں شمع کو ایک رات کی فرصت ملی تو اس نے سامان سفر باندھا، صبح کو کوچ تھا۔ محمل تو شعلہ پہ باندھا، زاد سفر یہی گریہ آہوں کا دھواں راہبر تھا۔ بزم ہستی سے اس سرد سامان کے ساتھ نکلی، یہ قافلہ صبح ہوتے ہوتے لٹ گیا۔

بیدل کا اجتہاد اور جدت ہے۔ مگر اس نے کسی شاعر کا نام نہیں لیا۔ "چہار عنصر" میں ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہے کہ ایک صحبت میں ہمعصر شعرا اور بیدل کو ایک ہی

سحر آہ و گلستاں نکہت و بلبل فغاں دارد
جہانے سوئے بیرنگی ز حسرت کارواں دارد

جہاں محسوسات عالم صورت ہے۔ اور اس کی اصل بے صورتی یا بے رنگی ہے۔

صورتے از بے صورتی آمد بروں
باز شد انا الیہ راجعون (رومی)

گلستاں میں پھولوں کی بُو، بلبل کا نالہ، صبح کی آہ سب ایک عالم پریشان ہے اور یہ کارواں بصد حسرت بیرنگی کی طرف جارہا ہے۔

کس از یں حرماں سرا با ساز جمعیت نرفت
چوں سخن تا رفتہ اند از لب پریشاں رفتہ اند

اس حرماں سرا دنیا سے کوئی بھی جمعیت کے ساز و سامان کو لے کر نہیں گیا۔ بات کی طرح جو منہ سے نکلتی ہے پریشاں حال و خاطر ہی گیا۔ بات جب تک دل میں ہے اسے جمعیت حاصل ہے، منہ سے نکلی تو بیرونی دنیا میں افواہ کی طرح پھیل گئی۔

غالب کہتا ہے کہ

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل
جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

غالب نے "نکہت کی جگہ" بو" اور فغاں کی جگہ "نالہ" اور "آہ" کی جگہ "دود" استعمال کیا ہے۔

(۳) بیدل کہتا ہے کہ

دامن دل گرفتہ ایم ہمہ خون مستاں بگردن مینا

زمین میں طبع آزمائی کرنی پڑی، بیدل تو اس عرصہ زمین کو جلدی ہی طے
کرکے فارغ ہو گیا اور دوسرے سرگرداں خاک چھانتے رہے۔ یہ واقعہ اس نے

دل از ہمدوشی عکس تو بر آئینہ می لرزد
کہ او مست مئے ناز است و این دیوار نم دارد

آئینہ میں بھی آب ہے۔ گویا یہ ایک دیوار ہے جس میں نم سرایت کر چکا ہے۔
آئینہ میں اس مست ناز کا عکس پڑ رہا ہے اور مست کے پاؤں بھی لڑکھڑاتے
ہیں اور دیوار آئینہ بھی نمدار، دل کانپ رہا ہے کہ دونوں گر نہ پڑیں، مطلب یہ
ہے کہ آئینہ اور تمثال کی بنیاد ہی کیا، ایک ہستی عدم نما اور دوسرا عدم ہستی نما،
یہ خیال بیدل نے اکثر اشعار میں باندھا ہے، دامن گرفتہ ایم ہمہ الخ کا مطلب یہ ہے
کہ ہم سب نے دل کو مجرم قتل ٹھہرا کر اس کا دامن پکڑا ہوا ہے، اصل مجرم تو کوئی اور
ہے وہ مینا ہے۔ دل تو دلدار کے قبضہ میں ہے اور دلدار مست اور نشہ مستی مینا نے
دیا ہے۔ دل خون ہی تو ہے اس کے دامن پر دھبہ ہے تو اس کو مجرم نہ سمجھنا چاہئے۔
یہ لہو مست ناز کے ہاتھوں سے ہوا جس کے ہاتھ میں مینا کی گردن ہے اس نے
اصل مجرم کو بھانپ لیا اور گردن دبائی، بات یہ ہے کہ دلدار کو قتل کا مجرم قرار
دینا آداب و ادب کے خلاف ہے، "تو گو گناہ من است"

غالب کہتا ہے کہ

ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

مطلب یہ ہے کہ وہ شراب پی کر لڑکھڑا رہا ہے اس کی لغزش مستانہ پر
خلق مر رہی ہے۔ اس لئے جرم قتل مینا کی گردن پر ہے کہ نہ وہ شراب پیتا اور نہ
مست ہوتا اور نہ لوگوں کا خون ہوتا، موج مے کانپ رہی ہے کہ مجھے اصل مجرم
نہ ٹھہرایا جائے۔

بیان کیا ہے لیکن کسی شاعر کا نام نہیں لیا۔ کہ کون کون موجود تھے۔
اجتہاد اور جدت پسندیدہ امور ہیں، لیکن ترکیب الفاظ غیر مانوس

---

(۴) خلقے بعدم دود دل و داغ جگر برد
خاک ہمہ صرف گل و سنبل شدہ باشد

مطلب یہ ہے کہ ایک دُنیا حسرت زدہ آہیں بھرتی اور داغ جگر لے کر زیر خاک چلی گئی۔ ان کی مٹی سے گل لالہ اور سنبل کی تعمیر ہوئی ہوگی کہ گل کے جگر پر داغ اور سنبل کے پیچ و خم میں وہی دہواں ہے جو دل سے آہ کی صورت میں پیچ و خم کھاتا ہؤا نکلتا ہے۔

غالب کہتا ہے کہ

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو کہ پنہاں ہو گئیں

مطلب یہ ہے کہ کیسی کیسی حسین صورتیں تھیں جو مرکر خاک میں مل گئیں سب تو نہیں ان میں سے کچھ لالہ و گل کی صورت میں پھر سے خاک سے پیدا ہو گئیں۔

(۵) بیدل کہتا ہے کہ

اے خوش آں جود کہ از خجلت وضع سائل
لب باظہار نیاز ند و بایما بخشند،

غالب کہتا ہے کہ

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

بیدل کا یہ شعر بھی فرد ہے:

برآستان رحمت مطلق یہ ید نیست
دستیکہ مطلب از لب سائل برآورد

اس حد تک نہ ہونی چاہئے کہ ناگوار گزرے اس لئے جدّت پسند طبیعت کو
لامحالہ متقدمین کا اتباع بھی کرنا پڑتا ہے، اور اسی سے نئی بات پیدا بھی کی

سب کچھ دیا ہوا تو اللہ کا ہے اور اسی کی رحمت مطلق کی بخشش ہے کہ اغنیاء اور اہلِ کرم کو داد و دہش کی توفیق عطا ہوئی اللہ تعالےٰ تو بن مانگے دے رہا ہے۔ اس لئے اخلاقِ الٰہیہ کا تقاضہ ہے کہ اہلِ کرم بھی سائل کو بن مانگے دیں۔ ایسا ہاتھ قطع کرنے کے لائق ہے جو سائل کا مطلب اس کے مُنہ سے کہلوائے۔ سوال میں احساسِ ذلت ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ سوال کی نوبت ہی نہ آئے۔

(۶) بیدل کہتا ہے کہ

عالم فریب دیدۂ عاشق نمی شود
آئینہ خیال تو صورت پرست نیست

کائنات عالم صورت ہے۔ جو عاشق حقیقت پرست ہیں وہ اس عالم صورت اور اس کی رنگینیٔ حسن پر فریفتہ نہیں ہوتے عالم صورت عاشق کو فریب نظر میں مبتلا نہیں کرسکتا۔ تیرے خیال حقیقت کا یہ آئینہ دل صورت پرست نہیں ہے۔

چوں نگہ در دیدہ صید اُلفت خویشی و بس
ورنہ ایں بزم تحیر حلقہ دامے بیش نیست

تیری نگاہ تیری آنکھ کے حلقہ میں ہی رہتی ہے، لیکن تجھے اس سے خارج میں ایک کائنات نظر آرہی ہے، حقیقت میں تو اپنی اُلفت کا آپ شکار ہے۔ "اُلفت" کے معنی جوڑنا، پیوستگی، تیری نگاہوں نے جو تاروں کا جال بچھا رکھا ہے اس میں کائنات اسیر ہے لیکن حقیقت میں جسے تو کائنات غیر سمجھ رہا ہے وہ ایک حلقۂ دام ہے جو تجھے پھانس رہا ہے۔ تو یہ سمجھتا ہے کہ میں کائنات کا شکاری ہوں اور کائنات کا شکار تو ہو رہا ہے کہ اس کے حسن صورت پر فریفتہ ہے۔

جاتی ہے، زبان کی ترقی اسی طرح ہوتی ہے۔خود بیدل کا نظریہ اس بارہ میں جو کچھ ہے وہ اس کی ایک غزل سے واضح ہو سکتا ہے۔

اصل میں یہ دونوں باتیں فریبِ نظر ہی ہیں، اگر تو نے یہ حقیقت سمجھ لی کہ تیری نگاہ تیری آنکھ سے جُدا نہیں اور جو کچھ تو مشاہدہ کر رہا ہے تیرے دیدہ دل کے تصورات ہی ہیں، باہر کچھ موجود نہیں، تو حقیقت میں اپنے آپ پر فریفتہ ہے۔ غلط فہمی سے تو اسے غیر سمجھ رہا ہے، یہ بزم تحیر تیرا ہی دل ہے،

ہرچہ گذشت از نظر نیست بروں از خیال
بیدل ازیں دام گاہ رفتہ کجی میرود

جو کچھ تیری نظر سے گزر رہا ہے تیرے خیال سے باہر نہیں تیرے ہی دل کے تصوّرات ہیں۔اور دامِ خیال سے باہر نکل بھی نہیں سکتے۔اگر تجھے گزرتے ہوئے یا جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو جاکر کہاں جائیں گے تیرے دل سے باہر نہیں جا سکتے۔

غالب کہتا ہے کہ

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقہ دامِ خیال ہے

بیدل اور غالب کے اشعار میں تخیل ایک ہی ہے:

(۷) در سایہ ابرو نگہت مست و خرابست
چوں تیغ ز سر در گذرد عالم آبست (بیدل)

تیرے ابرو کے سایہ کے نیچے تیری نگاہ مست و خراب ہے، ابرو تلوار کی مانند ہے جس میں آب ہے، یہ سمجھنا چاہیئے کہ ابرو عالم آب (میخانہ) ہے اور یہ پانی سر سے گزر چکا ہے اس لئے آنکھ مست و خراب ہے۔

بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیئے
مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے (غالب)

امروز ناقصاں بکمالے رسیدہ اند
کز خودسری بحرف سلف خط کشیدہ اند

"بھوں" نہایت غیر مانوس ثقیل لفظ واقع ہؤا ہے۔ غالب نے ابرو کو محراب مسجد سے تشبیہ دی ہے اس کے زیر سایہ یعنی سرپرستی میں خرابات یعنی چشمِ مست ہے، بیدل نے ابرو کو تلوار سے تشبیہ دی ہے اور اس کی آب کو شراب کے معنی میں لیا ہے مسجد کے زیر سایہ خرابات تو نہیں ہوتی مگر عالم آب میں جب کوئی غرق ہو تو خراب حال ہی ہو گا۔

(۸) یاد آزادیست گلزار اسیرانِ قفس
زندگی گر عشرتے دارد اُمید مُردن است (بیدل)
ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا (غالب)

یہ عالم اضداد ہے۔ غم کی تصدیق خوشی کے تصور کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ زندگی اور لطف زندگی کا احساس موت اور الم موت کے ساتھ ہی ہے۔

(۹) ای غنچہ دو دم تنگی دل مغتنم انگار
زیں غم کدہ ہر گاہ الم رفت طرب رفت

غنچہ خود طرب گاہ ہے۔ مگر کھلنے سے پیشتر تنگی دل محسوس کرتا ہے۔ اس غم کدہ دنیا میں خواہ تنگی دل ہی کیوں نہ ہو غنیمت سمجھنی چاہیئے کہ یہی دو دم ہے چند روزہ ہے۔

(۱۰) بیدل ایں انجمن وہم دگر نتواں یافت
دردہم مفت تماشاست طرب باید کرد
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیئے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن (غالب)

آج ناقص طبع خام خیال اپنے زعم ناقص میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ بس کمال کو پہنچ گئے۔ اور خود سری کی وجہ سے سلف کے کلام پر خطِ نسخ کھینچ رہے ہیں۔

---

(۱۱) سازِ ہستی غیر آہنگ عدم چیزے نداشت
ہر نوائی را کہ وا دیدم خموشی می سرود (بیدل)

نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے (غالب)

سازِ ہستی سے نغمۂ عدم کے سوا اور کچھ آواز کانوں میں نہیں آئی، جس کسی سریلی آواز کا میں نے تجزیہ کیا وہ خموشی کا راگ ہی الاپ رہی تھی، ہر ایک شخص جب تک زندہ ہے سرگرم سخن رہتا ہے۔ مگر موت کے بعد ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وجود دو عدم کے درمیان ہے۔ آغاز و انجام ہر ایک شے کا جو "ہست" ہے "نیستی" ہے۔

(۱۲) رنج دنیا، فکرِ عقبیٰ، داغ حرماں، درد دل
یک نفس ہستی بدوشم عالمے را بار کرد

ہستی یا زندگی تو ایک تار نفس سے وابستہ ہے، یہ رشتہ ٹوٹا تو انسان تمام دنیا جہاں کے بوجھ سے سبکدوش ہو گیا، جب تک زندہ ہے دنیا کا رنج اور عاقبت کی فکر اور داغ حسرت وحرماں اور دردِ دل برداشت ہی کرنا پڑے گا۔

بندگی، شاہی، گدائی، مفلسی، گردن کشی
خاک عبرت خیز ما صد رنگ تہمت می کشد

انسان خاکی امیر ہو یا فقیر، شاہ ہو یا گدا، غلام ہو یا آقا، مغرور ہو یا خاکسار غرض ہر ایک رنگ ایک تہمت ہی ہے جو آدمی اپنے سر پر دھر رہا ہے، زندگی چند روزہ ہے جب ہر ایک شے گذشتنی اور گذاشتنی ہے تو ان کو ان سے منسوب

انکار کاملاں ہمہ را نقل مجلس است
تا کس گماں برد کہ بہ معنی رسیدہ اند

یہ برخود غلط ترقی پسند جب کبھی مجلس آرائی کرتے ہیں تو ان کی بحث کا موضوع متقدمین پر حرف گیری ہی ہوتی ہے اور دانستہ یا نادانستہ وہ لوگوں پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ بس وہی حقیقت آشنا ہیں۔ اگر وہ ایسے ہوں تو متقدمین کی توہین کی ضرورت ہی کیا ہے؟ "مشک آنست کہ خود

کرتا تہمت ہی ہے۔ وہ کیا لایا تھا کہ اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ بندگی اور شاہی وغیرہ یہیں کی چیز تھی یہیں رہ گئی۔

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
تھوڑی سی زندگی میں بھلا کوئی کیا کرے (غالب)

(۱۳) بیدل من و آں دولت بیدار سر فقر
کز نسبت او چینی خاموش سفال است (بیدل)

اور لے آئیں گے بازار سے گر ٹوٹ گیا
کاسۂ جم سے میرا جامِ سفال اچھا ہے (غالب)

(۱۴) من و ساز دکاں خود فروشیہا چہ حرف است ایں
جنوں ایں فضولی در سر منصور می باشد (بیدل)

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں (غالب)

(۱۵) گر تو نگشائی زخواب تا ز مژگاں چارہ نیست
از ہمیں چشمیکہ داری نور ایں دیدہ اند (بیدل)

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے (غالب)

ہو یہ نہ کہ عطار گوید "علم و ہنر ایسی شے نہیں کہ کسی کے کہنے سے علم و ہنر ہو جائے وہ ثابت شدہ حقیقت ہونی چاہیئے۔ یہ مرض عام ہے جس سے خواص بھی نہ بچ سکے، غالب میں یہ تعلی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ اور عوام ضرور اس سے مرعوب ہو جاتے ہیں، یہ کسی بات کو بزور منواتا ہے اور جب ایک دفعہ لوگوں نے مان لیا تو تقلید آیہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور پھر شہرت اور خوش اعتقادی بھی پیدا ہو جاتی ہے مولانا شبلی کے علم و فضل سے کون منکر ہے مگر آپ نے بیدل کی طرف مناسب توجہ نہیں فرمائی۔ غور کرنا چاہیئے کہ آپ کا ممدوح غالب ہے اور غالب کے ممدوح جلال اسیر اور ظہوری اور بیدل؛ اور بیدل کا سب سے بڑھ کر مداح ہے۔ اب اگر مولانا ان حضرات کی مذمت بمقابلہ غالب کریں اور یہاں تک لکھ دیں کہ انھوں نے فارسی شاعری کو بگاڑ دیا اور غالب نے ان کی پیدا کردہ خرابی رفع کی تو اس صغریٰ و کبریٰ کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے جسے بیدل نے واضح کیا ہے کہ "تا کس گمان برد کہ بہ معنی رسیدہ است" اور اس حد تک معنی سے واقف ہے کہ غالب بھی نہیں، یہ ممکن ہے کہ مولانا ہی کی رائے صائب ہو اور مولانا بیدل کی شاعری ہی پر تنقید فرما رہے ہیں مگر بیدل صرف شاعر ہی نہیں بلکہ حکماء اسلام میں اس کا پایہ اتنا بلند ہے کہ ہمارے علامہ اقبال کی یہ رائے ہے کہ برگساں سے فلسفی کے افکار بھی بیدل کے کلام میں ہیں۔

نکات

نکات بیدل میں زیادہ تر بعض فقرات کی شرح ہے جو "چہار عنصر" میں واقعات کے ضمن میں بیدل نے لکھے ہیں۔ یہ شرح بھی مثنوی "عرفان" اور "طلسم حیرت" اور "طور معرفت" کے ابیات اور کچھ غزلیات، قطعات اور رباعیات سے کی گئی ہے۔ اس طرح نکات نظم و نثر میں بیان کئے گئے ہیں۔ فارسی علم ادب میں نثر جو عموماً مقفیٰ عبارت ہی ہوتی ہے جا بجا نظم سے مزّین کی جاتی ہے گلستان سعدیؒ اس کی واضح مثال ہے۔

نکات کے شروع میں بیدل لکھتا ہے کہ:

"اگر منکر نبوّت نۂ باخطرات جز بہ تعظیم پیش میا و اگر بہ تجلی ایمان داری ہیچ جانب چشم بے ادب مکشا"

اگر تو نبوّت کا منکر نہیں تو جو بھی تیرے دل پر وارد ہوتا ہے اس کا احترام واجب ہے اور اگر تیرا ایمان ہے کہ "اللہ نور السمٰوات والارض" اور اسی نور کی تجلیات مشاہدہ ہو رہی ہیں تو کسی طرف بے ادب نگاہ نہ کر۔

اس نکتہ میں بیدل "وحی" کی حقیقت بیان کرتا ہے، "نبوت" مشتق ہے لفظ "نبا" سے، معنی خبر دینا، خبر ہر ایک زمانہ کے متعلق ہو سکتی ہے۔ اس لئے نبی مخبر صادق ہوتا ہے اور اخبار صحیحہ نبوت ہے، قلب انسانی پر

جو کچھ وارد ہوتا ہے یا اس سے واردات کے بعد خیالات پیدا ہوتے ہیں اگر اس میں نفسانی تمناؤں اور آرزؤں کی آمیزش نہ ہو تو اس کو اصطلاح میں الہام یا القا کہتے ہیں۔

علماء اسلام اور دیگر علماء طبعین والہین نے وحی پر بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن "چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند" بات اصل میں یہی ہے جیسے بیدل تحقیق اور تقلید کے ضمن میں بیان کرتا ہے کہ:

انکاری غیر باش تصدیق ایں است واکرد بدل دلیل توفیق ایں است
تبعیت خلق از حقت غافل کرد ترک تقلید گیر، تحقیق ایں است

عموماً لوگ سُنی سنائی باتوں پر اعتبار کرتے ہیں اور وحی بطور حقیقت بیان کرتے ہیں، لیکن اپنی تحقیق سے تصدیق نہیں کرتے۔ بعض تو یہ کہتے ہیں کہ "وحی" صرف انبیاء کو ہوتی ہے اور انبیاء کو فوق البشر تسلیم کرتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں کیونکہ قرآن میں ایک ننھی سی جان شہد کی مکھی کی وحی کا بھی مذکور ہے۔ اگر اس مفروضہ کو تسلیم کیا جائے تو ہر ایک شہد کی مکھی نبی ہے، آیات قرآن سے واضح ہوتا ہے کہ "وحی" تحریکاتِ فطریہ ہے۔ اور اس میں غلطی اور غلط فہمی کا امکان نہیں، تمام کائنات میں ہر ایک شے "وحی" کے تحت ہی کام کرتی ہے اور کبھی غلطی نہیں کرتی لیکن انسان کی حالت کچھ مختلف ہے۔ وہ غلطی بھی کرتا ہے اور ترقی بھی کرتا ہے، دیگر اشیاء نہ غلطی کرتی ہیں نہ ترقی، اس لئے غلطی اور ارتقاء لازم و ملزوم ہیں۔ واجب ہے کہ انسان غلطی کرے۔ ورنہ وہ دیگر حیوانات کی طرح ہو گا۔ انسان کو بھی وحی اسی طرح ہوتی ہے جس طرح دیگر اشیاء کو لیکن انسانیت کی مناسبت کے لحاظ سے انسان کو وحی بلفظہ ہوتی ہے اور کوئی خیال انسانی قلب میں بلا حروف پیدا ہی نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔

"وحی" کا سرچشمہ صحیفہ کائنات ہے جس کی تعریف ہے "لاریب فیہ"

جس میں کوئی اُلجھن نہیں اور اسی اُلجھن کا نتیجہ تذبذب اور شک وشبہ ہوتا ہے۔ اس کی تائید قرآن سے ہوتی ہے کہ "اتل ما اوحی الیک من الکتٰب" (تلاوت کرو جو تجھے کتاب (کائنات) سے وحی ہوتا ہے) یہ وہ حقیقت ہے جسے ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے، اس لئے کہ ہر ایک شخص کے مشاہدہ اور تجربہ میں یہ بات آتی ہے۔ بلاشبہ ہم کسی شے کی کنہ کو نہیں پہنچ سکتے، لیکن جو کچھ بھی مشاہدہ ہو رہا ہے اور ہر ایک شخص مشاہدہ کر رہا ہے اور ایک ہی طرح مشاہدہ کرتا ہے اس کا انکار نہیں ہو سکتا۔ علامہ محمود شبستری "گلشن راز" میں کہتا ہے کہ:

ہر آں کو را کہ جانش در تجلی است
ہمہ عالم کتاب حق تعالےٰ است

جس کسی کا باطن نورانی ہے وہ جانتا ہے کہ تمام کائنات کتاب الٰہی ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ہر ایک شخص کا باطن خواہ اس معنی میں نورانی نہ ہو جو علامہ ممدوح کے ذہن میں ہے وحی کی حقیقت سے فطرتاً واقف ہے خواہ اس کا اسے علمی شعور نہ ہو جیسے کہ دیگر حیوانات کو نہیں ہوتا۔ چونکہ ہم نے اس موضوع پر علاحدہ بحث کی ہے اس لئے ہمیں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے سر دست ہم بیدل کا نظریہ بیدل کے الفاظ میں واضح کرتے ہیں۔ لیکن اتنا سمجھ لینا مقدم ہے کہ ہمارے پاس تحقیق کا ذریعہ صرف بصر و بصیرت ہے، ایسی بات جوان سے باہر ہو یا جس کی تصدیق بصر و بصیرت نہ کرے محض "وہم محال اندیش" بیدل کے لفظوں میں ہے۔ بیدل نکات میں لکھتا ہے کہ :-

"در عالم آثار کثرت بساز انزوا پرداختن، سرمایہ فرصت در باختن است، اگر چراغ بینش قابلیت نوری دارد جز در انجمن مفروز، تا بافسوں خیال از تجلی کماہی چشم نپوشی، و در حضور آباد

کرشمۂ جمال بکسب حرماں نکوشی "

فرصت داری عجز آگہی کار مبند　　برآئینہ ات تہمت زنگار مبند

ہر چند بود یک مژہ واکردن چشم　　بازاست در حضور نہار مبند

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ اس کائنات میں جو محسوس ہو رہی ہے حقیقت جلوہ گر ہے اور یہ حقیقت اس سے باہر متصور نہیں ہو سکتی۔ یعنی معرفت انہی صورتوں کے صحیح تصوّر پر موقوف ہے۔ اس لئے اسے مشاہدہ کرتے ہوئے دور از کار توقعات اور اوہام سے ذہن خالی ہونا چاہیئے۔ اگر ہم اس عالم کو دیکھتے ہوئے کسی اور عالم اوہام میں سرگرداں ہوں تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ تحقیق سے ہم بہت دور ہیں۔ اگر تیری آنکھ میں نور بصیرت ہے تو اس چراغ بینش کو اسی انجمن عالم کثرت میں روشن اور اس کی روشنی میں کائنات کا مشاہدہ کرنا چاہیئے اور قیاس و گمان و وہم سے قلب کو پاک و صاف رکھنا چاہیئے۔ قلب انسانی مثال آئینہ ہے اس لئے اگر آئینہ کدورت اوہام سے صاف ہوگا تو کائنات خارجی کا عکس بھی اسی نسبت سے قلب میں صاف ہوگا۔ اور اگر تو نے ایسے قیاسات وغیرہ سے زنگار آلود کر دیا تو عکس بھی اسی رنگ میں دیکھے گا، اور یہ تیرے اپنے قیاسات اور اوہام ہی ہونگے جو خیالات خام اور باطل ہیں اس کے بعد جو کچھ تیرے قلب پر صحیح تذکر و تفکر سے وارد ہوگا وہ حق ہے۔ جب اللہ ہی نور السموات والارض ہے تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر تو آنکھیں کھول کر مشاہدہ کرے گا تو اسی نور کی تجلیات کے حضور اپنے آپ کو پائے گا اور اگر قیاسات وغیرہ میں اُلجھ گیا تو حضوری سے دور بھٹک کر گمراہ ہو گیا۔ اس "نکتہ" کی تشریح اس کے بعد دوسرے "نکتہ" میں اس طرح کی گئی ہے:-

"از فرط گرسنگی کہ حرارت غریزی بہ وداع قوامی دامن می چنید صاحب ریاضت اشکال غریبہ می بیند یعنی بخارات کہ

مادہ تخیل است ہرگاہ بدماغ صعود می نماید تمثال ہائے عالم خواب در عین بیداری نقاب می کشاید، ہمچناں ہنگام نزع نیز صور مثالی بر طبائع منکشف می گردد و آں از باقیات عالم خیال ست وگرنہ در نفس الامر تحقیق آں دشوار و محال مثل شعلہ چراغیکہ چوں روغنش کم شود سراپا در میگردد روشن تر میگردد تا بانک فرصتے بمیرد، چوں غلبہ جوع موجد صفراست و غلبہ صفرا مادہ ایجاد سودا و جمعی راکہ با مبداء توجہ است از سطور ایں بخارہا سطور حقائق و معانی می خوانند، و فرقہ را از حقیقت بے خبر یست اشکال دیو و جن میدانند، چہ دودہا ازیں آتش نامشتعل متصاعد نگردیدی و چہ سواد ہا کہ ازیں صفرائی سوختہ بطوفاں نرسید، اگر ہوشیست باید فہمید کہ غیر اشیائے محسوسہ معین ہرچہ در خیال پرتو انداز دو اہمہ سودائی است و خلاف قاعدہ اتفاق آنچہ در نظرہا مشکل یابند غبار بینائی ہے"

خلقیست دریں جنوں سرائے نیرنگ — زندانی اختراع چندیں فرہنگ
من بندۂ آنکہ در ادب گاہ ثبات — جوعش مجنوں نساز د وسیری ازنگ

بیدل کا نظریہ تحقیق یہ ہے کہ صحیح حواس اور صحیح دل و دماغ، صحت جسم کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ چنانچہ ایک رباعی میں کہتا ہے کہ

گر علم و گر اقتباس دریافتۂ — در انجمن حواس دریافتۂ
بردامن جسم پاک تحقیر مدوز — حق را بہمیں لباس دریافتۂ

تمام علوم اور حکمت اسی خاکی جسم کے ساتھ ہی ہم پر منکشف ہوئے اور ہو رہے ہیں، یہی حواس ہیں اور یہی قلب اگر یہ نہ ہوں تو ہمیں نہ کسی بات کا شعور ہو نہ علم۔ اس لئے جسم کو حقیر شے نہ سمجھنا چاہیئے، ہمیں "حق" کی معرفت اسی لباس جسم میں ہو رہی ہے جو ہم نے اور تمام مادی کائنات

نے پہن رکھا ہے۔ اور یہ لباس صورت کتنا حسین اور کتنا رنگین ہے اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ نکات ہی میں لکھتا ہے کہ:۔

ریاضت صفائی باطن می آرد بشرط اعتدال، وضعف بر قواے می گمارد بافراط کمال، مدعا ازیں کسب مواد فاسدہ را باصلاح آوردن است، نہ اجزائے صالح را نیز فاسد کردن، ایں جا زنگار را از طبیعت زدودن است، نہ آئینہ را بمشق صیقل فرسودن، بحکم قدر دانی وجود از انبیاء ہیچ کس بریاضات شاقہ نساخت الا بقدر را اصلاح مزاج و بخورد خود نیز نپرداخت مگر بمقدار ضرورت احتیاج "

بنیاد جسد کہ کارگاہ اسما ست — روزی دو ز حکمت طبعی برپا ست
برصوم و صلوٰۃ برمیفزا کاینجا — تعدیل بہر امر کمال عرفا ست

ریاضت کی غرض اتنی ہے کہ باطن میں صفائی پیدا ہو اور اس کے لئے بھی اعتدال شرط ہے، اگر اعتدال سے بڑھے تو افراط میں الجھ کر رہ جاؤ گے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے قوٰے میں ضعف پیدا ہو جائے گا، ریاضت کی غرض و غایت یہی ہے کہ فاسد مادہ رفع ہو اور تزکیہ نفس و تصفیہ قلب ہو، یعنی جو خرابی باطن میں ہے اس کی اصلاح ہو جائے، نہ یہ کہ جو اجزا صالح ہیں ان کو فاسد بنایا جائے۔ طبیعت سے زنگ کدورت رفع کرنا مقصود ہے، نہ کہ مشق صیقل سے آئینہ کے وجود کو نابود کرنا اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ انبیاء سے بڑھ کر ریاضت شاقہ اور مجاہدہ حاد کسی نے نہیں کیا۔ لیکن ان نفوس قدسیہ کو بھی اس وجود کی فطری ضرورت کا احساس تھا۔ جس حد تک اصلاح مزاج کا تقاضا تھا انھوں نے خورد و نوش و خواب کی احتیاج میں کمی کی۔ اس جسد انسانی کی بنیاد ہی اسی سے قائم ہے۔ چند روزہ زندگی بھی اسی خورد و نوش اور ضروریات سے بسر ہو رہی ہے اس لئے تیرے لئے یہی مجاہدہ کافی ہے کہ ارکان اسلام صوم و صلوٰۃ پر کچھ اور زیادہ نہ کر، کیونکہ تعدیل

ہر ایک امر میں اہلِ معرفت کا کمال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رہبانیت میں حظِ نفس ہے اس لئے نفس انسانی رغبت سے کرتا ہے، اعتدال قائم رکھنا نہایت سخت مجاہدہ ہے۔ اور اسے قائم رکھنا سخت مشکل ہے۔ اس تشریح کے بعد اس "نکتہ" زیرِ بحث پر غور کرنا چاہیئے۔ بیدل کہتا ہے کہ "بھوک کی شدّت سے حرارت غریزی قویٰ کا دامن چھوڑ دیتی ہے۔ جب قوےٰ کمزور ہوتے ہیں تو صاحب ریاضت عجیب و غریب شکلیں دیکھتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بخارات مادہ تخیّل ہیں جب یہ بخارات دماغ کی طرف چڑھتے ہیں تو عین بیداری میں عالمِ خواب کی کیفیّت پیدا ہو جاتی ہے صورتیں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح نزاع کی حالت میں بھی مرنے والا وہ تصورات جو اس کے ذہن میں ہی محفوظ ہوتے ہیں مشاہدہ کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ دیکھتا ہے وہ اس کے اپنے خیالات ہی کا عکس ہوتا ہے، نفس الامر میں اس کی تحقیق محال ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے چراغ جب اس میں تیل ختم ہونے کو ہوتا ہے تو سنبھالا لیتا ہے۔ اور یک لخت پوری روشنی دیتا ہے مگر تھوڑی دیر کے بعد گل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی سنبھالا لیتا ہے، اور اس میں زندگی کے آثار پوری قوت کے ساتھ محسوس ہوتے ہیں مگر جلد ختم ہو جاتا ہے، بھوک کی شدّت سے صفرا پیدا ہوتا ہے اور غلبہ صفرا سے سودا کا زور ہوتا ہے، وہ لوگ جن کی توجہ خدا کی طرف لگی ہوتی ہے جب بخارات دماغ کی طرف چڑھتے تو خیال کرتے ہیں کہ ہم پر معانی و حقائق کا انکشاف ہو رہا ہے اور ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے اور جو حقیقت سے بے خبر ہیں وہ دیو اور جن اور پری دیکھتے ہیں، اس آتش نامشتعل سے کتنا دھواں اٹھتا رہتا ہے جو دماغ کو تاریک کرتا ہے اور اس صفرائی سوختہ سے کتنا سودا پیدا نہیں ہوتا جو لوگوں کے سروں پر کھیلتا ہے، اگر ہوش و حواس درست ہیں تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جو کچھ بھی غیر اشیاء محسوسہ و معینہ خیال میں منعکس ہوتا ہے سب سودائی وہم ہے اور خلاف

قاعدہ جو کچھ نظر آئے وہ غبار بینائی ہے۔

اس عالم نیرنگ میں جس کو "بیدل جنوں سرا" سے تعبیر کرتا ہے لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں اور ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں جو شراب جنوں کے نشہ کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ بے پر کی اڑاتے ہیں جس کی تصدیق مشاہدہ اور تجربہ سے نہیں ہوتی، بیدل کہتا ہے کہ میں تو اس اہل نظر محقق کا غلام ہوں جو اس "ادب گاہ ثبات" میں اپنے ہوش و حواس درست رکھتا ہے، اگر بھوکا ہے تو مجنوں نہیں بنتا اور اگر پیٹ بھر کر کھاتا ہے تو رنگ رلیاں نہیں مناتا۔ ارشاد قرآن ہے کہ

ماکذب الفواد ما رائ، ماذاغ البصر وماطغیٰ لقد رایٰ من ایٰت ربہ الکبریٰ۔ وما لھم بہ من علم ان یتبعون الا الظن و ان الظن لا یغنیٰ من الحق شیا۔

(رسول) نے جو کچھ مشاہدہ کیا اس میں اس کے دل نے کچھ جھوٹ نہیں ملایا، اس کی نظر نہ کسی اور طرف بہکی اور نہ اپنے اصلی مقام سے اچٹی، کچھ شک نہیں کہ اس نے اپنے پروردگار کی قدرت کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے، (مشرکین جو کچھ کہتے ہیں) ان کو اس کی تحقیق تو نہیں وہ تو نری اٹکل پر چلتے ہیں اور اٹکل کو حق سے دور کی نسبت بھی نہیں۔

(۲۷)

یہ نکتہ ازبر کرنا چاہیئے۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد
صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

"ماکذب الفواد ما رایٰ" کا مفہوم اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیئے۔ یہ "کذب" کیا ہے جو وہ نفسانی آرزو نفس یعنی مشاہدہ میں ملا دیتا ہے، خواہشات نفس، تمنا، دور از کار توقعات، قیاسات ہیں۔

آں حضرتؐ کے "مقام محمود" کی بلندی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے

کہ اس جادہ ارتقاء کے ہر ایک مرحلہ اور ہر ایک منزل پہ "انا عبداللہ" ہی کہتے ہیں، اور بار بار فرماتے ہیں کہ "ما عرفناک حق معرفتک" اسی سے معلوم ہؤا کہ آپ کے ظرف میں کتنی وسعت تھی، بیدل نے مثنوی "محیط اعظم" میں کل انبیاء کی کیفیّت بیان کی ہے کہ خمخانہ وحدت سے ہر ایک نے بقدرِ استعداد پیمانہ لیا اور اپنے متبعین کو بھی اسی پیمانہ سے پلایا۔ اُمت نوح تو اتنی بدمست ہوئی اور عالم آب میں اس حد تک غرق ہوئی کہ پھر نہ اُبھری۔ حضرت موسیٰ نے ساغر "تشبیہ" کو دور دیا۔ اُمت موسیٰ اسی مادی دنیا کی نیرنگی میں مدہوش رہی۔ حضرت عیسیٰ نے قدح تنزیہہ حواریوں کو پیش کیا۔ یہ منصور کی طرح "انا الحق" کہتے ہیں۔ آں حضرتؐ نے تشبیہ اور تنزیہہ یعنی کثرت اور وحدت دونوں کی رعایت کی۔ کثرت میں وحدت کا جلوہ دکھایا اور اچھی طرح ذہن نشین کر دیا کہ ممکنات کبھی واجب کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ "لیس کمثلہ شی" میں تنزیہ ہے اور "ھو السمیع بصیر" میں تشبیہ، اس لئے اسلام جس کے ساتھ آں حضرتؐ مبعوث ہوئے کامل دین ہے۔

بیدل نے ان نکات میں نفسیات کا ایک اہم مسئلہ حل کیا ہے، وہ یہ کہ جو کچھ خارج میں محسوس ہوتا ہے وہ معین و مشخص ہے ہر ایک شخص اشیاء کو ایک ہی طرح اور ایک ہی صورت میں مشاہدہ کرتا ہے بشرطیکہ اس کے حواس درست ہوں۔ اس لئے اس کتاب کائنات میں کوئی "ریب" کوئی اُلجھن، کوئی شک یا شبہ نہیں، انھیں کا عکس یا "ظل" حواس کے ذریعہ قلب انسانی پر پڑتا ہے خواہ بالارادہ ہو یا بلا ارادہ ہے۔ ناممکن ہے کہ ہم آنکھیں رکھتے ہوئے سورج کو تو دیکھیں اور اس کی روشنی اور اس کے ماحول سے چشم پوشی کریں۔ تمام ارض و سما ایک ہی نظر میں ہمارے آئینہ دل پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ اور ایسے ثبت ہوتے ہیں کہ یہ انسانی طاقت سے باہر ہے کہ ان کو محو کر سکے۔ یہ عکس ہمیشہ کے لئے قلب میں محفوظ ہو جاتا ہے، اگر یہ عکس من و عن ایسا ہی

ہے جیساکہ خارج میں ہے۔ یعنی ہمارے ذہنی تصوّرات اور خارجی اشیاء جن کے یہ تصوّرات ہیں ایک ہی جیسے ہیں جسے اصطلاح میں "عین" کہتے ہیں تو یہ "حق" ہے اور اہلِ ذکر و فکر جانتے ہیں کہ یہ "باطل" نہیں۔ اگر کوئی باطل پرست یہ کہے کہ یہ "مایا" اور "فریب نظر" اور "ہیچ" ہے تو بیدل ایک رباعی میں کہتا ہے کہ "از باطل سخن حق کہ باور دارد"۔ جو شخص کائنات کو باطل کہتا ہے وہ خود بھی تو باطل ہے اس لئے کہ کائنات کا ایک جزو وہ بھی ہے۔ اور بقول بیدل "باطل از باطل بروید حق زحق"۔ باطل سے باطل ہی پیدا ہوگا، اس باطل کا جو دعوٰے ہے باطل ہی ہوگا۔ بیدل مثنوی "عرفان" میں کہتا ہے کہ ان باطل پرست لوگوں کو اتنا شعور نہیں کہ "یقینے خفتہ در ہر پردہ ظن" وہ کچھ بھی کہتے ہیں یقین کے ساتھ ہی کہتے ہیں۔ اگر کہتے ہیں کہ یہ عالم باطل ہے تو ان کو اتنا تو شعور ہونا چاہیئے کہ وہ سچ کہتے ہیں یا جھوٹ، اور اگر کہیں کہ سچ کہتے ہیں تو یہ حق اس بینہ جہاں باطل میں کہاں سے آگیا۔ غرض انسان جو کچھ بھی کہے یا تصوّر کرے اس کی تہ میں "حق" کی موجودگی واجب ہے اور اگر نہ ہو تو یہ محض وہم محال اندیش ہے۔

بیدل کا نظریہ تحقیق یا مشاہدہ یہ ہے کہ ہر ایک شخص کی تحقیق اس کی اپنی حد نظر ہے۔ ایک رباعی میں یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ سایہ خاک پر تو سیاہ نظر آتا ہے لیکن پانی میں تمثال ہے جس نے سایہ خاک پر دیکھا اس نے اسے سیاہ کہا۔ وہ بھی سچا ہے اور جس نے پانی میں دیکھا اس نے تمثال سے تعبیر کیا، یہ بھی سچ کہتا ہے دونوں حالتوں میں سایہ ایک مشترک شے ہے، تنازعہ اگر کچھ ہے تو اس کی صورتوں میں ہے تو یہ شاہد کی حد نظر پر موقوف ہے۔ اختلاف کی وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ ایک ہی شے کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ باطل دیکھتے ہیں۔ اس حد تک مشاہدہ عین خارجی اشیاء اور ذہنی کے مطابق ہے۔ اسی کا شعور "علم" سے موسوم ہوتا

ہے چنانچہ بیدل لکھتا ہے کہ

چیست علم؟ اصل قدرت بیچوں | نظم جمعیت ظہور و بطون
حسن مرأت عالم و معلوم | نور تمیز حاکم و محکوم
نزد اہل حقیقت و ایجاد | ہیچ چیزے بغیر علم نزاد
ہرچہ بینی ز مفرد و ترکیب | دارد از علم جوہر ترتیب

علم کیا ہے ؟ قدرت بیچون کی اصل، جو ظاہر یعنی آفاق یا خارج میں ہے اور جو کچھ ذہن یا قلب انسانی میں اس کا عکس ہے ان میں عین مطابقت کا شعور علم ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں عالم اور معلوم دونوں جلوہ نما ہوتے ہیں، یعنی جاننے والا عالم اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اسے کسی شئے کا علم ہو اور وہ شئے معلوم اسی حالت میں کہلا سکتی ہے جب اسے جاننے والا بھی کوئی ہو۔ اس لئے عالم و معلوم میں ربط علم کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک ہمیں کسی شئے کا علم نہ ہو وہ بمنزلہ عادم ہے۔ اس لئے ہر ایک شئے معلومہ کا ظہور یا انکشاف یا احساس یا ادراک علم کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے، نتیجہ واضح ہے ہر ایک شئے خواہ مفرد ہو یا مرکب، علم ہی سے اس کی حقیقت ہے جس سے وہ مرتب ہوئی ہے۔

اس نظم کا اوّل اور آخری بیت غور طلب ہے۔ یہ کہ اس کائنات کا نظم و نظام ایسا پختہ ہے کہ اسے کوئی طاقت غیر اللہ توڑ نہیں سکتی۔ اور یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارا پیدا کردہ نہیں۔ اسی کائنات سے ہمارے تمہارے علوم ماخوذ ہیں اگر یہ باطل ہو تو ہمارے علوم بھی باطل ہیں۔ بقول بیدل "باطل از باطل بروید حق ز حق"۔ اس لئے اس کائنات کی پیدائش میں بھی علم ہی کارفرما ہے، جسے لسان مذہب میں علم الٰہی کہتے ہیں۔ اسی آئینہ کائنات میں اللہ تعالےٰ عالم الغیب والشہادت کی قدرت اور نمود کائنات معلومہ کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ تصوّف کی جان اور اصل اصول ہے۔

اس لئے اشیاء محسوسہ، معینہ و مشخصہ کے سوا اگر کچھ نظر آئے تو بقول بیدل محض سودا ہے۔ ہم نے "چہار عنصر" میں سے بعض واقعات کا حوالہ دیا ہے جو بیدل نے اپنی سرگزشت کے ضمن میں قلم بند کئے ہیں۔ اگر جنات بھی ایک مخلوق ہیں اور موجود ہیں خواہ وہ غیر مرئی ہوں تو بحث تحصیل حاصل ہے۔ اور اگر نہیں تو محض قوت واہمہ کا کرشمہ ہے، اور بیدل بھی یہی کہتا ہے کہ ایسی مخلوق ضرور موجود ہے۔ لیکن اکثر اوقات لوگ عالم اوہام میں وہ کچھ تصور کرتے ہیں جس کی تحقیق نفس الامر میں نہیں ہو سکتی۔ یہ محض جنون اور واہمہ کا غلبہ ہے۔ بہر حال بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ جو کچھ خارج یا آفاق میں موجود ہے خواہ اس کا وجود مرئی یا غیر مرئی ہو اگر اور کچھ نظر آئے تو باطل ہے، یاد رہے کہ "باطل" کا مفہوم "محض عدم" نہیں جس کا تصور انسان کر ہی نہیں سکتا۔ باطل وہ ہے جو بے نتیجہ اور عبث ہو جس سے نہ کچھ پیدا ہوتا ہے اور نہ پیدا شدہ کو ٹھہرا سکتا ہے۔

بیدل نکات میں کہتا ہے کہ :-

"گفتگوئے ارواح و مثال بیرون اعتبارات جسمانی جہل است، دگیر و دار عالم اجسام بے مادہ مثال و ارواح معطل، جسم را قبل از آثار پیدائی در حقیقت۔ روح مختفی فہمیدن است چوں کیفیت کوزہ در گل، و روح را بعد از نشانئ ظہور، اجزائے جسم منزہ می دیدن، چوں صورت خیال در دل، تا حضور صور معرض جلوہ نیاید معنی ہیولا در جہاں صور باطن اشکال بودن است۔ و صورت مرتبہ ہیولا معمائے ہماں کیفیت کشودن، اگر ہیولا بے صورتے متصور است صور از کجا می جوشد، و اگر صورت از لباس قدرت عاریست ہیولا را کہ می پوشد"

ہر چند خاکسار ہیولائے گل است ۔۔۔ گل نادمیدہ ساز ہیولائے خاک شد
رمز صفائے آئینہ ہا واشگافتم ۔۔۔ اسم کدورت است کہ از سنگ پاک شد

چوں باز عرض نوبت تنگار وا رسید آئینہ را بسنگ ہماں اشتراک شد
خورشید اگرچہ شب بسک بال می زند دروانہ دیدہ کہ با وج سماک شد
یک رشتہ بود پا و سرے اعتبار دہر خلقے بہ پیچ و تاب توہم ہلاک شد

اس نکتہ کا مفہوم یہ ہے کہ ارواح اور مثال کے بارہ میں بحث اس مادی کائنات سے باہر بالکل بے معنی بات ہے اور مادہ یعنی عالم اجسام میں جو یہ گیر و دار کا شور برپا ہے روح کے بغیر متصور نہیں ہو سکتا۔ یہ سمجھنا چاہیئے کہ ایک شے یا حقیقت جسم اور روح ہے جسم کے ظہور سے پہلے یہ جسم روح مخفی تھی یعنی غیر مرئی یا پوشیدہ تھی، جیسے کیفیت یا صورت کوزہ مٹی میں ہو۔ مٹی میں یہ قابلیت ہے کہ اس سے کوزہ بنتا ہے۔ اور اگر یہ قابلیت نہ ہوتی تو کوزہ ظہور میں نہ آسکتا، اسی طرح روح میں اجزاء جسم یا مادہ پوشیدہ ہیں جو ظہور کے بعد مشہود ہوئے، جیسے صورت خیال دل میں، مطلب یہ ہے ایک قابلیت "بالقوہ" موجود تو ہوتی ہے مگر ہمیں اس کا شعور یا علم اس وقت ہوتا ہے جب وہ ظہور میں آئے جیسے ایک دانہ میں درخت، جب یہ دانہ زمین میں بویا جاتا ہے اور پھوٹتا ہے تو رفتہ رفتہ یہ قابلیت شجر کی صورت میں رونما ہوتی ہے یعنی یہ قابلیت اب "فعل" میں آئی اور ہمیں معلوم ہوا کہ پہلے پوشیدہ یا "بالقوہ" دانہ میں موجود تھی، اس لئے ہر ایک شے جو بالقوہ ہو یا بالفعل ضرور ہے کہ اس کا ہیولا پہلے موجود ہو۔ "عدم موجود گردد ایں محال است" عدم موجود نہیں ہو سکتا، یہ ناممکن ہے لیکن ہیولا بھی ایک قابلیت صورت ہے۔ یعنی صورتیں اس میں بالقوہ موجود ہیں اور خود بھی بے صورت نہیں۔ اگر ایسی صورت ہوتی تو یہ تمام صورتیں کہاں سے آئیں ظاہر ہے کہ ہیولا ہی کی پیداوار ہیں۔

اگرچہ آدم کی پیدائش طین سے ہوئی۔ یہ ضرور ہے کہ "طین" میں قابلیت یا بالقوہ آدم موجود تھا جب یہ قابلیت فعل میں آئی تو آدم کا

ظہور ہوا۔ قرآن میں بھی ہے کہ انسان کی تخلیق کی "ابتدا" طین سے ہوئی، آدم ظہور میں نہ آیا تھا لیکن "طین" پہلے موجود تھی، لفظ "بدا" قرآن میں "خفی" کے مقابل استعمال ہوا ہے۔ یعنی جو شے "خفی" تھی اس کا ظہور ہوا، قانون فطرت یہ ہے کہ ہر ایک شے جو ظہور میں آتی ہے اس کا مادہ یا "ہیولا" پہلے موجود ہوتا ہے۔ اس لئے بیدل کہتا ہے کہ

ہیچ شکلے بے ہیولٰے قابلِ صورت نشد
آدمی ہم پیش ازاں کآدم شود بوزینہ بود

اہلِ علم و حکمت کے نزدیک یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ کوئی شکل بلا ہیولا قابلِ صورت نہیں ہوتی، اس لئے آدمی بھی پیشتر اس کے کہ آدم سے موسوم ہو بندر تھا۔ بیدل نے اس شعر میں ایک نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ ہیولا بھی ایسا ہونا چاہیئے جس کی صورت اس شکل سے ملتی جلتی ہو جو اس سے قانون ارتقاء کے تحت پیدا ہو۔ آدمی طبقہ حیوانات میں ممتاز درجہ پر نظر آتا ہے اس لئے اس کا ہیولا اس طبقہ میں ایسا ہونا چاہیئے جو اس سے بہ نسبت دیگر حیوانات زیادہ تر مشابہ ہو اور وہ بندر ہے۔

مسئلہ ارتقاء پر بیدل نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ سر دست ہم صرف بعض نکات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ درحقیقت جسے روح اور مثال اور جسم کہتے ہیں ایک ہی حقیقت کے مختلف نام اور اس کے ارتقائی درجات ہیں۔ عالم اجسام یا مادی دنیا صرف عالم صورت ہے۔ "باصرہ" میں رنگ اور روپ، "لامسہ" میں سختی و نرمی، سردی و گرمی اور علیٰ ہذا القیاس لیکن ان صورتوں میں "حقائق" رونما ہوتے ہیں، اور یہ اصل شے ہیں، "حقائق مجردہ" کا احساس تو انسان کو ہو ہی نہیں سکتا۔ انسان کو حواس اسی لئے دئے گئے ہیں کہ کسی نہ کسی صورت میں ان کا احساس ہو۔ ناممکن ہے کہ انسان کو بلا صورت حقائق اشیاء کا علم ہو۔ اس لئے مجرد معانی دل میں بلا حروف

محسوس نہیں ہو سکتے۔ اور کوئی خیال بلا صورت مثالی ذہن میں متصور نہیں ہو سکتا۔
بیدل نکات میں روح و مثال و جسم پر تفصیلی بحث کرتا ہے۔ روح اصل حقیقت ہے لیکن یہ غیب ہے اور غیب ہی رہے گی، بیدل کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

"غیب مطلق مرتبہ ایست کہ باعتبار مفہوم مجاز حقیقۃ الحقائق نامیدہ اند، و غیب اضافی نشاء کہ بحسب لطافت تمام عالم ارواحش معین گردانید، و غیب متمثل لطافتی موسوم مثال بحکم میلان کثافت آرائی، و غیب مصور کیفیتی منقوش اجسام بہ مقتضای کمال کثافت یعنی ختم مرتبہ پیدائی، پس غیب مطلق یعنی حقیقت الحقائق خفائی محض است منقطع الاشارتست مشعر حقیقت ذات و غیب اضافی خفائی معین نفی اشارات مطلق اسماء و صفات، و غیب مصور شہود دولیتینی حس و شعور"

ہمہ غیب است شہود ایں جا نیست	جملہ اخفاست نمود ایں جا نیست
اصل ہر سوسن و گل نیرنگیست	خبر ہمیں سرخ و کبود ایں جا نیست
شعلہ خاکستر محض است آخر	جز دمی گرمی دود ایں جا نیست
نتواں جلوہ مطلق دیدن	آنکہ ایں پردہ کشود ایں جا نیست
اعتبارات ہمہ اوہام اند	تو عدم باش وجود ایں جا نیست

مفہوم اس نثر و نظم کا یہ ہے کہ جسے ہم "شہود" سے موسوم کرتے ہیں وہ بھی غیب ہے۔ اس غیب کی حقیقت کا ہمیں احساس تک نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ مطلق مجردہ ہے۔ اس کی کوئی صورت ہی نہیں۔ اصلاح تصوف میں اسے غیب مطلق یا حقیقت الحقائق کہتے ہیں۔ اس مرتبہ غیب الغیب یا "لاتعین" میں تمام اشارات منقطع ہیں، اس مرتبہ میں چونکہ وہ کسی اسم و صفت سے موسوم و موصوف نہیں اور ہم بلا اسم و صفت کچھ سمجھ ہی نہیں

سکتے اس لیۓ اس کو "اللہ" بھی نہیں کہہ سکتے۔ کلمہ توحید کے شروع میں اسی اشارت کی نفی کی گئی ہے "لا الہ" لیکن فہم و تفہیم کے لیۓ اسے غیب الغیب یا حقیقۃ الحقائق اور احدیت اور ایسی ہی عبارت سے موسوم کرتے ہیں، یہی غیب بحسب لطافت "روح" سے موسوم ہے۔ اس کو اصطلاح میں غیر اضافی کہتے ہیں۔ یہ خفائی معین ہے۔ تیسرا مرتبہ غیب متمثل ہے، اگرچہ یہ بھی مخفی ہی ہے مگر اس کا شہود ذہن انسانی میں ہوتا ہے۔ چوتھا مرتبہ غیب مجسم، اس میں بوجہ کمال کثافت ظہور اپنے منتہائی عروج پر ہوتا ہے۔ عام فہم لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کسی شے کی "کنہ" معلوم نہیں ہو سکتی ہمیں جو کچھ معلوم ہے یا معلوم ہو سکتا ہے وہ اس شے کی صفات ہی ہیں جنھیں ہم کسی اسم سے موسوم کرتے ہیں، اس کی مثال یہ کائنات ہے جو محسوس و مشہود و معین و مشخص ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ صرف صورتوں کا مجموعہ ہے، جو محسوس ہو رہی ہیں۔ قانون معرفت یہ ہے کہ مثل ہی مثل کو پہچانتی ہے، نور کا ظلمت پر اور ظلمت کا نور پر قیاس نہیں ہو سکتا ایک رباعی میں بیدل نے یہی مثال پیش کرتے ہوۓ کہا کہ اضداد ایک دوسرے سے بالکل بے خبر ہیں۔ اس لیۓ روح روح کو مثال مثال کو جسم جسم کو ہی پہچان سکتا ہے، چونکہ انسان ان تینوں کا جامع ہے اس لیۓ تینوں کی معرفت اس کے لیۓ ممکن ہے۔ جب کوئی مادہ پرست دہریہ یا متشکک یہ کہتا ہے کہ ہمیں اس عالم اجسام کے علاوہ کسی اور شے کا علم نہیں یہ "دہر" ہی ہے جس میں ہمارا مرنا جینا ہے۔ مر کر ہڈیاں مٹی میں مل کر مٹی ہو گئیں تو ہمیشہ کے لیۓ ختم ہو گئے۔ اس کے بعد کوئی زندگی ہمارے لیۓ نہیں۔ تو وہ جہاں تک اس کا مشاہدہ حسی ہے سچ کہتا ہے، اس کی تحقیق یا نظر اسی حد تک ہے۔ وہ مادی کثافت یا صورتوں میں اتنا محجوب ہے کہ اس لطیف حقیقت کو نہیں دیکھ سکتا جو "من وراء حجاب" صور ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس حقیقت کو مادی ابصار درک نہیں کر سکتی، لیکن مثل کو مثل پہچان سکتی ہے۔ روح کو روح کی معرفت

ہی حاصل ہوسکتی ہے، اس لئے اہلِ مذاہب روحانیت کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

راقم الحروف کے مطالعہ سے وہ مباحثہ بھی گزرا جو مسٹر مل (   ) اور سر ولیم ہملٹن (   ) میں دربارہ معرفت رہا، اس پر تبصرہ ہربرٹ سپنسر (   ) نے لکھا۔ مسٹر مل کی یہ رائے تھی کہ معرفت اضداد سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً نور و ظلمت جب دونوں کا تصور ہمارے ذہن میں ہوگا تو ان میں امتیاز سے ہم ان سے روشناس ہوں گے۔ سر ولیم ہملٹن نے یہ اعتراض کیا کہ بلاشبہ اضداد سے امتیاز کا احساس تو پیدا ہوتا ہے لیکن ان کی معرفت نہیں ہوسکتی۔ پانی کے ایک قطرہ پر ہم بحر کو قیاس تو کر سکتے ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کی مثل ہیں۔ لیکن پانی کو آگ پر قیاس نہیں کر سکتے؛ معرفت تو یہ ہے کہ ہم کو معلوم ہو کہ پانی اور آگ خود کیا شے ہیں۔ ہربرٹ سپنسر نے سر ولیم ہملٹن کی تائید کی، اہلِ تصوف کا یہ پامال شدہ مسئلہ ہے کہ مثل ہی کو مثل کی معرفت ہوگی۔ اسی کو اصطلاح تصوف میں "عینیت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن "عینیت" کا صحیح مفہوم شیخ اکبر نے یہ واضح کیا ہے کہ جبتک ہم کسی شے کا ہیولا خود نہ بن جائیں ہمیں اس شے کی معرفت تامہ حاصل نہیں ہوسکتی، یہ تو ظاہر ہے کہ جیسی زید کو اپنے نفس کی معرفت حاصل ہے ویسی عمرو کو زید کی نہیں، عمرو اگر زید بن جائے تو عمرو زید کا "عین" ہوگا۔ اسی طرح ہر ایک طبقہ میں ہر ایک شے کی معرفت کلی اس شے کے عین بننے ہی سے ممکن ہے "ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد" اس لئے دوئی یعنی غیر کی نفی اور وحدت کا اثبات ہی حق شناسی ہے۔

یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اس عالم اجسام میں ہر ایک صورت اپنی مثل کو پہچانتی ہے، "کند ہم جنس باہم جنس پرواز" سوال یہ ہے کہ روح کو روح کس طرح پہچانتی ہے۔ ان نکات کو اگر ملا کر پڑھا جائے جن کا حوالہ

ہم بلفظہ دے چکے ہیں تو بیدؔل کا نظریہ معرفت بھی واضح ہو جائے گا۔ بیدل ایک اور نکتہ میں لکھتا ہے کہ :۔

"گواہ قوت جسم آدمی ست سعی در ادائی شرائط عبادت، وشاہد قوت عقل توجہ بر اکتساب علوم وحکمت، ودلیل قوت روح پرواز ہمت بعروج نسبت وحدت، مادہ این ہر سہ قوت مقدار اعتدال غذاست کہ بہ تقویت آں جسم توانا شود بر قدرت اعمال، وعقل اعانت یابد در سعی تحصیل کمال، وروح بال کشاید بفضائے محبت ذوالجلال، اگر اسباب غذا مفقود باشد، تردد جسم در طلب وجہ معیشت مانع ذوق عبادات است، وتصرف عقل در تدبیر حصول آں محروم کسب علم وحکمت، وتوجہ روح از تشویش اینہا برجوع سر منزل جمعیت"

با خشک وتر مائدہ لیل ونہار — قانع شو، جمعیت دل مفت انگار
آں دولت جاوید کہ خلدش نامند — رزقیست کہ بے تردد آید بکنار

یہ حقیقت عام مشاہدہ ہو رہی ہے کہ انسانی جسم کی قوت کا اندازہ تکالیف شرعیہ کی برداشت سے ہوتا ہے، اور قوت عقل کی شہادت بقدر اکتساب علم وحکمت سے ملتی ہے، اور روح کی قوت کی دلیل اس کی ہمت پرواز میں فضائے وحدت کی طرف عروج میں ہے۔ ان تینوں قوتوں کی اصل اعتدال غذا ہے، غذا جسم کو تقویت دیتی ہے جس سے وہ اعمال پر قادر ہوتا ہے، اور عقل کو مدد ملتی ہے کہ وہ کمال حاصل کرنے کی کاوش میں مصروف ہے جو اس کی ہستی کا منشاء ہے۔ اور روح میں قوت پرواز فضائے محبت ذوالجلال میں پیدا ہوتی ہے، اگر اسباب غذا مفقود ہوں تو ظاہر ہے کہ جہاں تک عبادات کا تعلق ہے۔

شب چو عقد نماز بربندم — چہ خورد بامداد فرزندم

نہ تو ذوقِ عبادت پیدا ہوسکتا ہے، اور نہ وہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے جو عبادت کا ہے، اور جب بھوک پیاس سے حواس خمسہ ہی میں خلل واقع ہو تو عقل کو علم و حکمت کی کب سوجھ سکتی ہے۔ اس لئے عقل ان کے کسب سے محروم ہو جائے گی، اور جب تشویش دل میں پریشانی پیدا کرے گی تو روح کو بھی جمعیت خاطر حاصل نہ ہوگی۔

تذکروں میں بیدل کی تنومندی کی کیفیت یہ بیان کی گئی ہے کہ تیس سیر کا عصا اس کے ہاتھ میں پر کاہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے دل و دماغ کی صحت کا اندازہ اس کے شاعرانہ تخیل اور حکیمانہ تفکر سے ہوسکتا ہے جس کا شاہد اس کا کلام ہے۔ اس کی تحقیق کی داد دینی چاہیئے جو وہ نکات میں بیان کرتا ہے کہ "ریاضت" سعی جسد و عقل و روح ہے۔ لیکن اس میں بھی اعتدال شرط ہے۔

"ریاست صفائی باطن می آرد بشرط اعتدال
وضعف بر قوی می گمارد بافراط کمال"

ریاضت سے صفائی باطن ہوتی ہے اگر اعتدال ملحوظ رکھا جائے اور اگر اسے رہبانیت کی حد تک پہنچا یا جائے تو قوائے کمزور ہوتے جائیں گے۔ غرض ریاضت تو یہ ہے کہ مواد فاسدہ کی اصلاح کی جائے نہ کہ اجزاء صالح کو فاسد کرنا۔ آئینہ سے زنگ کدورت دور کرنا ہے نہ کہ مشق صقل سے آئینہ کے وجود کو دور کرنا۔ مشہور روایت ساکھی منی گوتم بُدھ کی ہے کہ اس نے اس حد تک مجاہدہ حاقہ اور ریاضت شاقہ کی کہ ایک مشت استخواں رہ گیا۔ آخر اس پر وہی کچھ منکشف ہوا جو بیدل بیان کرتا ہے، اس نے اپنے شاگردوں کو ہدایت کی کہ وہ ریاضت جو اعتدال سے تجاوز کرے بے فائدہ ہی نہیں نقصان دہ بھی ہے۔ شاگرد تو منی کے مجاہدہ پر گرویدہ ہو رہے تھے جب دیکھا کہ منی نے کھانا پینا ترک کیا ہوا ہے تو عقیدت مند رہے جب منی

نے پھر کھانا پینا شروع کر دیا اور جسم پر گوشت پوست میں تروتازگی پیدا ہونے لگی تو بیدل ظن ہو کر کنارہ کیا۔

ان نکات میں بیدل بھی اپنی وارداتِ قلب بیان کرتا ہے چہار عنصر میں اس نے واقعات بھی لکھے ہیں۔ اور یہ نکتہ تو آب زر سے لکھنا چاہئے کہ بھوک کی شدت سے صفرا بڑھ جاتا ہے اور صفرا سے سودا، صاحبِ ریاضت اوہام میں عجیب و غریب شکلیں دیکھتا ہے، سودائی بھی اسی عالم میں یہی کچھ دیکھتے ہیں۔ معیارِ صداقت صرف کتاب کائنات ہے، لاریب فیہ، اس لئے اشیاء محسوسہ معینہ کی صورتوں کے سوا اور کچھ نظر آئے تو سمجھو کہ "ہمہ سودا است"۔

کائنات اور کائنات کی اشیاء کو جیسی کہ وہ ہوں ان کی اصل صورت سے مشاہدہ کرنا اور اسی نظم و نظام میں مشاہدہ کرنا جیسا کہ کائنات میں کارفرما ہے، صحیح تصور ذہن میں کائنات کا پیدا کرنا ہے، یہ جادۂ معرفت پر پہلا قدم ہے۔ اس کے بعد ان تصورات میں حقائق کی تلاش تذکر و تفکر سے شروع ہو جاتی ہے، یہی جستجوئے حق اصل عبادت ہے اور عبادت کی غرض و غایت بھی یہی ہے۔

انبیاء عمرے نفس ہا در تردد سوختند
کیں حقیقت غافلاں شاید بخود محرم شوند

انبیاء علیہم السلام تمام عمر اسی تردد میں گھلتے رہے کہ عوام جو حقیقت سے غافل کالانعام ہیں شاید اپنے آپ سے محرم ہوں "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ"۔

در عبادت ہاست یکسر غرض ترکیب سجود
تا دریں صورت مے سوئے گریباں خم شوند

عبادت میں بھی قیام و رکوع و سجود ہے۔ اور سجود غایت عبادت ہے۔ اس کی غرض بھی یہی ہے کہ اسی صورت میں جھک کر اپنے گریباں میں منڈالیں

اور فکر کریں کہ ہم کیا ہیں۔

سعی ناموس کرم معروف این شغل ست وبس
کایں خراں بیروں جہند از غولی و آدم شوند

آیہ کریمہ "لقد کرمنا بنی آدم" شاہد ہے کہ بنی آدم کو تمام مخلوقات میں سے خلعت تکریم پہنایا گیا۔ اور اس لئے آدمی اشرف المخلوقات ہوا۔ اور خلیفہ فی الارض اور مسجود ملائک ہے ایک حیوان اگرچہ ناطق ہے۔ اس لئے اگر یہ خود ہی اپنے شرف اور شرافت سے بے خبر رہے تو کالانعام بلکہ ان سے بھی گیا گزرا۔ انبیاء اسی کوشش میں ہمیشہ رہے کہ لوگ اس حقیقت سے واقف ہوں یعنی خود شناس ہوں، جب خود شناس ہوں گے تو انسانیت کے صحیح مقام سے واقف ہو کر "سخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعا منہ، ان فی ذلك الایت لقوم یتفکرون" کے مصداق بھی ہوں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ آفاق میں جو کچھ محسوس ہوتا ہے وہ مادیات ہیں، انہی کو ہم اپنے ذہن میں تصورات کی صورت میں لاتے ہیں۔ گویا یہی عالم خارجی ہمارے قلب میں عالم مثال ہے جس میں مادی کثافت لطافت سے بدل چکی ہے۔ اب ہم خارج کو نہیں دیکھتے، بلکہ تذکر و تفکر اسی عالم مثال میں کرتے ہیں۔ جادۂ تحقیق پر یہ دوسرا قدم ہے۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو کچھ خارج میں ہے وہ کچھ ہمارے قلب میں ہے۔ اس لئے بقول بیدل

"ظاہر ایں جا باطن است و باطن ایں جا ظاہر است"

ہمیں تلاش حق میں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ "سخن" کے تحت بیدل نے جو کچھ لکھا ہے جس کا حوالہ ہم "چہار عنصر" کے تحت دے چکے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کی ہر ایک شے ہم سے ہم کلام

ہورہی ہے اور انہی تصویری حروف میں اپنے حقائق ہم پر واضح کر رہی ہے۔ عارف رومی بھی کہتے ہیں کہ

نطق آب و نطق باد و نطق گل   ہست محسوس حواس اہلِ دل

اتنا تو سوچنا چاہیئے کہ آج تک جو حقائق دریافت یا منکشف ہوئے ہیں وہ کیسے ہوتے اگر اشیاء خود ہی ہم سے ہم کلام نہ ہوتیں جب بالا رادہ بیداری میں ہم اس طرف متوجہ نہیں ہوتے تو بحالت خواب ہمارے حواس ظاہری معطل اور ارادہ سلب ہو جاتا ہے یہی تصویری حروف یا مثالی صورتیں ہمارے روبرو ہماری توجہ کو جذب کرتی ہیں۔ غرض یہی ہے۔

"کایں خراں بیروں جہند از غولی و آدم شوند"

ہم لکھ چکے ہیں کہ مثل کو مثل ہی کی معرفت ہوتی ہے، اس کی حقیقت خواہ خارج میں کہو یا باطن میں ایک ہی ہے، جب عارف سالک پر یہ حقیقت علماً وعملاً منکشف ہوتی ہے تو خواہ زبان سے "انا الحق" نہ کہے وہ خود حقیقت مجسم ہوتا ہے یہ مسئلہ وحدت وجود دقیق ہے، مزید تشریح جہاں تک ممکن ہے غزلیات کے تحت کی جائے گی۔

چشم خود بیں زحمت اندیشہ باطل نبرد
محرم لیلی بر آب شوق بر محمل نبرد

جو اہلِ نظر خود شناس ہے وہ حق شناس ہے۔ اس لئے باطل کا خیال اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتا جو مجنوں لیلیٰ کا محرم ہے وہ محمل کو نہیں دیکھتا۔ جو حقیقت پرست ہے وہ صورت یا بُت پرست نہیں ہوتا۔

سیر معنی از خم و پیچ عبارت فارغ ست
قاصد ملک تقدس رنج آب و گل نبرد

جو اہلِ علم و حکمت معانی سے واقف ہے وہ حرف و صوت سے بے نیاز ہو جاتا ہے، "قاصد ملک تقدس" یعنی روح آب و گل سے علحدہ ہو جاتی ہے۔

مصری اور ایرانی اور ہندی اور یونانی نظریہ یہ ہے کہ مادہ اور روح دو علاحدہ علاحدہ اشیاء ہیں۔ اور یہ کہ روح مادی صورتوں میں چکر کاٹتی رہتی ہے جیسے "تناسخ" کہتے ہیں۔ بیدل اور تمام حکماء اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ حقیقت ایک ہی ہے البتہ صورتیں مختلف ہیں۔ اور مادہ محض صورت ہے۔ اور صورتیں محض عوارض ہیں جو ہر آن بدلتے اور فنا ہوتے رہتے ہیں لیکن حقیقت تغیرات سے پاک ہے۔ اس کی تائید میں بیدل نکات میں کہتا ہے کہ :-

"آنچہ از نسخہ دل فہم کنی اگر ہمہ نقطہ ایست چوں مردمک طوفانش از جانمی برد، و ہرچہ از خارج جمع نمائی ہرچند دفتریست در چشم کشودن چوں مژہ برہم می خورد"

جو کچھ نسخہ دل کے مطالعہ سے تیرے فہم میں آئے اگرچہ وہ بقدر ایک نقطہ ہی کیوں نہ ہو وہ آنکھ کی پتلی کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے گا طوفان گریہ اسے متزلزل نہیں کر سکتا۔ اور یہ جو کچھ تو خارج سے جمع کرے گا خواہ وہ دفتر ہی کیوں نہ ہو آنکھ کی جھپک میں محو ہو جائے گا۔ اس موضوع پر بیدل نے لطیف شعر لکھے ہیں۔ غزلیات کے تحت ان کا حوالہ دیا جائے گا۔ مفہوم یہ ہے کہ ذرا آنکھ کھول کر دیکھو تو ایک دنیا اور اس کی رنگینی مشاہدہ ہو گی لیکن آنکھ بند کر دو تو سب کچھ محو ہو جائے گا۔ البتہ جو لوح دل پر ثبت ہے وہ ہمیشہ پیش نظر رہے گا خواہ بیداری ہو یا خواب۔

محیطِ اعظم

مولانا ظہوری کا شاہکار "ساقی نامہ" ہے، بیدل کی مثنوی کا موضوع بھی یہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیدل نے یہ مثنوی مولانا ظہوری کے جواب میں ہی لکھی، مثنوی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ:-

"اما بعد این میخانہ حقائق است نہ ساقی نامہ اشعار ظہوری، آئینہ پرداز دقائق است نہ زنگار فروش خمار بے شعوری"

مفہوم تو یہ ہے کہ اس مثنوی کو مولانا ظہوری کے ساقی نامہ پر قیاس نہ کرنا چاہیئے۔ یہ میخانہ حقائق ہے، اور جو کچھ نکتہ آفرینی اس میں کی گئی ہے، وہ بات ظہوری کے ساقی نامہ میں نہیں۔

اصطلاح تصوّف میں "ساقی" سے مراد ذات حق تعالیٰ ہے۔ یہ اصطلاح آیہ کریم "وسقٰھم ربھم شرابًا طھورا" سے اخذ کی گئی ہے۔ بیدل نے میخانہ عشق الٰہی کو آٹھ دوروں میں تقسیم کیا ہے۔ "دورِ اولیٰ" میں "جوش اظہار بزم وجود" کے تحت بزم قدم کا بیان کیا ہے۔ یہ مقام لاتعین" جیسا پہلے تھا اب بھی ہے۔ "الآن کما کان" اس بزم قدم میں "مئے بود بے نشۂ کیف وکم" یعنی ظہور اسماء و صفات نہ ہوا تھا۔

منزہ ز اندیشۂ حادثات   مبرا ز درد و غبار و صفات

"دور ثانی" میں "جام تقسیم گلستان شہود" کے تحت بقول خواجہ حافظ "گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند" آدم کی مٹی کو اسی مے سے گوندھا گیا

نصیبے ازیں مے با آدم رسید   زجیب خمار عدم سر کشید

بیدل نے ایک بات یہ بھی پیدا کی ہے کہ:-

اگر گندمش راہ زن شد چہ باک   کہ مست و فا از خطا ہاست پاک
کسی را کہ پیر مغاں بر گزید   ز عصیاں گلے جز ہدایت نچید
بود وصف مستان ظلوم و جہول   کہ کردند سر جوش مستی قبول

یعنی اگر شجرِ ممنوعہ کی وجہ سے گمراہ ہؤا۔ تو یہ ایک ایسی خطا تھی کہ جب آدم متنبہ ہؤا تو توبہ بھی کی اور وہ قبول بھی ہوئی۔ اولادِ آدم بلاشبہ خطا کار واقع ہوئی ہے۔ لیکن اسی خطا میں اسے راہِ صواب بھی نظر آتی ہے۔ جو شخص مست ہو اسے ظلوم و جہول کہو تو بجا ہے لیکن اسی ظلم و جہل سے احساس عدل و علم و عدل بھی آدم کو ہؤا۔ بہر حال پیر مغاں یعنی حق تعالیٰ نے جب اسے کل مخلوقات میں سے انتخاب فرما لیا۔ اور کل کائنات میں امتیاز بخشا یہاں تک کہ فرشتوں کو حکم ہؤا کہ آدمؑ کے حضور جھکو اور جو ذرا اکڑا راندۂ درگاہ ہؤا۔ یہ صحیح ہے کہ ملائکہ اللہ کی تسبیح و تقدیس میں ہر وقت مشغول ہیں اور یہ کہ آدم مفسد اور خونریز بھی ہے۔ مگر ایک خاص بات آدم میں ہے کہ ان تمام برائیوں اور گناہوں کے ہوتے ہوئے بھی اس کی شخصیت ممتاز ہے۔ ایک رباعی میں بیدل کہتا ہے کہ

انساں کہ فلک ہاست سر افگندۂ او   در حیرت او گم است دانندۂ او
دارد خاصیتے کہ در خارج و ذہن   ہر چیز کہ آفریدہ شد بندۂ او

اور قرآن کا ارشاد بھی ہے کہ "سخر لکم ما فی السموٰات وما فی الارض جمیعا منہ، ان فی ذلک لاٰیت لقوم یتفکرون" تمام کائنات

آدم کے لیے مسخر کی گئی ہے۔ یہ کہنا کچھ بیجا نہیں کہ تمام مخلوقات اس کے تابع فرمان ہے، یہ وہ موضوع ہے جو بیدل کا خاص ہے۔ اس پر مفصل بحث مناسب مقام پر کی جائے گی، اس مقام پر اتنا اشارہ کافی ہے کہ ہمارے زمانہ میں علامہ اقبال مرحوم نے "رموزِ خودی" میں یہی مسئلہ بیان کیا ہے اور "اسرارِ بیخودی" میں یہی نشہ ہے جس کی رنگینی کو بیدل نے نمایاں کیا ہے۔

یہ دَور آدم سے اولادِ آدم میں گردش کرتا رہا۔ اس بزم میں جو نمایاں طور پر سرخوش مستی تھے وہ انبیاء تھے اور ان کے ذریعہ ان کے متبعین بھی اس فیض سے مالا مال ہو گئے۔ حضرت نوحؑ کی نسبت بیدؔل لکھتا ہے :۔

ازاں بادہ چوں نوح شد کامیاب
جہاں دید نقشے ز موج شراب

جب اس شراب سے نوح کامیاب ہوا تو موج شراب میں جہاں ایک نقش نظر آیا۔

بدورش طبائع چناں گشت مست
کہ از بیخودی رنگ صہبا شکست

اس کے اپنے دور میں لوگ اس حد تک بدمست اور بیخود ہوئے کہ "رنگ صہبا شکست" شراب بھی حیران ہو کر رہ گئی۔

شکستن تحیر بجائے رساند کہ در جام و مینا صدائے نماند

یہ شکستگی اس حیران کن درجہ تک پہنچ گئی کہ جام اور مینا میں آواز تک نہ چھوڑی۔

ز پیمانۂ جہل خلقی در آب فرو رفت چوں دردے در شراب

قوم نوح نے جہالت کے پیمانہ میں شراب اُنڈیل کر پی۔ پانی میں اس طرح غرق ہوئے جس طرح تلچھٹ شراب کے پیالہ کی تہ میں بیٹھ جاتی ہے۔

بران قوم شد موج طوفان سوار   کہ در آب آرام گیرد غبار

قوم نوح کی بدمستی کی یہ کیفیت تھی کہ طوفان کی موجیں اس کے سر پر سوار ہو گئیں، جس طرح پانی میں غبار یا خاک تہ پر بیٹھ کر قرار لیتی ہے اسی طرح جب تک عالم آب ان کے سر سے نہ گزر گیا وہ بھی چین سے نہ بیٹھے۔

بہر سر زبس بادہ مستی گماشت   کس از عالم آب سر بر نداشت

چونکہ ہر ایک فرد قوم کے سر پر شراب کا نشہ پورے زور پر تھا کسی کو عالم آب سے اُبھرنے کی ہوش نہ تھی، ان اشعار میں بیدل نے "عالم آب" میں لطف پیدا کیا ہے۔ اور طوفان نوح سے خوب مناسبت پیدا کی ہے۔

بطوفاں حیرت فزائی خطیر   ہماں کشتی مے شدش دستگیر

حضرت نوح اس طوفان سے کشتی کے ذریعہ بچے، اس شعر میں بھی عالم آب کو عبور کرنے کا ذریعہ "کشتی مے" بتایا ہے، اسی طرح بیدل تمام انبیاء کا ذکر کرتا ہے اور ان نفوس قدسیہ کے خاص خاص حالات میں اسی شراب طہور کی بادہ پیمائی کے ساتھ مناسبت واضح کرتا ہے۔ یہ دور آنحضرتؐ پر ختم ہوا۔

جہاں را بسر جوش عرفاں رساند   ز بدمستی خمر غفلت رہاند

تمام دنیا جہاں کے لوگوں کو شراب معرفت پلا کر اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا، خمر غفلت کی بدمستی سے نجات دلائی، چنانچہ صدیق اکبرؓ نے "شراب وفا یافت در جام صدق" اسی طرح فاروق اعظمؓ "عمر یافت کام از مے عدل داد بر آفاق چوں استوا خط نہاد" "عثمان ذی النورینؓ" "ز سر جوش خم حیا گشت مست" اور اسد اللہ "علی گشت صہبائی علم"

تیسرے دور کے ضمن میں منصور حلاج کا مذکور ہے۔ اس ضمن میں بیدل نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ حد اعتدال سے نہ بڑھنا چاہیئے۔ عدل وہ صراط مستقیم

ہے جو سیدھی جنت کو جاتی ہے۔ اس کے دو کنارے افراط و تفریط ہیں اور جو ان میں اُلجھا وہ جہنم میں گرتا ہے۔

بہ منصور آں بادۂ بے مثال — چو یک قطرہ افزود داز اعتدال
بر آورد از موج مستی زباں — ز ظرفش بر آمد انا الحق زناں
مئے فیض در رنگ اصلی بجاست — ولے ظرفِ تمکین مستاں کجاست

یہی بادۂ وحدت منصور نے بھی پیا مگر ایک گھونٹ زیادہ پی گیا۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ ضبط نہ رہا، اس کے ظرف استعداد میں اسی گھونٹ کی سمائی نہ تھی، مستی میں زبان سے "انا الحق" نکلا۔ اس میں کچھ کلام نہیں کہ شراب تو اپنے اصلی رنگ میں ہی ہے اور شراب حقیقت ہی ہے۔ لیکن وہ تمکنت جو مستوں کے حال کے مناسب ہے وہ منصور کے ظرف میں نہ تھی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ :۔

گہر داشت بر جام اصلی نظر — نیفتاد چشمش بجامِ دگر

"گہر" کے معنی موتی بھی ہیں اور اصل اور اصالت بھی ہیں، یعنی موتی نے اپنے ظرف اور استعداد کے مطابق "زیک قطرہ می داد تسکین خویش" ایک قطرہ پر قناعت کی اور موتی بن گیا۔ اس نے دوسرے جام کی خواہش ہی نہ کی، لیکن :۔

ہماں جام چوں شد نصیب حباب — بنالید از ذوق عیش شراب
باظہار جام دگر لب کشاد — چو گل ساغر خود ہم از دست داد

یہی ایک گھونٹ شراب حباب نے بھی پیا۔ نشہ کی ترنگ میں اتنا پھولا کہ ایک اور جام طلب کیا۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ گل کی طرح جو اپنے جامہ میں پھولا نہ سما سکا اس کا ساغر بھی ہاتھ سے گر کر چور چور ہو گیا۔ اس شعر میں "لب کشاد" سے مراد یہ ہے کہ وہ ضبطِ نفس جس سے حباب کی ہستی برقرار ہے نہ رہا، چھوٹے مُنہ سے زیادہ کی طلب کی تو خود پھوٹ کر رہ گیا، اور اپنی

ہستی فنا کر بیٹھا۔

حریفے کہ باشد تنک حوصلہ نزیبد ز پیر مغانش گلہ

غالب نے بھی منصور کو تنک ظرف قرار دیا ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو منظور تنک ظرفی منصور نہیں

حباب کی طرح منصور اور اسی قبیل کے لوگ جو بے اعتدالی سے کام لیتے ہیں اگر پیرِ مغاں کا گلہ کریں کہ ہم کو بقدر طلب نہیں دیتا تو یہ ان لوگوں کی کوتہ اندیشی ہے۔

بہ قسمت کسے گر قناعت کند چرا ساغرِ عیش خود بشکند

ساقی قسمت جو کچھ دیتا ہے وہ عین صواب ہے۔ اس لئے اگر ہر ایک شخص اسی پر صبر و شکر کرے تو اس کا ساغر عیش زندگی بھر ٹوٹ نہیں سکتا۔ لیکن جو قناعت نہیں کرتے خراب حال ہوتے ہیں، اس لئے جتنی ظرف میں وسعت ہو اسی مقدار سے بادہ بھی طلب کرنا چاہئے۔ کہ ہرچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است۔

محمد ز فیض محیط قدم گرفتہ ہزاراں قدح دمبدم
دلے بود فارغ ز کیف خمار ز شوق شہود ازل بیقرار
کہ من رنگ ایں بادہ نشناختم بہ تحقیق جامش نہ پرداختم

ان اشعار میں اشارہ آنحضرتؐ کی ایک صحیح حدیث کی طرف ہے کہ آپ نے فرمایا " ما عرفناک حق معرفتک " اس حدیث میں عبودیت اور عبدیت کا حقیقی تقاضا بھی نمایاں ہے اور ساتھ ہی طلبِ علم بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص یہ دعوے نہیں کر سکتا کہ اس کو کسی شے کا علم " کما حقہٗ " حاصل ہے۔ ہر ایک شے میں لا محدود امکانات پوشیدہ ہیں، جن کو " الغیب " کہتے ہیں۔ آنحضرتؐ کی دُعا بھی یہی تھی کہ " رب زدنی علما " اے میرے پروردگار میرا علم

زیادہ کر باوجود اس امر کے کہ اس بحرِ بیکراں سے "گرفتے ہزاراں قدح و مبدم" لیکن ہمیشہ یہی کہتے کہ "انا عبد اللہ" "میں اللہ کا بندہ ہوں منصور کو یہ بات کہاں نصیب تھی، ایک قطرہ سے ہوش و حواس بجا نہ رہے اور بے اختیار "انا الحق" کا نعرہ لگایا، آنحضرتؐ کے بارہ میں بیدل نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ :۔

حریفے کہ شد میکش خم ذات   چہ ساں مست گردد ز جام صفات

غالب نے اسی خیال کو اور لطیف انداز میں ادا کیا ہے :۔

سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگام بے خودی   رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیئے
یعنی بحسب گردش پیمانۂ صفات   عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیئے

آنحضرتؐ خمخانہ ذات میں مقیم تھے، اور اصلی رنگ میں شراب حقیقت اسی مقام وحدت میں ملتی ہے۔ منصور صفات کی تجلیات میں محجوب تھا۔ آنحضرتؐ اس مقام سے گزر چکے تھے۔

گر از ساغر ذرہ گیرد شراب   چہ اظہار مستی کند آفتاب

اگر آفتاب ساغر ذرہ سے شراب پیئے تو ظاہر ہے کہ اس کے نشہ کا اثر اس پر کچھ نہ ہوگا۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ، آنحضرت آفتاب "سراجاً منیرا" ہیں۔ آپ ساغر صفات سے نہیں بلکہ جام ذات سے پیتے ہیں۔ عہدِ اکبری کا ایک محقق کہتا ہے کہ :۔

"موسیٰ ز ہوش رفت زیک پرتو صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمے"

(قاضی جمال دہلوی)

بیدل کہتا ہے کہ :۔

"چو شد طالب صاف وحدتؐ کلیم   برآورد پائے ادب از گلیم"
"ز دیر مغاں لن ترانی شنید   کہ ہر کام نتواند ایں مے چشید"

جب حضرت موسیٰ نے التجا کی "رب ارنی" اے میرے پروردگار مجھے اپنا آپ دکھا، جواب ملا کہ "لن ترانی" تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔ حضرت موسیٰ کا سوال بقول بیدل ادب کے خلاف تھا۔ ایک غزل نعتیہ میں میرا ایک شعر ہے۔

یقین ہے آتی نہ ہرگز سوال کی نوبت
کلیم تجھ سے اگر ہم کلام ہو جاتا

اسی بحث کے ضمن میں بیدل استعداد پر لکھتا ہے کہ :-

بباطن مے عشق وحدت صفاست | بظاہر فروغش تفاوت نماست
نماید چو خورشید در خانہ رو | زشمعے فزوں نیست انوار او
ولیکن بصحرا است صاحب جلال | بود لازم ظرف نقص و کمال
بود فرق از ذرہ تا آفتاب | کجا ساغر بحر و جام حباب

از روئے حقیقت عشق وحدت کی شراب صاف ہے لیکن بقدر ظرف اس کا نشہ مختلف ہے، حقیقت کی مثال آفتاب جیسی ہے کہ اگر کسی خانہ کے روزن دیوار سے اس کی روشنی داخل ہو تو شمع کی روشنی سے زیادہ نہ ہوگی لیکن صحرا میں آفتاب اپنی پوری شان جلال میں جلوہ نما ہوتا ہے۔ اس لئے نقص و کمال یا کمی بیشی کا اندازہ ظرف کی وسعت سے ہی ہو سکتا ہے ایک گھر کی چار دیواری میں اسی سورج کی روشنی شمع سے زیادہ نہیں مگر صحرا میں اس کی وسعت کے لحاظ سے اس کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی طرح ذرّہ اور آفتاب میں تفاوت ہے، بحر کے پیالہ میں سمندر سمایا ہوا ہے اور ساغر حباب میں ایک قطرہ سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔

بفرعون جام جہالت رسید | کہ چشمش بجز رنگ غفلت نہ دید

فرعون نے یہی شراب جام جہالت میں پی۔ جہالت کا نشہ غفلت کے سوا اور کیا ہوتا۔

ہمہ دردشد بادہ ناب او   می جلوہ شد پردہ خواب او

شراب تو از روئے حقیقت صاف ہی تھی مگر یہ خالص شراب "درد" یعنی تلچھٹ اس کے جام جہالت میں دکھائی دی اس لئے وہ ہوش کھو بیٹھا اور خواب غفلت میں مدہوش ہوگیا۔

مگر خوابش از ہوش گیرد دلیل
شکستند بر فرق او خم نیل

دستور ہے کہ سوئے آدمی کو بیدار کرنے کے لئے اس کے چہرہ پر پانی کے چھینٹے دیتے ہیں، اس خیال سے کہ فرعون کے ہوش و حواس بجا ہوں اور وہ بیدار ہو اس کے سر پر "نیل" کا مٹکا توڑا گیا، نیل کے ساتھ "خم" نے اس شعر میں لطف پیدا کر دیا ہے۔ مطلب تو یہ ہے کہ وہ نیل میں غرق ہوگیا۔ اور اس میں بھی کچھ شک نہیں، کہ اس کے حواس خمسہ ایک ہی موج دریا کے تھپیڑے نے درست کر دئے اور چلا اٹھا کہ میں موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لایا۔ چہار عنصر میں بیدل نے لکھا ہے کہ کسی نے ایک اہلِ دل سے دریافت کیا کہ منصور اور فرعون دونوں ایک ہی خمخانہ کے پینے والے تھے، اور دونوں نے دعویٰ بھی ایک جیسا کیا۔ منصور نے "انا الحق" اور فرعون نے "انا ربکم الاعلیٰ" کہا۔ اس کی وجہ کیا ہے کہ ایک مقبول اور دوسرا مردود ہوا جواب دیا کہ منصور اہل تحقیق تھا، کسی حالت میں بھی اپنے دعوے سے دستبردار نہ ہوا یہاں تک کہ دار پر لٹکایا گیا۔ مگر فرعون کو دنیوی جاہ و حشمت نے مغرور بنا دیا، اس کے سر میں جو ہوا سمائی ہوئی تھی پانی کی ایک لہر نے بلبلہ کی طرح توڑ پھوڑ کر نکال دی، اور بے اختیار چیخ اٹھا کہ میں بنی اسرائیل کے خدا پر ایمان لایا۔ اگر اسے اپنے دعویٰ پر یقین ہوتا تو منصور کی طرح اسی پر قائم رہتا۔

ز افعال و آثار چوں شد خلاف   وگرنہ زیک خم بود درد و صاف

اگرچہ شراب صاف ہو یا تلچھٹ ایک ہی خم میں ہوتی ہے لیکن افعال اور آثار کے لحاظ سے سایہ اور نور کی تمیز بھی پیدا ہوتی ہے ورنہ "بود سایہ در جلوہ ہمرنگ نور" نور بھی اسی طرح جلوہ فروز ہے جیسے سایہ ظاہر ہے۔ لیکن اہلِ نظر کی آنکھ میں "گم است ایں یکے در ظہور دگر" جہاں ظلمت چھائی ہوئی ہو وہاں نور گم ہے اور جہاں نور کا ظہور ہو وہاں ظلمت کافور ہے۔

بیدل نے اس مثنوی "محیط اعظم" میں حقائق کو جس پیرایہ میں بیان کیا ہے وہ اسی کا حصّہ ہے، سردست ہمیں اس مثنوی کے موضوع سے بحث نہیں، یہ موضوع اس کا اپنا خاص ہے اور اس کے کلام نثر و نظم میں یہی کار فرما ہے، بیدل کی تصانیف کے مذکور میں ہم ہر ایک تصنیف سے سرِدست روشناس کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے شاعرانہ تخیل اور حکیمانہ تفکر پر مفصل بحث ہم مناسب مقام پر کریں گے۔

اس مثنوی میں بیدل نے موضوع کی رعایت کی وجہ سے ساقی اور خرابات اور خراباتیاں اور خم و مینا و جام وغیرہ پر جو کچھ لکھا ہے وہ "سرِ دلبراں" "در حدیثِ دیگراں" میں بیان کیا گیا ہے۔ اگر ہم اس پر بحث کریں تو ایک دفتر چاہیئے۔ ہم صرف چند اشعار کا انتخاب کرتے ہیں، بیدل ایک حکایت بیان کرتا ہے کہ ہندوستان میں ایک تھا مہاراجہ، اس نے اپنی مملکت کے طول و عرض میں اعلان کر دیا کہ جو بھی کسی علم و ہنر میں اہلِ کمال ہے، دربار میں حاضر ہو کر اپنے کمال کا اظہار کرے اور مُنہ مانگا صلہ پائے۔ اس دعوتِ عام پر ملک کے باکمال آنا شروع ہوئے۔

بہ بزمش ز اہلِ ہنر ہر کہ بود ۔۔۔ ز اسرارِ دل نسخۂ وا نمود

راجہ کے دربار میں ہر ایک اہلِ ہنر نے جو بھی تھا "دل" کے اسرار کھول کر رکھ دئے۔ اس شعر میں الفاظ "اسرارِ دل"، تمام حکایت کا اصل موضوع ہے۔ یہ بات ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اہلِ علم و ہنر کے پاس جو کچھ

بھی ہوتا ہے وہ اس کے اپنے دل میں ایک راز کی طرح پوشیدہ ہوتا ہے، جب تک وہ خود ہی تحریر و تقریر میں اس کا اظہار نہ کرے یہ راز کسی پر منکشف نہیں ہو سکتا۔ اس حکایت کے نتیجہ پر بیدل نے جو بحث کی ہے وہ مناسب مقام پر بیان کی جائے گی۔

بہ طبع ہنر پرورش بے حجاب   زمے نشہ ظاہر شد، از گوہر آب
عیاں شد بچشم طراوت نظر   زگل نگہت، از لالہ داغ جگر

اگرچہ ہر ایک اہلِ کمال کا ہنر اس کے دل ہی میں پوشیدہ تھا مگر جب اس نے یہ پردہ اُٹھا دیا تو اس کے ہنر کا اظہار لوگوں پر اسی طرح ہوا جس طرح شراب پینے کے بعد ہی اس کا نشہ ظاہر ہوتا ہے، یا موتی قعرِ دریا سے نکل کر ہی اپنی آب و تاب دکھاتا ہے۔ پھول جب کھلتا ہے تو اس کی خوشبو سے دماغ معطر ہو جاتا ہے اور لالہ کا داغ جو پہلے جگر میں پوشیدہ تھا منظرِ عام پر آجاتا ہے۔ اشعار کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شئے "فعل" میں نہیں آسکتی جب تک پہلے ہی "بالقوہ" موجود نہ ہو، اگر ہنر اہلِ کمال کے دل میں موجود نہ ہوتا تو اس کا اظہار بھی نہ ہوتا۔

ازاں جملہ بازیگری شوخ و شنگ   چو گردوں طلسم دو عالم بچنگ
زجیب فریب نگہ سر کشید   بساطی پی دام نظارہ چید
بمیداں افسوں گری پا نہلو   یکے اسپ چوبیں بشر عرضہ داد

انہی باکمال لوگوں میں ایک بازیگر بھی تھا۔ ہر دو عالم ایک طلسمی کارخانہ ہے مگر آسمان شعبدہ باز کے دستِ تصرف سے باہر نہیں ہے۔ یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ خود آسمان ہی تھا جو بازیگر کی صورت میں نمودار ہوا۔ فارسی شاعری آریا ذہنیت کی آئینہ دار ہے۔ یہ عام آریائی عقیدہ ہے کہ اجرام سماوی کا اثر انسانی زندگی پر پڑتا ہے اس لئے ان میں جوتش یا علم نجوم کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ اس کرۂ عرض پر ہو رہا ہے وہ سیارگاں کی

گردش کا اثر ہے۔ یہ عقیدہ صحیح ہے یا غلط سردست زیر بحث نہیں۔ لیکن آریائی شاعری میں اس نے مستقل جگہ حاصل کر لی ہے۔ اس لئے بیدل بھی عام روزمرہ اور محاورہ زبان استعمال کر رہا ہے۔ اس چالاک شعبدہ باز نے اپنے تھیلہ سے جس کو فریب نظر کہنا چاہیئے دام نظارہ نکال کر بچھا دیا۔ جادو گر بھی کے میدان میں قدم رکھتے ہی راجہ کے حضور ایک لکڑی کا گھوڑا پیش کیا۔ اور کہا:۔

ہر آں کو بر اینل سپ گرد سوار کند سیر افلاک اندیشہ وار

جو بھی اس گھوڑے پر سوار ہوگا وہ اس تیزی سے تمام افلاک کی سیر کر سکتا ہے جس سرعت سے خیال دوڑتا ہے، اور لطف یہ ہے کہ راستہ میں گرد و غبار کی کلفت بھی نہ ہو گی: "بود سیر او ہمچو سیر نگاہ" اس کی سیر نظر کی سیر کی طرح ہو گی۔ ان اشعار میں بیدل نے "سرعت اندیشہ" اور "سیر نگاہ" کو ہر ایک شے سے زیادہ تیز رفتار بتایا ہے، زمانہ حال کے حکماء کا نظریہ یہ ہے کہ "روشنی" سب سے زیادہ تیز رفتار ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ "انسانی دل" ہی سب سے زیادہ تیز رفتار ہے۔ خیال اور نگاہ اسی کی رفتار اور روش ہے۔

راجہ نے جب گھوڑے کی یہ تعریف سنی تو بے اختیار گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ بازی گر نے متنبہ کر دیا تھا کہ گھوڑا سخت منہ زور ہے۔

نباشد عنانش بفرماں کس کہ مشکل بود ضبط موج نفس

یہ نہیں ہو سکتا کہ لگام کے اشارے پر چلے۔ ایسا ہی ہے جیسا انسانی سانس خود بخود چل رہا ہے، روکے سے رکتا نہیں، اور اگر رکے تو دم ہوا ہو جائے غرض راجہ سوار ہوا اور گھوڑا فوراً

باوج فلک گشت جولاں نما چو شبنم بر آمد برنگ ہوا

آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ اب راجہ کے اوسان بجا نہ رہے۔

بہ ہیبت چناں خسرو از خویش رفت
کہ از بے خودی یک قدم بیش رفت

راجہ ایک بیخودی کے عالم میں اپنے آپ میں نہ رہا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ رُکتا کیا ایک قدم اپنے آپ سے اور آگے بڑھ گیا۔

زحیرت ہم آغوشِ وہم ہلاک
بیفتاد چوں سایہ بر روئے خاک

اب راجہ پر یہ وہم غالب ہُوا کہ میں گرا کہ گرا، اس وہم سے ہمکنار ہونا تھا کہ سایہ کی طرح زمین پر آ رہا، تھوڑی دیر بعد جب آنکھ کھلی تو ایک لق و دق جنگل میں اپنے آپ کو پڑا پایا۔ گرمی کی شدّت کی وجہ سے پیاس کا غلبہ ہُوا اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ تین شبانہ روز رہی مگر پانی نہ ملا آخر دور سے غبار اُٹھتا ہُوا دیکھا، جب حجابِ غبار دور ہُوا تو ایک حسینہ بے پردہ نمودار ہوئی۔

خرامے چو سیلاب غارت فروش نگہ وحشتے دامِ اُلفت بدوش

جس طرح سیلاب بڑھتا ہُوا ہر ایک شے کو جو راستہ میں پڑے بہا لے جاتا ہے اسی طرح اس کا خرام غارت فروش تھا، نگاہ اگرچہ رمیدہ تھی مگر "دامِ اُلفت بدوش"۔ یہ صفت اضداد ہے کہ رمیدہ نگاہ جو غزال وحشی کی ہوتی ہے اُلفت کی بھی دعوت دیتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں آبخورہ آب اور ٹوکری میں روٹی بھی تھی، راجہ بھوکا اور پیاسا تو تھا ہی، دوڑ کر سامنے آیا۔ اور کمزوری کی وجہ سے اس پری پیکر کے پاؤں پر گر پڑا۔ اس نے راجہ کو دیکھ کر کہا کہ تم تو راجہ اور راجپوت نظر آتے ہو اور میں شودر ذات میرا پیشہ کناسی ہے، یعنی جاروب کشی ہے۔

غذا ہائے ما ہم بما شد حلال بقومِ دگر نیست غیر از وبال

ہماری خوراک تو ہمارے لئے حلال ہے۔ اگر تمھیں دوں تو تمھارا

دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔

راجہ کی تو جان پر بنی ہوئی تھی۔ اگر چھتری دھرم کا پاس کرتا تو ہلاک ہو جاتا۔ اس لئے کہا کہ دھرم بھرم کی باتیں چھوڑو۔ اس نے کہا کہ اس شرط پر دیتی ہوں کہ:

ترا زیں ہلاکت رہانم اگر　　　　درآری بعقد خودم چوں گہر

مجھے اپنے عقد نکاح میں لے آئیے۔ راجہ بیچارہ مرتا کیا نہ کرتا، ناچار قبول کیا، روٹی کھائی، پانی پیا، ذرا آسودہ ہوا تو وہ صنم غارت گر ہوش راجہ کو اپنے گھر پر لائی۔ اپنے لوگوں کو راجہ کے حسب و نسب سے آگاہ کیا، جب ان کو معلوم ہوا کہ راجہ اپنا جنم کا دھرم چھوڑ کر ان کی برادری میں شامل ہونا چاہتا ہے تو:

بدستور سر رشتہ دین خویش　　　　بہ بستند عقدش بآئیں خویش

اپنے دھرم کی رسم اور رواج کے مطابق راجہ کا بیاہ اس دوشیزہ سے رچایا۔

زکج بازی چرخ نیرنگ ساز　　　　گرفتار زاغاں شد ایں شاہباز

یہ بھی دنوں کا پھیر ہے کہ یہ شاہباز کوؤں کے پنجہ میں پھنس گیا۔

مباد اضطرار آفت حال کس　　　　کہ آتش بضعف است محتاج خس

اضطراری حالت کی یہی کیفیت ہے کہ آگ اس وقت تک نہیں بھڑکتی جب تک خار و خس کی مدد نہ ملے، اس لئے جب گھاس پھوس نہ ملے آگ زور میں نہیں آتی۔ اسی ضعف کی وجہ سے آگ "خس" کی محتاج ہے۔ "خس" ہر ایک حقیر و ذلیل شے کو کہتے ہیں۔

آنکہ شیراں را کند روبہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

راجہ اب بالکل چوہڑا تھا۔ اور اسی طرح دس سال کا عرصہ گذر گیا۔

شدے بے طلب ہمچو گل دبہار　　　　بہر سال فرزند نو آشکار

جس طرح بہار کے موسم میں گل خود رو خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں اسی طرح راجہ کے ہاں ہر ایک سال بیٹا نیا پیدا ہوتا رہا۔

گرہ ہا فزوں شد بدام دلش
کہ شد دہ گہرزاں صدف حاملش

اس کے دل پر ایک ایک کر کے گرہ پڑتی گئی جس سے اس کی وابستگی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ اس لئے اس صدف یعنی زوجہ سے دس موتی حاصل ہوئے۔ راجہ اب اپنی راجگی اور تخت و تاج کو بالکل بھول چکا تھا۔

قضا را ز چرخ سراپا ستیز
بر آں سرزمیں قحط شد فتنہ ریز

اتفاق سے اس سرزمین پر قحط نمودار ہوا۔ بیدل نے قحط کی سختی کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

قحط کی شدّت نے راجہ کو مجبور کیا کہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ کسی اور جگہ تلاش نان میں جائے۔ اِدھر اُدھر بہت پھرے ایک ہفتہ کے بعد ایک جنگل میں گزر ہوا۔ بھوک سے سب تنگ آچکے تھے۔ آخر سب نے یہ سوچا کہ روٹی تو ملنے سے رہی اس کی سختی کیوں برداشت کی جائے، اس لئے سب نے خودکشی کی ٹھان لی۔ اِدھر اُدھر سے لکڑیوں کا انبار جمع کیا، راجہ نے یہ گوارا نہ کیا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے جگر گوشہ اگنی کی بھینٹ ہوں، اس لئے سب سے پہلے خود آگ میں داخل ہوا۔ معًا اس نے اپنے سامنے اپنا تخت دیکھا اور وہی دربار اور وہی اہالیان دربار کھڑے دیکھے، راجہ حیران تھا کہ

چہ بود ایں کہ یک عمر در کوہ و دشت | در آغوش بیطاقتی ہا گزشت
خرد پردہ کز روئے کارش کشود | دو ساعت فزوں دور محنت نبود

ایک عمر میں کوہ وصحرا میں مارا مارا پھرتا رہا۔ وہ حکومت اور اختیار جو پہلے حاصل تھا اک دم جاتا رہا، اور میں کمزور و ناتواں ہیچ ذات کے آدمی کی طرح بسر کرتا رہا۔ یہ تمام دس سال کا عرصہ اور اس عرصہ میں جو کچھ محنت و مشقت کی دو گھڑی سے زیادہ نہ تھی، راجہ نے اپنی سرگزشت تو کسی سے بیان نہ کی، اب وہ بازی گر بھی موجود نہ تھا کہ اس کی حقیقت اس سے دریافت کرتا۔ لیکن رہ رہ کر وہ "تمنا" اور وہ "آرزو" جو دل میں ابھرنے کے لئے جوش مارتی تھی اور اب ایک حسرت و یاس میں مبدّل ہو رہی تھی، چین سے بیٹھنے نہ دیتی، اس لئے راجہ نے پھر صحرا نوردی کی ٹھان لی، کہ ممکن ہے کہ اس مقام کا سُراغ مل جائے جہاں دس سال بسر کئے۔ اسی طرح بہت عرصہ اسی جستجو میں گزر گیا۔ قضارا ایک جنگل میں گزر ہوا تو یہ ماحول کچھ شناسا معلوم ہوا۔ واقعات گزشتہ کی یاد تازہ ہو گئی اور آگے بڑھا تو "ہماں شہر کناس شد جلوہ گر"، وہی خاکروبوں کی بستی نظر پڑی جہاں اہل و عیال کے ساتھ دس سال گزارے تھے، اب راجہ اپنے گھر پر آیا۔ امید تو یہ تھی کہ فرزند و زن سے ملاقات ہو گی مگر دیکھا وہاں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے۔ فرزند و زن تو نظر نہ آئے مگر لواحقین گریہ و زاری کر رہے ہیں، راجہ نے دریافت کیا کہ تمہاری چیخ و پکار کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کئی سال کا عرصہ ہوا۔

جوانی چو خورشید عالی نژاد درین دشت از پیشگیہا فتاد

ایک جوان جس کا چہرہ سورج کی طرح جوت مارتا تھا اس جنگل میں آنکلا۔ اور ہم میں رہائش اختیار کی، شادی بیاہ کیا، بال بچے ہوئے اور اچھی بُری زندگی جیسی ہم سب کی ہے وہ بھی بسر کرتا رہا۔ قحط پڑ گیا اور وہ اہل و عیال کے ساتھ روزگار کی تلاش میں کہیں چلا گیا۔ اس کے بعد اس کا کہیں پتہ نہ ملا کہ کہاں گیا، راجہ نے ان کی دلجوئی کی اور بہت سامال بھی

دیا، پھر اپنے لشکر کے ساتھ اپنی راجدھانی کو لوٹا۔ اب یہ تو یقین ہو گیا کہ دس سال کا عرصہ خواب میں نہیں گزرا تھا بلکہ حقیقت ثابتہ ہے۔ لیکن ہر چند غور کیا مگر یہ گتھی سلجھ نہ سکی کہ دس سال ایک مقام کا عرصہ اس کی اپنی راجدھانی کی دو گھڑی کے برابر کیسے ہو سکتا ہے آخر ایک "رشی" کی خدمت میں حاضر ہوا اور تمام ماجرا عرض کیا۔ "رشی" نے کہا:

که اے مانده از مرکزِ اصل دور | نداری خبر از طلسمِ ظهور
بر وسعت در راز وا کرده اند | برمزِ ظهور آشنا کرده اند
فسوں گر نبود آں فریب آفریں | دل انگیخت نقش ہدایت کمیں
دل آئینۂ ہستی عالم است | وگرنه وجود و عدم مبهم است
دل آور د مراتِ تحقیق ذات | ازیں نسخه زد جوش حرف صفات
بتقیید دل اُلفت زندگی ست | زتحریکِ دل موج پایندگی است
طلسمِ جہاں گرد ویرانه است | عمارت در و عکس ایں خانه است
مکانہا ہمه از دل آمد پدید | جہت ہا ازیں بے جہت سر کشید
چه ذہن و چه خارج خیال دل ست | چه اصل و چه فرع از نہال دل ست
گماں ہا ہمه نقش تکوینِ او ست | یقیں یک گل از باغ تسکینِ او ست
مشو غافل از باغ نیرنگ دل | که علم و عیاں نیست جز رنگ دل
بظاہر ترا گرچه دل در بر است | بمعنی تو لفظی و دل دفتر است
یکے فہم خود کن تو خود کیستی | ازاں پرده دل برون نیستی
دلت ہرچه اندیشد اندر خیال | بود جمله منقوشِ لوحِ مثال
گل و گلشن دل مثال است و بس | خیال آنچه بیند خیال است و بس
دریں دائره ذہن خارج یکی است | تفاوت اگر ہست جز وہم نیست
تعلق بہار فریب دل است | تو ہم گل ناشکیب دل است
وگرنه ندارد بہار شہود | بغیر از تو از خود گلے در وجود

دریں بحر طوفاں غیر تو نیست — دریں کوچہ جز گرد سیر تو نیست
خیال تعلق دریں خاکداں — بود عرض اسباب وہم و گماں
خیالت چو رنگ تنزل گزید — ز تخت تجرد بخاک مذلت کشید
پے سوختن تا نہ بستی کمر — نشد صورت راحت جلوہ گر
برستن ز او ہام اُمید و بیم — عیاں شد کہ ہر جائی خویشی مقیم

رشی جی نے "گیان" کی باتیں راجہ سے کیں کہ "راجن تو اپنے اصل کے مرکزی مقام سے دور اُفتادہ ہے۔ تجھے اس سرشٹی یعنی ظہور کی حقیقت معلوم نہیں۔ یہ سب کچھ جو تجھ پر گزرا اس کی غرض و غایت اتنی ہی تھی کہ تجھے ظہور کے اسرار سے آگاہی ہو۔ وہ بازیگر جس نے یہ سب شعبدہ بازی کی دراصل تیرا اپنا ہی دل ہے جس نے یہ کرشمے دکھائے، دل ایک آئینہ کی مثال ہے جس میں کائنات کی ہستی منعکس ہوتی ہے۔ اور اگر یہ نہ ہو تو وجود و عدم اور ہستی اور نیستی بے معنی بات ہو جاتی، اسی آئینہ دل میں ذات مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوئی، ان صورتوں کو صفات سے موسوم کیا گیا جیسے معانی حروف میں منکشف ہوتے ہیں۔ ذات تو حقیقت واحدہ مجردہ ہے۔ اس کی ہستی کا احساس ناممکن تھا اگر وہ صفات کی صورتوں میں رونما نہ ہوتی۔ اور یہ نمائش تیرے آئینہ دل میں ہی ہو رہی ہے۔ زندگی سے وابستگی بھی حقیقت میں دل کے تعلق نے پیدا کر رکھی ہے۔ اور اس زندگی کی پایندگی بھی دل کی تحریک ہی ہے۔ یہ طلسم جہاں جس کی سیر تو کر چکا ہے اور کر رہا ہے اصل میں ایک ویرانہ کا غبار ہے۔ اسی آب و گل سے تو اپنے خانۂ دل کی تعمیر کر رہا ہے۔ دل نہ شرقی ہے نہ غربی، وہ جہات سے منزہ ہے لیکن تمام جہات اور زمان و مکان اسی کے پیدا کردہ ہیں اور تمام کائنات جس میں مکان و زمان ہیں دل ہی میں سمائے ہوئے ہیں، دل سے باہر عدم ہیں۔ یعنی خارج از دل ان کا وجود نہیں، خواہ یہ ذہنی امور ہوں یا خارجی حالات ہوں سب دل کے

خیالات ہیں (   ) یہ شجر دل ہی ہے خواہ اس کی جڑیں ہوں یا شاخیں یا پتے۔ خواہ گمان و وہم یا یقین ہو سب دل کے نقوش ہیں البتہ یقین سے دل کو ایک گونہ تسکین حاصل ہوتی ہے مگر یہ بھی دل ہی کی ایک کیفیت ایسی ہی ہے جیسے گمان، دل ایک باغ ہے جس میں طرح طرح کی نیرنگی تو مشاہدہ کرتا ہے خواہ یہ علمی صورت ہو یا ذہنی امر یا خارج میں اعیان ہو دل ہی کے رنگ میں رنگین ہیں۔ یعنی ان کا وجود دل ہی میں ہے دل سے باہر متصوّر نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھنا چاہیئے۔ اگرچہ دل بظاہر تیرے اندر ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ تو صرف ایک لفظ کی صورت ہے دل معانی کا دفتر ہے۔ انسانی دل کی حقیقت ہی دل ہے۔ مولوی معنوی کہتے ہیں کہ :

ای برادر تو ہمیں اندیشۂ   مابقیٰ تو استخوان وریشۂ

اب تجھے خود سوچنا چاہیئے کہ تو خود کیا ہے؟ تو خود دل کے اندر ہی ہے۔ اس پردۂ دل سے تو باہر نہیں ہے۔ یہ دل کی قابلیت ہے کہ جو کچھ خیال کرتا ہے اس کی مثالی صورت جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ یہ گل اور گلشن سب مثالی صورتیں ہیں، جو کچھ خیال چاہتا ہے ایک خیالی صورت بنا لیتا ہے۔ اس دائرہ کائنات یا تیرے دائرہ دل سے خارج ایک "ذہن" ہے، اسی ذہن کے تصورات یہ کائنات ہے اور اسی کائنات کے نقوش تیرے دل پر ثبت ہیں۔ دراصل ایک ہی "دل" ہے۔ اس لئے ذہنی اور خارجی امور یا عالم غیب و شہادت میں کچھ فرق نہیں غیب میں بھی وہی کچھ ہے جو شہادت میں ہے ہمیں اگر کچھ تفاوت نظر آتا ہے تو یہ کرشمہ "وہم" ہے، "وہم" پر بیدل نے مثنوی طلسم حیرت میں مفصل بحث کی ہے اور اسی کے تحت ہم بھی اس پر بحث کریں گے۔ آیہ کریمہ قرآن بھی اس کی تائید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خلقت میں تفاوت نہیں ہے۔ یہ تعلق جو ذہن اور خارج میں ہے اور جو علاحدہ علاحدہ نظر آتا ہے ایک فریب نظر ہے، تو خود بھی دل ہی کا ایک گل ناشگفتہ ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے

کہ بہارِ شہود میں تیرے سوا اور کوئی گل نہیں۔ اس طوفانی بحر میں تیرا غیر موجود ہی نہیں، تو اپنے دل ہی میں سیر کر رہا ہے۔ یہ تعلق کا خیال اس زمین دل میں صرف وہم و گمان کا کرشمہ ہے۔ زمین پست اور آسمان بلند نظر آ رہا ہے۔ جب تیری نظر پستی کی طرف گئی، تو تخت کی بلندی سے خاک مذلت پر گرا۔ اور اس تعلق کا نقش ایسا گہرا ہے کہ تو ابھی تک اسی سے اپنے آپ کو وابستہ سمجھ رہا ہے، بلکہ اس کو غنیمت شمار کرتا ہے، جب تک تو آگ میں جلنے کیلئے کمربستہ نہ ہؤا تمام کلفت اور پریشانی کا بھی خاتمہ نہ ہؤا اور پھر سے تخت راحت پر متمکن نہ ہؤا۔ جب تو "امید و بیم" سے کنارہ کش ہؤا تو تجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ تو اپنی اصلی جگہ پر ہی مقیم ہے، نہ کہیں گیا اور نہ کہیں سے آیا۔

ہم نے ان ابیات کی ترجمانی تو کی ہے مگر یہ فلسفہ دقیق ہے۔ چونکہ بیدل نے اور مقامات پر اس کی تشریح کی ہے اس لئے سر دست یہاں بحث کی ضرورت نہیں۔ اتنا اشارہ کافی ہے کہ تمام کائنات ایک واحد دل کے تصورات ہیں۔ یہ مذہب اہلِ تصوّف کا ہے اور گذشتہ صدی میں "بشپ بارکلے" نے اس فلسفہ یا نظریہ پر مدلل بحث کی ہے، یونانی فلسفہ "سوفسطہ" کا بھی یہی نظریہ ہے کہ عالم خیال ہی ہے۔ لیکن اسلامی تصوف یہ ہے جسے مولانا جامی نے اس رباعی میں بیان کیا ہے۔

سوفسطائی کہ از خرد بے خبر است | گوید عالم خیالے سر بسر است
آرے عالم ہمیں خیال است ولے | جاوید در و حقیقتے جلوہ گر است

جہاں تک اس عالم صورت یا محسوسات کا تعلق ہے یہ خیالات یا تصوّرات یا بقول بیدل یہ صرف صورتیں ہی ہیں۔

دلت ہرچہ اندیشد اندر خیال | بود جملہ منقوش لوح مثال

لیکن انہی صورتوں میں حقیقت رونما ہو رہی ہے۔ جس طرح حروف

میں معانی یہ "حجاب صور" (من وراءِ حجاب) ہی ہے جس میں اہلِ ذکر و فکر حقیقت کی تلاش کرتے ہیں جو "الغیب" ہے۔ اور ناممکن ہے کہ بشر کو حقیقت مجردہ کا احساس ہو جب تک وہ کسی صورت میں رونما نہ ہو۔

ان ابیات میں "رشی" کی زبانی یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ انسان کو سوچنا چاہیئے کہ وہ خود کیا ہے؟ "انسان" اور اس کی حقیقت پر بھی. بیدل نے چہار عنصر اور دیگر تصانیف میں مفصل بحث کی ہے. بیدل کا نظریہ کائنات اور ہستی ہم مناسب مقام پر بیان کریں گے۔ ان ابیات میں بیدل یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ "دفترِ دل" کا ایک لفظ یا صحیفہ فطرت کی ایک آیت انسان ہے۔ آیات بے شمار ہیں، لیکن انسان کو یہ فضیلت حاصل ہے "علمہ البیان" وہ ان آیات کا مشاہدہ بھی کرتا ہے اور اس کو ان کا فہم بھی حاصل ہے اور ان کو بیان بھی کرتا ہے۔

بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہماری معرفت سے بے نیاز ہے۔ وہ غنی عن العالمین ہے، تخلیقِ انسان کا منشا یہ ہے کہ انسان اپنے مرتبہ سے واقف ہو۔ چنانچہ مزامیر، نے اور طنبورا اور چنگ وغیرہ کی صفت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک رات میں ہستی کی گتھی سلجھانے کی فکر میں غلطاں تھا کہ:

دریں حالت از چنگم آمد بگوش   نوائی کز و آب شد رنگ ہوش

اس حالت استغراق میں چنگ کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ یہ نوا کیا تھی ہوش و حواس ففرو ہو گئے۔

کہ اے سربسر نقش دیوانگی   ہمہ پردہ ساز بیگانگی

کہ تو بھی عجیب دیوانہ ہے بلکہ مجسم دیوانہ ہے جو اپنے ہی ساز سے اتنا بیگانہ ہے کہ غیر اور "غیریت" کی نغمہ سرائی کرتا ہے۔

چو آئینہ چنگ داری بہ پیش   مشو غافل از صورتِ حالِ خویش

چنگ آئینہ ہے اور اس میں تیری ہی صورت ہے اور تیری ہی آرزو تیرے ہی دم اور ہاتھ سے نکل رہی ہے۔

توئی قبلۂ خود چو محرم شوی — تو محراب خویشی اگر خم شوی

اگر تو اس راز سے واقف ہو تو معلوم ہوگا کہ تو اپنا آپ "قبلہ" ہے، آئینہ میں تیرے روبرو تو ہی ہے اور ذرا تفکر سے کام لے اور جھک کر اپنے اندر نظر کرے تو تو ہی اپنا آپ محراب ہے۔

ساتویں دَور کے شروع میں بیدل لکھتا ہے:

دریں گنبد بے در آسماں — ز بیگانہ تا چند جوئی نشاں

یہ آسمان ایک گنبد ہے جس کا کوئی دروازہ آمد و رفت کا نہیں، اور تو اس گنبد میں موجود ہے اس لئے سوچنا چاہیئے کہ اگر اس گنبد کا کوئی دروازہ ہوتا اور کھلا ہوتا تو تیرا غیر باہر سے آتا یا اندر سے باہر جاتا اگر کوئی اس خانہ بے در میں مکیں ہے تو تو ہی ہے اس لئے کسی بیگانہ کا نشان تجھے یہاں ڈھونڈنے سے نہ ملے گا۔

بچشم تو نقش سوائے تو نیست — بگوش تو غیر از صدائے تو نیست

تو جو بھی نقش دیکھ رہا ہے وہ تیرا ہی تصوّر ہے۔ دیکھنے والی تیری ہی آنکھ ہے۔ اس گنبد میں تیری ہی آواز گونج رہی ہے۔

بوہم و گماں بر چہ پیچیدۂ — چرا خویش را غیر فہمیدۂ

وجہ کیا ہے کہ تو وہم و گمان میں اُلجھا ہوا ہے۔ اور اپنے آپ کو اپنا غیر سمجھ رہا ہے۔

گمان عدم، وہم ہستی، ز تست — خمار از تو سر جوش مستی ز تست

یہ عدم اور ہستی کا وہم و گمان جو تجھے اضداد اور ایک دوسرے کا غیر دکھلا رہا ہے۔ یہ بھی نقش عدم و ہستی تیرا ہی تصوّر اور تیرا ہی پیدا کردہ ہے۔ یہ خمار جو دردسر کا موجب بنا ہوا ہے۔ یہ بھی تیری اپنی ذات کا نتیجہ ہے اور

مستی کا جوش بھی تیری ذات ہی کا کرشمہ ہے۔

زجائے دگر نیست ایں گفتگو　　تو ئی منشاءِ غفلت و جست و جو

حقیقت یہ ہے کہ تیرے دل میں جو ایک تڑپ ہے کہ تو رازِ ہستی معلوم کرے یا اس طرف سے بالکل غافل ہے تو یہ غفلت اور یہ جستجو غرض ہر ایک حال کا مقصد خود تو ہی ہے یعنی اگر تلاش در پیش ہے تو جس شے کی تلاش ہے وہ تو ہے۔ اس لئے تو اپنی حقیقت کا فہم حاصل کر۔

یکے ہمچو خم در گریبان خویش　　نظر کن بہ بیں جوش طوفان خویش

کبھی خم یعنی مٹکے کی طرح اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھ اور اپنے ہی طوفان کا جوش دیکھ، اگر شراب ہے تو مٹکے کے اندر ہے اور اگر شراب جوش مارتی ہے تو اسی مٹکے کے اندر، اس لئے خم بھی تو اور شراب اور نشہ بھی تیرے ہی اندر ہے۔

ز شور تو ایں بزم دارد خروش　　ز خاموشی تست عالم خموش

جب تک تو زندہ ہے تمام کائنات زندہ ہے تو خاموش ہؤا تو جہاں تک تیری ذات کا تعلق ہے تمام عالم عدم ہے۔

طلسمِ جہاں پردۂ ساز تست　　تہی از خود و پر ز آواز تست

یہ جہاں ایک طلسمی کارخانہ ہے، یہ سمجھ کر کہ تیرے ہی سازِ وجود کا پردہ ہے۔ تیرے ہی چھیڑنے سے اس میں سے آوازیں نکل رہی ہیں۔ ورنہ یہ عالم طنبور کی طرح خود کھوکھلا اور اندر سے خالی ہے۔ آوازیں اور نغمات تو ہی پیدا کر رہا ہے۔

چہ وا ماندۂ در غم این و آں　　طلسم خیالی ست نقشِ جہاں

تو اس جہاں میں سرگرداں کیوں ہو رہا ہے، یہ نقشِ عالم سب ایک "دل اعظم" کے تصورات ہیں، سورج کی طرح تو اپنی ہی کرنوں کے خط پر گردش کر رہا ہے۔ اسی طرح تیرا راستہ تیرا ہی خط شعاعی ہے اور منزل بھی

تیرا اپنا آپ ہے جب تو اپنی حقیقت سے واقف ہو جائے گا تو رازِ ہستی بھی تجھ پر کھل جائے گا کہ تیرے ہی دم سے ظہورِ عالم ہے۔ بیدل کا نظریۂ حیات یہ ہے کہ منشاء فطرت ہے کہ انسان خود شناس ہو۔ اور جب خود شناس ہو جائے گا تو اس پر "الغیب" یعنی ان امکانات کا انکشاف ہوگا جو کائنات کے ذرہ ذرہ میں پوشیدہ ہیں، اور اس علم کے بعد اس پر اپنے حقیقی مقام یا منزل کا انکشاف بھی ہوگا۔ انسان گمراہ کن وہم میں اُلجھا ہوا ہے کہ اپنے آپ کو اغیار کا محتاج سمجھتا ہے حالانکہ جس چیز کی طلب وہ غیر سے کرتا ہے وہ اس کے اپنے پاس ہے۔

بھیکا بھوکا کوئی نہیں سب کی گٹھڑی لال
گرہ کھول نہیں جانتے اس بدبہے کنگال

خواجہ حافظ بھی یہی کہتا ہے کہ

سالہا دل طلب جام جم از ما می کرد
آنچہ خود داشت زبیگانہ تمنا می کرد
گوہری کز صدف کون و مکاں بیروں بود
طلب از گم شدگاں لب دریا می کرد

بیدل کہتا ہے کہ

یکے در پس زانوئے خود نشیں — رخ خود در آئینۂ خود بہ بیں
تماشائے ہستی ہمیں است و بس — دریں بزم ہستی ہمیں است و بس
در آئینۂ عالم رنگ و بو — نبا شد نمودار جز نقش تو
چو نظارۂ خیر و شر می کنی — بہ نیک و بد خود نظر می کنی
مخور عشوۂ ہر کس و ناکسے — تو گر نیستی نیست ایں جا کسے
زتحقیق عالم چہ خواہد کشود — کہ از وہم ہم وہم خواہد نمود
مکن صید غیر از کمیں گاہ خویش — دراں کوش تا گردی آگاہ خویش

کہ با خود بیک لحظہ پرداختن
تواں کار ہر دو جہاں ساختن

انسان اپنی انفرادی حیثیت کا جائزہ لے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ "آپ مرے جگ پرلو" اگر وہ خود جہاں میں نہ ہو تو جہاں تک اس کی انفرادی زندگی کا تعلق ہے جہاں عدم ہے، تو جو کائنات یا ہستی عالم کا راز معلوم کرنا چاہتا ہے تو سمجھ لے کہ خواہ مخواہ دردِ سر مول لے رہا ہے۔ تیرے سوا جو کچھ بھی ہے سب موہوم ہے۔ وہم کا انکشاف آخر وہم ہی ہوگا۔ "باطل از باطل بروید حق زحق" تجھے وہم وہم میں اُلجھا رہا ہے۔ تو بغرض تحقیق اس طرح گھات میں بیٹھا ہُوا ہے جس طرح شکاری شکار کے لئے۔ تو "غیر" کا شکار کرنا چاہتا ہے۔ تجھے کوشش یہ کرنی چاہیئے کہ خود آگاہ ہو۔ اگر ایک ساعت بھی "باخود" ہوگا تو دو جہانوں کی مشکلات حل ہو جائیں گی۔

جب "میاں مٹھو" کو پڑھانا منظور ہوتا ہے تو آئینہ اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اور پڑھانے والا آئینہ کے پیچھے بیٹھ کر چند الفاظ کہتا ہے۔ طوطا آئینہ میں اپنی شکل دیکھتا ہے۔ لیکن اتنا شعور نہیں ہوتا کہ یہ اس کا اپنا عکس ہے، وہ اتنا سمجھتا ہے اس کا ہمجنس بول رہا ہے۔ تو یہ بولی وہ خود بولنے لگتا ہے، حافظ کہتا ہے کہ:

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

اسی ضمن میں "وحی" کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ لیکن سردست یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ آئینہ تیرا اپنا قلب ہے، اور اسی آئینہ میں تو اپنا آپ ہی دیکھ رہا ہے، لیکن غلط فہمی سے سمجھتا ہے کہ تو غیر کو دیکھ رہا ہے غیر کی آواز سُن رہا ہے، حالانکہ جسے تو محسوسات کہتا ہے وہ تیرے ہی حواس کا احساس ہے غرض تیرے ہی دل یا قلب میں کل کائنات سمائی ہوئی ہے تو ہستی کا مشاہدہ اپنے دل سے باہر نہیں کرتا لیکن یہ عجیب طلسمی کارخانہ دل ہے کہ تو سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہے وہ تجھ سے باہر ہے،

حالانکہ جو کچھ تو مشاہدہ کر رہا ہے وہ تیرے ہی دل میں ہے۔ بیدل ایک اور مقام پر لکھتا ہے کہ غیب و شہادت یا ظاہر و باطن اعتباری اور نسبتی امور ہیں۔ مثلاً ہم اجرام سماوی کو بہت دور اپنے سر پر بلند دیکھتے ہیں، اور خیال کرتے ہیں، کہ ہم پستی میں رہتے ہیں۔ اگر ہم کسی سیارہ میں ہوں تو ہم زمین کو بھی اتنی دور دیکھیں گے جتنا یہ سیارہ زمین سے بلند نظر آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم جو کچھ مشاہدہ کرتے ہیں وہ خود اشیا نہیں ہیں۔ بلکہ اشیا کی "ظل" ہیں جن کو ہم "صورت" سے موسوم کرتے ہیں، یہ عالم صورت یعنی رنگ و بو ہی ہے۔ یہ وہ صورتیں جو ہمارے حواس محسوس کرتے ہیں، باصرہ میں رنگ اور روپ اور سامعہ میں آوازیں اور علیٰ ہذا القیاس، ہر ایک شے صرف صورتوں کا مجموعہ ہے جو ہم محسوس کرتے ہیں اور ہمارے حواس صورتوں کے سوا کچھ محسوس کر ہی نہیں سکتے۔ لیکن ہم کو ایک اور ذریعہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اشیاء محض صورتیں ہی نہیں ان صورتوں میں حقائق بھی رو نما ہو رہے ہیں۔ ان حقائق کا انکشاف ہمارے قلب پر ہوتا ہے۔ اس موضوع پر مزید بحث مناسب مقام پر کی جائے گی۔ سر دست سوال صرف یہ ہے کہ "حق" کا انکشاف ہم پر کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور وہ کیا معیار ہے جس پر حق و باطل پرکھا جا سکتا ہے؟ اس لئے بحث تحقیق پر آرہی ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ:-

بدیلوانِ ہستی سخن ہا بسے است   ازاں جملہ یک حرف تحقیق نیست

لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں اور باتیں بنانے والے بھی بہت ہیں، حرف تحقیق کسی سے نہ سنو گے۔

ازاں نقشِ کارِ جہاں ابتر است   کہ آثار تقلید یک دیگر است

دنیا کے کاموں میں خرابی کی وجہ یہی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی تقلید کرتے ہیں اور کرتے چلے آرہے ہیں۔

زبس درس تقلید شد آشکار نشد ہیچ کس واقف از اصل کار

جس کی بات سنو وہ کچھ اپنی تحقیق اپنا مشاہدہ اپنا تجربہ بیان نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے تو لوگوں کو اپنی بات ہی منوانا چاہتا ہے مقلدین اس کو مل جاتے ہیں اور وہ اس کی باتوں پر فریفتہ اور دوسروں کو فریفتہ کرتے ہیں، اصل حقیقت سے واقفیت تو اسی صورت میں ہو سکتی ہے اگر ہم علیٰ وجہ بصیرت اس کی باتوں کو وزن کریں۔ لوگ اندھا دھند تقلید کرتے ہیں اور جس شخصیت کی تقلید کرتے ہیں اس کو خدائی درجہ دیتے ہیں۔ ایسے معبود لوگوں نے بہت بنا رکھے ہیں اور ان میں اختلاف اور شر انگیز تفرقہ بھی ہے۔ یہ کہنا کچھ بے جا نہیں کہ اسی تقلید کا کرشمہ ہے کہ عالمِ انسانی میں فتنہ و فساد بر پا ہے، اگر ان پر حق کا انکشاف ہوتا تو سب امن سے زندگی بسر کرتے۔ اس لئے کہ حق میں اختلاف نہیں۔

بخار از دماغ یکے شد بلند رسانید وہمش بگردوں کمند

ایک شخص کے دماغ میں کوئی خیال پیدا ہوا۔ اسے یقین ہو گیا کہ حق یہی ہے، اب وہ آسمان سے باتیں کرنے لگا، کہ اسے آسمان سے الہام ہو رہا ہے۔

یکے فکر جمع کُتب می کند زاوراق سبب حجب می کند

بعض اشخاص کتابیں جمع کرتے رہتے ہیں۔ کتابوں میں مصنفین کے خیالات ہی تحریر ہوتے ہیں، یہ پڑھتا ہے اور تقلیداً انھیں سچ یقین کرتا ہے، اس لئے یہی کتابوں کے اوراق اس کے ذہن پر پردہ کا کام دیتے ہیں، وہ خود نہیں سوچتا کہ ان کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے کہاں تک صحیح ہے۔ وہ انھیں اس حد تک صحیح یقین کرتا ہے کہ اپنا زورِ طبع ان کی تائید پر صرف کرتا ہے، اس طرح اکثر کتابوں کی شرح لکھی گئی۔

یکے شد مہندس بگفت و شنید یکے ساغر فیلسوفی چشید

ریاضی دان تو چند آدمی گزرے ہیں۔ انہی کی کتابوں کو رٹ کر لوگ ریاضی دان مشہور ہو جاتے ہیں، ابوالفضل کے دفتر پڑھ کر لوگ منشی فاضل بن جاتے ہیں۔ افلاطون اور ارسطو کا فلسفہ پڑھ کر لوگ فلسفی بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ مدرسوں میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔

یکے خاک را گفت تمکیں شعار   یکے گفت گردوں ندارد قرار

پہلے حکماء کا یہ نظریہ تھا کہ زمین ساکن ہے اور تمام اجرام سماوی اس کے گرد گردش کرتے ہیں۔ آج یہ نظریہ باطل ہو گیا۔ ایک مدت دراز تک۔

بوہم و گماں جمعے از پیرواں   نکردند جز کسب تصدیق آں

لوگ اسی نظریہ کو صحیح یقین کرتے رہے اور اسی مفروضہ کو صحیح قرار دیکر کائنات کی گتھی سلجھاتے رہے، اور دلوں کو تسکین دیتے رہے کہ ہم کو کائنات کا راز معلوم ہو گیا۔ لیکن اس عرصہ میں تحقیق و تصدیق کی زحمت ہی گوارا نہ کی۔

ندیدند از عقل جہل اکتساب
کہ ہست از چہ رہ ایں سکون و شتاب

کسی نے کوشش نہ کی کہ پہلے یہ تو تحقیق کرے کہ "حرکت" اور "سکون" کیا ہے؟ اس کے اسباب کیا ہیں؟ اگر کبھی کچھ عقل سے کام لیا تو جہل ہی کسب کیا۔

دمے کز حقیقت بیاں می کند   حوالت بفہم کساں می کند

اگر کوئی ان اسباب کو بیان بھی کرتا ہے تو حوالہ متقدمین کے اقوال ہی کا دیتا ہے۔

کہ آں بحر دانش چنیں گفتہ است
درمعرفت ایں چنیں سفتہ است

کہ فلاں بحرالعلوم نے یہ اور وہ فرمایا ہے۔ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔
معرفت کے آبدار موتی اسی نے جمع کئے۔ یہ سلک مروارید اسی نے تیار کی۔

کسے تکیہ برفہم مردم کند — کہ چوں جہل راہ خرد گم کند

بیدل کہتا ہے کہ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہی شخص دوسروں کی عقل کا سہارا لیتا ہے جو خود عقل سے بے بہرہ ہے۔ یعنی جاہل ہے۔ اس لئے تقلید اور جہالت لازم وملزوم ہے۔

قیاس وگماں خصم دانائی است — سراپائی تقلید رسوائی است

تحقیق اور شے ہے اور قیاس اور گماں اور چیز ہے۔ آخرالذکر یعنی قیاس و گمان عقل کی دشمن ہیں اور تقلید عقل ہی کی رسوائی ہے۔

دمے کامتحاں آشکارا شود — مقلد بہ تحقیق رسوا شود

مقلد کی شناخت یہ ہے کہ جب اس کے علم کا امتحان کیا جائے تو جاہل ہی ثابت ہوگا۔ اس ضمن میں بیدل نے ایک حکایت لکھی ہے کہ

فضولے بآئین کار آگہاں — بلاف سخن بود گرم بیاں

ایک فضول بیہودہ گو اہلِ تحقیق کی طرح باتیں بنا رہا تھا۔ کہ میں نے اکثر دریا کا سفر اس طرح کیا ہے جس طرح بادل کرتا ہے تجارت پیشہ ہوں اور اسی ذریعہ سے کشتی کی طرح کئی دریاؤں سے عبور کر چکاں۔

زمن معنی بحر پوشیدہ نیست — دریں نسخہ حرفے نفہمیدہ نیست

مجھے بحر کے تمام حالات کا علم ہے اور کوئی ایسی بات بھی تو نہیں جو میں نہیں سمجھتا۔ جو لوگ ساحل پر رہتے ہیں انھیں سمجھاؤں تو کیسے سمجھاؤں کہ انھوں نے کبھی سمندر کو دیکھا تک نہیں۔

یکے گفت زیں جملہ سیر وسفر — زماہی اثر بردہ باشی مگر

حاضرین میں سے ایک نے کہا کہ آپ نے اتنی سیر وسفر میں مچھلی تو ضرور دیکھی ہوگی۔

کہ چوں دیدہ در آب دارد وطن زداغ است ہمچوں دلش پیرہن

مچھلی کی مشابہت صورت آنکھ سے ہے دونوں پانی میں ڈوبی رہتی ہیں اس تشبیہ نے شعر میں لطف پیدا کر دیا۔ کہ آنکھ کی طرح پانی میں اس کا وطن ہے اور اس کا لباس تمام داغدار دل کی طرح ہے۔ اس یاوہ گو نے بگڑ کر کہا کہ یہ کیا سوال ہے۔ اس تمام سفر میں یہی مچھلی تو میری غذا تھی، سائل نے جب دیکھا کہ آپ اس قدر عتاب فرما رہے ہیں تو کہا کہ حضور میں مچھلی اور اس کے حالات سے بالکل ناواقف ہوں۔ اگر سوال کیا تو خفا نہ ہوں۔ اگر کچھ بیان فرمائیں تو میں قیاس کر لوں گا۔ کہ مچھلی کی کیا شکل و صورت ہوتی ہے۔ اس بیہودہ گو نے کہا کہ ہوشمند مچھلی وہی ہے جس کے سر پر اونٹ کی طرح دو سینگ ہوتے ہیں۔" بہ بیں اشتر و ماہی ایجاد کن" اونٹ دیکھ لو اور اس پر مچھلی کو قیاس کر لو۔ تمام حاضرین قہقہہ مار کر ہنسے اور سمجھ گئے کہ" چو ماہی شتر نیز کم دیدہ است" کہ مچھلی تو دیکھی نہیں اونٹ بھی نہیں دیکھا۔ بیدل کہتا ہے کہ

چہ لافی بحرف کساں خامہ وار صریرے ز تحقیق خود ہم برآر

لوگوں کی باتیں سن کر وہی لوگوں سے باتیں کرنا اور اس پر فخر کرنا کہ میں صاحب علم ہوں یا مجھے لوگ عالم سمجھ کر عزت کریں، نہایت ناواجب بات ہے قلم حروف تو لکھتا ہے مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ حروف شناسی قلم کو حاصل نہیں۔ اس لئے شایان انسانیت یہی ہے کہ تو اپنی تحقیق اگر کچھ ہے بیان کرے۔ اس موضوع پر مولانا رومیؒ نے بھی لطیف بحث کی ہے کہ بعض لوگ اہل اللہ کی سی باتیں کرتے ہیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح شکاری جانوروں کی بولیاں بولتے ہیں۔ جانور اپنے ہم جنس کی بولی سن آتا ہے اور جال میں پھنس جاتا ہے اسی طرح یہ ریاکار فریبی لوگوں کو پھانس لیتے ہیں وہ تو سمجھتے ہیں کہ حضرت مقربان میں سے ہیں مگر کیا معلوم کہ نرے باتونی ہی ہیں۔ عقل کے اندھے اور گانٹھ کے پورے اکثر پھنس جاتے ہیں۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست پس نباید داد در ہر دست دست

اکثر آدمی آدم صورت شیطان ہوتے ہیں اس لئے ہر ایک کے ہاتھ پر بیعت نہ کرنی چاہیئے۔

عرفان

مثنوی "عرفان" کے گیارہ ہزار ابیات ہیں، اس مثنوی کے اختتام پر بیدل نے تاریخ تصنیف کہی ہے کہ

وضع ابیات این خیال نمود — جز خطے چند در خیال نبود
لیک ہرگاہ در شمار آمد — بر زبان یازدہ ہزار آمد
کرد تاریخ او نیاز ارقلم — ہدیہ ذوالجلال والاکرام

۱۱۲۴ھ

اس مثنوی میں بیدل نے دادِ تحقیق دی ہے۔

علم تحقیق می کند تلقین — کہ در آئینہ ظہور یقین
تا بہ افشا نمی رسد اسرار — محو گیر از تحققش آثار

علم تحقیق یہ ہے کہ کسی امر، کسی شے، کسی واقعہ کے بارہ میں یقین نہیں ہو سکتا جب تک وہ "اسرار" یعنی پوشیدہ ہے۔

جب تک وہ کسی صورت میں رونما نہ ہو جسے ہمارے حواس محسوس کریں۔ اس حالت پوشیدگی میں وہ "ہیولیٰ" سے تعبیر ہوتا ہے، اور جب تک محسوس و مکشوف نہ ہو یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ جہاں تک ہمارے علم یقین کا تعلق ہے بمنزلہ عدم ہے۔

اعتبار طبیعت بیرنگ — از ہیولیٰ شد اشتہار آہنگ

یہ "طبیعت بیرنگ" ہے جو ہیولیٰ کے نام سے اصطلاح میں مشہور ہے۔ ہر ایک شے کی "طبیعت" خود بیرنگ ہے، اور جب تک کوئی شے کسی رنگ و روپ میں محسوس نہ ہو اس کا انکشاف ہم پر نہیں ہو سکتا، یہی "طبیعت بیرنگ" جس کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ کیا ہے ہیولیٰ کے نام سے تعبیر ہوتی ہے اور اس کی موجودگی کا احساس اس صورت سے ہوتا ہے جس میں وہ رونما ہوتا ہے، اس لئے یہ صورت محض اشارہ ہے جو ہیولیٰ کی ہستی کی طرف ہے، یا جیسا کہ بیدل نے اور مقام پر کہا ہے۔ حروف یا "کسوت عبارت" ہے جس میں معانی پوشیدہ ہیں۔ اصل شے یہی "ہیولیٰ" ہے، ایک غزل کا مطلع ہے کہ

یک دو دم ہنگامۂ تشویش مہر و کینہ بود
ہر چہ دیدم یہاں خانۂ آئینہ بود

زندگی ایک دو دم ہی ہے، یہی سانس ایک آتا اور وہی دوسرا جاتا ہے، اس لئے زندگی بھر "مہر و کینہ" نے پریشان رکھا، یعنی مہر و کینہ ہی ہے جس سے رشتۂ تعلقات اس دنیوی زندگی میں انسان کا اپنے ہم جنس انسانوں سے بلکہ کائنات کی اشیا سے ہے کہ کسی طرف طبیعت مائل ہوتی ہے اور کسی شے سے نفرت ہوتی ہے لیکن جب میں نے بغور دیکھا تو یہ جذبات مہر و کینہ آئینۂ دل پر صورتوں کا نقش ہی تھے، اور زندگی کے ساتھ محو ہو گئے، آئینہ میں کوئی صورت مستقل نہیں ہوتی۔ اس غزل کا ایک شعر ہے کہ

ہیچ شکلے بے ہیولیٰ قابلِ صورت نہ شد
آدمی ہم پیش ازاں کآدم شود بوزینہ بود

"ہیولا" کی موجودگی مقدم ہے اور جب تک یہ نہ ہو کوئی شکل متصور نہیں ہو سکتی، اس لئے صورت آدم کا "ہیولا" "بوزنہ" تھا، کہ اسی سے ارتقا کرتا ہوا آدم انسانی صورت میں آیا۔ لیکن بندر کی صورت تو محسوس ہوتی ہے،

اس لئے یہ ابتدائی ہیولا نہیں ہے۔ بندر کا ہیولا بھی کچھ اور ہونا چاہیئے۔ جو اس سلسلہ کی ایک کڑی ہی ہوگی، پہلی کڑی حسب ارشاد قرآن "نفس واحدۃ" ہے جو "طین" سے ارتقاء کرتا ہوا آخر انسان بنا۔ اسی طرح اس شہادت کی رُو سے انسانی ہیولا اس صورت کا ہوگا جو "خلق جدید" میں رونما ہوگی، اس کا صحیح تصوّر ہم موجودہ حالت میں نہیں کرسکتے، لیکن جس طرح بندر انسان کے بہت مشابہ ہے اسی طرح انسان کے مشابہ وہ صورت ہوگی جو "خلق جدید" میں متوقع ہے۔

فکر ہر جا رموز تخم شگافت   جز ہیولائے برگ و بار نیافت

درخت کا "ہیولا" بیج ہے۔ اہل فکر جب درخت کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ان پر واضح ہوتا ہے کہ درخت کے پتے اور پھل وغیرہ کی اصل یا ہیولا وہی بیج ہی ہے جس میں ارتقا یہ درخت کرتا ہے۔

برگ و بر نیز گاہ پیدائی   می کند تخم را ہیولائی

یہ قانون فطرت ہے — کہ پیدائش میں کوئی شے چونکہ باطل نہیں اور ذات باری تعالےٰ حق ہے اور حق سے حق ہی پیدا ہوتا ہے "باطل از باطل بروید حق زحق" اس لئے کوئی شے جو ایک دفعہ خلق ہوئی معدوم نہیں ہوتی۔ یعنی کسی شے کا "بیج ناس" نہیں۔ اس لئے بھی ہر ایک شے اپنے وجود میں کامل ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ

ہیچ موجودے بعرض شوق ناقص جلوہ نیست
ذرہ ہم در رقص مو ہو میکہ دارد کاملست

ہر ایک شے جو موجود ہے اپنے ظہور یا جلوہ میں ناقص نہیں ہے، ذرّہ بھی اپنی فطرت کا اظہار رقص میں کرتا ہے اگرچہ یہ موہوم ہی ہے مگر کامل ہے۔

اس لیے کوئی شے خواہ ارتقا کے بے شمار مراحل طے کرچکی ہے ہر ایک

ارتقائی مرحلہ کی شہادت بھی موجود ہے، یہی بیج "نشو ونما پاکر درخت بنا، لیکن بیج ناس نہیں ہوا وہی پھر پھل میں ظاہر ہوا۔

آب گاہ لطافت است ہوا　　چوں ہوا از فسردن آب نما

پانی کی اصل ہوا ہے، دونوں کی مختلف صورتیں حرارت کی کمی بیشی سے ظہور میں آئیں، پانی کو حرارت دی جائے تو لطیف ہو کر بخارات اور پھر ہوا کی صورت میں مبدل ہو جاتا ہے جب ہوا میں حرارت ایک خاص درجہ تک کم ہو تو وہ پانی بن جاتا ہے۔

جلوہ بر جلوہ آنچہ پیدا شد　　آں یکے صورت آں ہیولا شد

ایک صورت سے دوسری صورت جلوہ نما ہوتی ہے، پہلی "ہیولا" اور دوسری اسی کی صورت ہے۔

اسم آخر باشتہار آمد　　کہ ہیولا بروئے کار آمد

"ہیولا" اسم "اوّل" ہے اور جب اس کا ظہور ہوا تو یہ اسم "آخر" کا مظہر ہے۔

بیدل پیدائش میں ہر ایک شے کو اسماء و صفات سے تعبیر کرتا ہے، کہ سب مظاہر قدرت انہی اسماء و صفات کے ہیں۔

صور جسم ہائے امکانی　　دارد ایں آئینہ بعریانی

ممکنات یعنی جو کچھ بھی موجود ہے یا موجود ہو سکتا ہے ان کی مادی صورتیں انہی اسماء صفات کی آئینہ دار ہیں اور یہی بے حجابانہ منکشف ہو رہی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ

نقش پیدا و آئینہ محجوب　　بخفا گشت ازیں سبب منسوب

آئینہ میں صورت منعکس ہو تو صورت تو مشاہدہ ہو رہی ہے مگر آئینہ کو اس صورت نے چھپا لیا، آئینہ غیب ہے اور صورت ظاہر۔ اس لئے "خفی" بالغیب سے یہ حقیقت موسوم ہوئی اور یہی "ہیولا" ہے۔

این ہیولا نہ عرض دنے طول است
چوں طبیعت وجود معقول است

یہ ہیولا مادہ نہیں جس کا عرض و طول ہوتا ہے، عرض و طول اس میں نہیں جس طرح طبیعت معقول فی الذہن شے ہے اسی طرح اس کی موجودگی یا ہستی ایک ذہنی امر ہے اور حقیقت ہے اور اصل شے ہے، طویل بحث کے بعد بیدل ان طبقات کو جو کرۂ ارض پر مشاہدہ ہو رہے ہیں بطور شہادت پیش کرتا ہے، ہم نے چند اشعار کا انتخاب کیا ہے، مقصد تو اتنا ہے کہ قارئین بیدل سے روشناس ہوں۔

کرۂ ارض پر سلسلہ موجودات کی آخری کڑی "انسان" ہے۔ بیدل انسانی صورت کا ہیولا تلاش کے بعد پیش کرتا ہے، کہ ادنیٰ طبقہ جمادات کا ہے اور پھر نباتات اور اس کے بعد حیوانات کا اعلیٰ اور بلند تر طبقہ ہے آخری طبقہ میں "انسان" ایک ممتاز ہستی مشاہدہ ہوتی ہے۔ اس کا ہیولا طبقہ جمادات میں ہے اور اسی طبقہ میں وہ خاص خاص صورتوں میں ظاہر ہوا جس کی شہادت موجود ہے۔ بیدل کی تحقیق سمجھنے کے لئے یا موضوع زیر بحث کے فہم کے لئے "ہیولا" کے بعد "علم" کا فہم مقدم ہے جو انسان کی امتیازی خوبی ہے۔

"علم" کے بارہ میں بیدل کہتا ہے:

چیست علم؟ اصل قدرت بیچوں — نظم جمعیت ظہور و بطون

علم کیا ہے؟ حقیقت قدرت الٰہیہ ہے جہاں چہ و چند و چوں کام نہیں آتے۔ کائنات خارجی اور ذہنی تصوّرات میں عین مطابقت کا نام ہے۔

حسن مرأت عالم و معلوم — نور تمییز حاکم و محکوم

علم آئینہ ہے جس میں ہر ایک حسن و خوبی خواہ عالم میں ہے یا معلوم میں رونما ہوتی ہے۔ اور مختلف طبقات ہستی کے نشیب و فراز اور اعلیٰ و ادنیٰ میں امتیاز اسی نور علم کی روشنی میں جلوہ نما ہوتا ہے۔

تا نگیری ز علم خامہ بدست — صورت ہیچ چیز نتواں بست

یہ علم ہے جو مصوّر ہے اور ہر ایک شے کی صورت ہو بہو کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔

غیر علم آنچہ کردہ اند رقم — نیست جز جہل و جہل جملہ عدم

علم کی ضد جہالت ہے اور جہالت کا مفہوم عدم ہی ہے کہ کسی شے سے انسان روشناس نہیں ہو سکتا اس لئے غیر علم جو کچھ بھی ہے محض جہل ہے اور جہل عدم کے ہم معنی ہے۔

نزد اہلِ حقیقت ایجاد — ہیچ چیزے بغیر علم نزاد

جو اہلِ نظر محقق ہیں ان کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ کوئی شے علم کے بغیر ایجاد نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ کائنات جو عالم ایجاد ہے اس کی اصل وہی "قدرت بیچوں" یعنی علم ہے۔ بعض حکماء کا یہ نظریہ ہے کہ علم مادہ کی پیداوار ہے۔ بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ مادی کائنات علم نے ایجاد کی ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ کوئی ایجاد بغیر علم ممکن ہی نہیں۔

ہر چہ بینی ز مفرد و ترکیب — دارد از علم جوہر ترتیب

خواہ کوئی شے مفرد ہو یا مرکب اس کی ترتیب علم ہی سے ہے۔ بیدل نے مادی کائنات کے نظام اور اشیاء کی ترکیب و ترتیب کی شہادت پیش کی ہے کہ علم کے بغیر ممکن نہیں۔ اور "جوہر ترتیب" یعنی اس کی اصل علم ہے، اس حد تک بحث نظری تھی جس کی تصدیق تجربہ اور مشاہدہ سے ہو سکتی ہے۔

یہ مجمل بحث ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ابیات میں کرتا ہے۔

غافل از عالم جماد مباش — کہ نہا نہادریں محل شدہ فاش

کرہ ارض پر تین مادی طبقات ہیں، ایک جمادات دوسرا نباتات تیسرا حیوانات، تینوں کی حقیقت ایک ہی ہے، مادہ صرف صورتیں ہیں جو ہم اپنے حواس خمسہ سے محسوس کرتے ہیں، حقیقت ایک پوشیدہ شے ہے، حقیقت مجردہ کا احساس ناممکن ہے جو الغیب ہے احساس اسی حالت میں

ممکن ہے جب وہ کسی صورت میں رونما ہو، جس کو اصطلاح میں "مجاز" کہتے ہیں، یہ حقیقت زیر بحث ہم پر منکشف نہ ہوتی اگر وہ کسی صورت میں رونما نہ ہوتی، یہ صورت مادی ہے۔ بیدل ایک اور مقام پر کہتا ہے کہ

باخفا حقیقت، بافشا مجاز   بہ تشبیہ عالم، بہ تنزیہ راز

حقیقت پوشیدہ ہو یعنی کسی صورت میں رونما نہ ہو تو "الغیب" یا باطن سے تعبیر ہوتی ہے، اور جب کسی صورت میں ظاہر ہو مجاز سے موسوم ہے۔ جب ظاہر صورتوں میں رونما ہو جو ہم محسوس کرتے ہیں تو "عالم" اس کا نام ہے اسے "تشبیہ" کہتے ہیں یا عالم "امثال" اور اگر تنزیہ یا غیب ہو تو "راز" کہلاتا ہے۔

عقول و نقوش از دلش تا زباں
موالید و عنصر زباں تا بیاں

معقولات اور محسوسات یا تصورات جو دل پر ثبت ہیں اور خیالات کی صورت میں دل سے زبان پر آتے ہیں۔ موالید یعنی جمادات و نباتات و حیوانات اور وہ عناصر جن سے ان کی ترکیب ہوتی ہے اصل میں ایک ہی مختلف قسم کی صورتیں ہیں۔ بلکہ نہ صرف زبان بلکہ ان کا بیان جو زبان ادا کرتی ہے جسے "کلام" کہتے ہیں۔ یہ بھی اسی کی ایک صورت ہے۔ بیدل کے حکیمانہ تفکر کی بلندی کا اندازہ اسی شعر سے ہو سکتا ہے۔ "بیان" کیا ہے؟ خیالات کی ترجمانی حرف و صوت کی "صورت" میں، خیالات کیا ہیں؟ نقوش یا تصورات جو کائنات خارجی کے مشاہدہ سے بذریعہ حواس دل پر ثبت ہوتے ہیں یا پیدا ہوتے ہیں، کائنات کیا ہے۔ صورتیں، یا نقوش ہیں جن میں "حقیقت" رونما ہوتی ہے، دوسرے لفظوں میں اس طرح کہو کہ یہ "حقیقت" متکلم ہے اور ہم مخاطب، تصویری زبان میں ہم پر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر رہی ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح ہم گفتگو میں اپنا

مافی الضمیر اپنے مخاطب پر اپنی مادری زبان میں ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے ہمارے "بیان" کے سلسلہ کی پہلی کڑی یہ حقیقت مجردہ ہے۔ جو کائنات کی صورتوں اور پھر ان صورتوں کے نقوش اور خیالات کی شکل میں ہمارے دل میں پیدا ہو کر زبان پر آتے ہیں۔ اس لئے حقیقت ایک ہی ہے اگرچہ صورتیں یا اشارات مختلف ہیں۔ حروف اشارات ہی ہیں۔

تامل بمعدن، نفس در نبات　　بحیوان صدا و در انسان لغات

جب ہم کسی سوچ میں ہوں تو خاموش ہوتے ہیں مگر دل ہی دل میں باتیں کرتے ہیں، اسی طرح یہ کلام حقیقت معدنیات یا طبقہ جمادات میں خاموش ہے، اور یہی نباتات میں "سانس" کی صورت اختیار کرتا ہے، جب ہم گفتگو کرتے ہیں تو سانس کی آمد و رفت اور حرکت زبان سے آواز پیدا ہوتی ہے اور یہ صوت حروف کی صورت اختیار کرتی ہے، نباتات میں زبان نہیں مگر سانس ہے، سانس زندگی کے آثار میں سے بھی ہے۔ طبقہ حیوانات میں سانس اور زبان دونوں ہیں اس لئے ان میں آوازیں ہیں، مگر حروف نہیں، انسان میں یہ تینوں باتیں ہیں اور اس کی زبانوں اور بولیوں نے "لغات" مرتب کی۔ ایک رباعی میں کہتا ہے کہ

آں نغمہ بے نشانئے پردہ راز　　کانسان زانوئے اوست مخرج پرداز
در آئینہ جماد موج رنگست　　در طبع نبات، بحیوان آواز

حقیقت تو غیب الغیب ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں تشریح کی ہے کہ خارجی صورت آخر انسان ہے (خلق الانسان علمہ البیان) یہی اس کا بیان بھی ہے اور بیان کر رہا ہے، یہی جمادات کے آئینہ میں رنگوں کی صورت میں موج مار رہی ہے، یہی نباتات میں "بو" یعنی سانس لے رہی ہے، اور یہی حیوانات میں آواز دے رہی ہے۔

الغرض "غافل از عالم جماد مباش"، ہم سمجھتے ہیں کہ جمادات پتھر اور

مٹی کی چیزیں بے شعور مُردہ ہیں، بیدل کہتا ہے کہ یہ غفلت ہم آیات الٰہیہ سے برتتے ہیں۔ ان کا مطالعہ عقلاً نہیں کرتے، یہ اشیاء بھی ہم سے ہم کلام ہو رہی ہیں۔ لیکن بوجہ غفلت ہم ان کی نہیں سنتے، مولانا روم فرماتے ہیں۔

نطق آب و نطق باد و نطق گل　　　　ہست محسوس حواس اہل دل

اہل دل جو اہل علم و حکمت ہیں وہ طبقہ جمادات کی باتیں سنتے ہیں، ہمیں اشیاء کے خواص کا علم ہی کیسے ہو سکتا تھا اگر یہ اشیاء اپنے حقائق اپنی فطری زبان کے ذریعہ ہم پر واضح نہ کرتیں، ہماری تمام مادی ترقیات انہی مادی اشیاء کے خواص و حقائق کے علم سے وابستہ ہیں۔ بیدل کہتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک "حقیقت مجردہ" ہے، یہ کلمہ الٰہیہ ہے، ناممکن ہے کہ اللہ کسی سے ہم کلام ہو۔ یعنی حقیقت مجردہ کا احساس ناممکن ہے، جب یہ کسی صورت میں رونما ہوتی ہے تو اس کی "ہستی" کا شعور ہمیں ہوتا ہے، لسان قرآن میں یہ صورت ایک تو "وحی" ہے جس میں غلطی کا احتمال بہ تعلق فہم بھی نہیں ہے۔ دوسری "من وراء حجاب" یعنی اشیاء کی صورتوں کے پردہ میں اور یہ بذریعہ تذکرو تفکر اہلِ علم پر عقلاً ہوتا ہے۔

زیں تعین کہ وقف احجار ہست　　　　جوش اسرار علم بسیار ہست

اگرچہ طبقہ جمادات میں اشیاء کی صورتیں متعین ہیں اور ایک ہی حالت میں مشاہدہ ہوتی ہیں اور ان میں زندگی کے آثار بظاہر نمایاں نہیں مگر "حضرت علم" کے اسرار ان میں بھی جوش مارتے ہیں۔

سیر اشکال گر ہوائے کسے است　　　　خفت و ثقل طول و عرض بسے است

اگر کسی کو خواہش ہو کہ ان جمادی اشیاء کی شکلوں کا جائزہ لے تو کم و بیش ان میں وزن اور طول و عرض تو مشاہدہ ہو رہا ہے۔

آنچہ زیں ہا بہ پردہ مکشوف است
اکثرے بر خواص موقوف است

ان شکلوں کے پردہ میں جو کچھ ہم پر منکشف ہو رہا ہے زیادہ تر ان اشیاء کے خواص ہی ہیں۔

باوجود جوارح مفقود موجہامی زند خواص وجود

جمادات میں حیوانات کی طرح دست و پا و اعضا نہیں لیکن "وجود" کے خواص ان سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتے ہیں۔

جہل عام است در طبیعت سنگ کہ نصیبے ندارد از فرہنگ

پتھروں پر عام جہالت طاری ہوتی ہے۔ جاہل انسان بھی پتھر ہوتا ہے بلکہ ان سے بھی گیا گزرا، اس لئے کہ کسی امر کو شرح و بسط کے ساتھ بیان نہیں کر سکتے جیسا کہ انسان کرتا ہے (علمہ البیان) "بیان" کسی شے کے خواص یا حالات کو تفصیل کے ساتھ واضح کرنا ہوتا ہے۔ اور اسی سے علم کا نشو و نما ہوتا ہے، جہاں بیان یا قوتِ گویائی نہیں کہ اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کر سکے وہاں جہل مسلط ہے۔

صفحہ این جا فسردگی رقم است نقش قدرت ہنوز در عدم است

اس صفحہ ہستی جمادات پر افسردگی چھائی ہوئی ہے، وہ نقوش جو نباتات و حیوانات میں صاف صاف ممیز مشاہدہ ہوتے ہیں ان کا وجود جمادات میں بمنزلہ عدم ہے۔

اس موضوع پر بیدل نے طویل بحث کی ہے، ہم صرف چند اشعار کا انتخاب کرتے ہیں۔

نام احجار خاص فلزات است کہ ز انوار علمش آیات است

پتھروں کی بے شمار قسمیں ہیں، ان میں سے ایک خاص قسم کا نام "فلزات" ہے، جو علم کے نور کی نشانیاں ہیں، یعنی ان میں نور علم کم و بیش پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد چاندی اور سونا اور فولاد اور الماس کے خواص پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

ذہب از معنی است نشاہ پذیر   خاصہ در اعتبار اسم بصیر

"نشہ"، بھی غیر محسوس شے ہے، معنی بھی، الفاظ محسوس ہوتے ہیں، مطلب شعر یہ ہے کہ سونا میں معنی کا نشہ ہے، یعنی بے معنی شے نہیں۔ "اسم بصیر" کے خواص اس میں ظاہر ہوتے ہیں۔

گر ز خاصیتش خبر گیری   بہرہ قوت بصر گیری

اگر تو اس کی خاصیت سے واقف ہو تو قوتِ بصر کی حقیقت منکشف ہو گی، یہ حقیقت تو ہر ایک ڈاکٹر اور حکیم کو معلوم ہے کہ سونا امراضِ چشم بالخصوص ضعف بصر کے لئے بہت مفید ہے۔

سیم دارد بپردہ قوتِ دل   رفع حاجات و حل ہر مشکل

چاندی کی پوشیدہ خاصیت یہ ہے کہ دل کو تقویت دیتی ہے اور سونا چاندی ویسے بھی ہر ایک مشکل کا حل اور ہر ایک حاجت رفع کرتا ہے۔

اے زر تو خدا نہ ٔ و لیکن بخدا
ستار عیوب و قاضی الحاجاتی

از زر و سیم نزد اہلِ نظر   نیست پنہاں خواص شمس و قمر

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ سونے میں سورج اور چاندی میں چاند کے خواص موجود ہیں، یہ تو ثابت شدہ حقیقت ہے کہ زمین اور چاند ابتداء میں ایک سورج کا جزو تھے اور یہ کہ سیم و زر وغیرہ دھاتیں سورج ہی سے ان کے حصہ میں آئی ہیں اور یہ کہ شمس و قمر کے خواص زمین میں بھی ہیں۔ غالباً بیدل کا اشارہ اس "طلسم" سے ہے جو بعض حضرات چاندی اور سونے سے باندھتے ہیں۔ اور لگن اور گھڑی اور مہورت وغیرہ یا سعد یا نحس ساعت میں گنڈے تعویذ بناتے ہیں۔

ہم چناں روشن از طہورِ حدید   اعتبارات نفع و باس شدید

اس شعر میں قرآن کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے

حدید کو نازل فرمایا جس میں نفع اور باس شدید ہے، لوہا بہت مفید دھات ہے اور جنگ میں بہت کار آمد ہے۔

زیں نسق در جواہر احجار علم دارد ظہور بے تکرار
می فزائد ز اقتضائے اثر حجر سرمہ نیز نور بصر

اسی طرح جواہرات میں "علم" کا ظہور ہو رہا ہے، ایک سنگ سرمہ ہے، لوگ آنکھوں میں لگاتے ہیں، سرمہ کا فطری اثر ہے کہ نور بصر زیادہ کرتا ہے یہ سمجھنا چاہیئے کہ "اسم بصیر" کا ظہور سنگ سرمہ کے اثر میں ہوا ہے۔

توتیا است ہم بریں تاثیر بمدد کاری نظر توفیر

اسی اثر و تاثیر کی وجہ سے اسے "توتیا" کہتے ہیں کہ نظر کی تیزی میں مدد دیتا ہے۔

ہر یک ایں جا بہ رنگئے از آثار میدہد عرض جوہر اسرار

اسی طرح ہر ایک پتھر اپنے اپنے خواص کا اظہار مختلف پیرایہ اور صورتوں میں کر رہا ہے جو ان میں پوشیدہ ہیں۔

گشتہ در عالم ظہور عیاں بلباس خواص قدرت شاں

عالم ہستی میں ان کی قوتیں ان کے خواص کے لباس میں ظاہر ہو رہی ہیں۔

اثر قدرت اند خاصیات بے خبر نگذری ازیں درجات

یہ اسی "قدرت بیچوں" کا اثر ہے جو خواص اشیاء سے تعبیر ہوتا ہے، ان میں بھی درجات ہیں، ان سے بے خبر نہ رہنا چاہیئے۔ ارشاد قرآن ہے کہ کتنی آیات ارض و سموات میں ہیں لوگ یونہی ان پر سے گذر جاتے ہیں اور (وہ تو اپنی طرف متوجہ کر رہی ہیں)، یہ منہ پھیر لیتے ہیں یہی غافل لوگ ہیں۔

اوّلیں نشاء ظہور ایں جا ست ابجد درس گاہ نور ایں جا ست

طبقہ جمادات میں اسماء و صفات کا ظہور اوّل اسی میں ہوا ہے۔ یہ سمجھنا چاہیئے کہ مکتب علم و حکمت کی ابجد خوانی کی ابتدا ہیں سے ہوئی ہے۔

جمادات میں وہ جذبات بھی ہیں جنھیں ہم محبت و نفرت سے موسوم کرتے ہیں، بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

یعنی ایں جا نقاب شوق درید
میل آہن ربا بجذب حدید

آہن ربا یعنی مقناطیس اور لوہے کو دیکھو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبہ شوق میں لوہا خود بخود بے حجابانہ بے تکلف کھچا جا رہا ہے۔

قدرت افشائے معنی دارد
کایں کشش در ظہور می آرد

یہ اسی قدرت بیچوں کا کرشمہ ہے وہی اس معنی کو واضح کر رہی ہے کہ یہ کشش کی صورت میں ظاہر ہو رہی ہے۔

نہ حدید است پیش خود مختار
کہ بجذب وفا بود خود دار

لوہا خود مختار نہیں ہے۔ اس کا اختیار آہن ربا کے سامنے سلب ہو جاتا ہے وہ بے اختیار کھچا چلا جاتا ہے، انسان میں بھی جذبِ محبت جب عشق کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے تو اس کی اپنی قوتِ ارادی سلب ہو جاتی ہے اور وہ حُسن کے حضور بے اختیار ہو کر رہ جاتا ہے جذبۂ وفا کے ساتھ خودداری لوہے میں باقی نہیں رہتی۔

نہ در آہن ربا تغافل ناز
کہ بر آہن رودش نگردد باز

حُسن کا تقاضہ "تغافل ناز" ہے۔ مگر آہن میں خود مختاری اور خودداری نہیں تو آہن ربا میں "تغافل ناز" بھی نہیں، یہ نہیں ہوتا کہ لوہا تو کھچا چلا جائے اور آہن ربا کھچا رہے، اور منہ پھیر لے۔

آن بجذب اختیار داد ز دست
ایں بہ تسلیم ناتوانی مست

جذبۂ اُلفت میں لوہے نے تو اپنا اختیار ہاتھ سے دیدیا اور آہن ربا بھی سرِ تسلیم خم کر رہا ہے اور بیچارہ اسی میں مست ہے۔

در جنون زار عشق علمے ہست
کہ بہ فہمش کسے ندارد دست

اس جنونِ محبت میں بھی حضرتِ علم ہی کار فرما ہے کہ جو فہم و ادراک

سے بالاتر ہے، کنہ حقیقت نامعلوم ہے، جو کچھ مشاہدہ ہو رہا ہے اس کے تاثرات ہی ہیں جو اس کی ہستی کا پتہ بتاتے ہیں۔

اس کے بعد بیدل جذبۂ نفرت پر بحث کرتا ہے کہ دیکھو پارہ آگ سے دور بھاگتا ہے، گویا ان میں بغض کارفرما ہے۔

پس بہ طبع جماد افسردہ نتواں بست تہمت مُردہ

نتیجہ واضح ہے کہ اگرچہ جمادات افسردہ نظر آتی ہے مگر اس پر مُردہ کا حکم نافذ نہیں کیا جا سکتا، یہ مُردہ نہیں، مُردنی کی تہمت سے بری ہے۔

ایں اثرہائے آگہی درجات نیست بے بتگاہ ساز حیات

یہ خواص اور ان کے تاثرات درجات علم ہی ہیں اور زندگی کے ساز و سامان کے بغیر نہیں ہو سکتے۔

علم ایں جا نمود رنگ حجاب اول از آہن آخر از سیماب

علم نے اس مقام پر پردہ اٹھا دیا اول آہن اور آہن ربا کے حالات میں اور آخر آتش اور سیماب کی صفات میں۔

عقل کز آگہی قلم برداشت بغض و حب نام ایں صفات نہاد

عقل نے جب شعور کے ساتھ ان حالات کو قلم بند کرنا چاہا تو ان صفات کا نام بغض و حب رکھ دیا۔

انس و وحشت ودیعت ازلیست جوہر ایں صفات لم یزلیست

حب و بغض، انس و وحشت، الفت و نفرت جذبات ازل سے ہر ایک شے کی فطرت میں ودیعت ہیں۔ ان صفات کی اصل یا حقیقت ایسی ہے کہ کبھی زائل یا تبدیل و تحویل نہیں ہوتی۔

اس طویل بحث کے بعد جسے ہم نے بالاختصار ادا کیا ہے بیدل مسئلہ ارتقاء کی طرف توجہ دلاتا ہے اور اس کی تائید میں طبقہ نباتات سے شہادت پیش کرتا ہے کہ جمادات کا ارتقاء نباتات میں مشاہدہ ہوتا ہے بعض پتھر

جن کو "سنگِ شجر" کہتے ہیں نباتات کی شکلیں ان میں نظر آتی ہیں۔ بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ اس عالم ایجاد کی اصل ہوا ہے، جو "جوہر لطیف" ہے، اسے اصطلاح تصوّف میں "نفس رحمانی" کہتے ہیں، جمادات نے ایک سانس لیا تو دوسرا سانس نباتات کی صورت میں ظاہر ہوا۔

حکمت ایجاد عالم من و ما یعنی آں جوہر لطیف ہوا
دم دیگر نفس بقدرت راند صبح ہنگامہ نبات دماند

اس کے بعد یہ بحث ہے کہ طبقہ جمادات میں جو خواص و حقائق ادنےٰ درجہ میں مشاہدہ ہوتے ہیں وہی نباتات میں بدرجہ اعلیٰ نظر آتے ہیں۔ خود جمادات میں افسردگی کے درجات ہیں اس طبقہ میں جو اعلیٰ احجار ہیں ان میں افسردگی کم اور کمتر ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ارتقائی سلسلہ کی آخری کڑی نباتات کے ادنیٰ درجہ سے آکر مل جاتی ہے، نباتات میں بھی وہی خواص اور جذبات ہیں جو ادنیٰ درجہ کی حالت میں جمادات میں مشاہدہ ہوتے ہیں۔

ریشۂ ناتواں دریں عالم می شگافد دماغ سنگ از ہم

نباتات کا ریشہ کتنا کمزور ہوتا ہے اور پتھر کتنا سخت اور وزنی ہوتا ہے مگر نباتی ریشہ پتھر کو توڑ کر نکل آتا ہے۔ پہاڑوں پر روئیدگی اسی طرح مشاہدہ ہوتی ہے۔

دانہ تا شود نمو مائل سر بروں می کشد ز صد من گل

ایک دانہ کی کیا بساط ہے مگر جب نشو و نما کی طرف مائل ہوتا ہے تو سو من مٹی سے باہر سر نکالتا ہے۔

بظہور خواص نفع و ضرر قدرت آئینہ شاخ تا بہ ثمر

درخت کا پتہ پتہ، شاخ سے ثمر تک اس کا ہر ایک جزو اپنے نفع و ضرر سے واقف ہے اور حصولِ نفع اور دفع ضرر کے لئے جس قوت کی ضرورت

ہے وہ درخت اور اس کے پتوں اور شاخوں اور پھلوں میں صاف صاف کار فرما ہوتی مشاہدہ ہو رہی ہے۔

گر ہمہ نیم گام رہ پیماست ریشہ را بر خرام خود نظر است

اگر درخت کا ریشہ ایک آدھ قدم بڑھتا ہے تو اس کی نظر اپنی رفتار پر ہے۔ وہ غلط قدم نہیں اٹھاتا۔

ہمہ سو امتیاز شمع نمود ہمہ جا روشن احتیاط وجود

ہر ایک طرف اس کا نشوونما مناسبت کے ساتھ ہو رہا ہے، شمع کی روشنی ہر ایک طرف یکساں پڑتی ہے اسی طرح درخت بڑھتا ہے تو ہر ایک طرف ایک خاص مناسبت سے ایک جیسا پھیلتا ہے، ہر ایک جگہ یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ اپنے وجود کی حفاظت کر رہا ہے۔

خواہ در باغ خواہ در بیشہ سوئے آتش نمی رود ریشہ

خواہ باغ میں ہو یا جنگل میں ریشہ درخت آگ کی طرف نہیں جائیگا۔ آگ اور لکڑی میں بیر ہے، اس لئے وہ اپنے دشمنِ جان کو خوب جانتا ہے اور اس سے دور ہی رہتا ہے۔

لیک ہر جاست آب مائل اوست بیقرار تلاش حاصل اوست

لیکن وہ کسی جگہ ہو پانی اس کی طرف مائل ہوتا ہے، بغیر جد و جہد تلاش وہ اسے خود بخود حاصل کر لیتا ہے، پانی نباتات کی زندگی ہے اس لئے وہ خوب سمجھتا ہے کہ یہ میرا مایہ حیات ہے۔

احتراز و رجوع آتش و آب نیست بے دانش خطا و صواب

اس کا آگ سے بچنا اور پانی کی طرف رجوع کرنا ظاہر کرتا ہے کہ اسے خطا و صواب کا شعور ہے، وہ جانتا ہے کہ آگ کی طرف جانا خطا ہے اور پانی کی طرف رجوع کرنا صحیح ہے۔

قدرت و اختیار فطرت شاں ظاہر است از تمیز سود و زیاں

نباتات کی طاقت اور اختیار اسی سے ثابت شدہ حقیقت ہے کہ وہ اپنے نفع وضرر، نقصان اور فائدہ میں تمیز کرتی ہے اور نفع کی خواہش اور ضرر رساں اشیاء سے بچتی ہے۔

بار ور نخل ہا بعلم تر اند | کہ ز تنبیہ قابل اثر اند
ذی خرد را الفہم دور اندیش | ہر قدر علم بیش عبرت بیش
نخل ہا کایں سبق شناختہ اند | از نباتات بیش تافتہ اند

جس طرح عالم انسانی میں بھی علم وشعور کے درجات ہیں بعض جاہل اور بعض عالم اور جہات وعلم کے بھی مراتب ہیں اسی طرح نباتات میں بھی ہیں۔ تربیت سے یہی بعض درخت پھل عمدہ اور زیادہ دیتے ہیں۔ اور ان پر تنبیہ اور زجر وتوبیخ اور بدنی سزا کا بھی اثر ہوتا ہے۔ بیدل اس کی مثالیں پیش کرتا ہے کہ اگر کوئی درخت پھل نہ دے یا کم دے تو اس درخت کے پاس آکر کہو کہ اگر تو نے اب کے موسم میں خاطر خواہ پھل نہ دیا تو تجھے کاٹ دیا جائے گا اور مناسب ہے کہ کلہاڑی کی ایک دو ضربات بھی لگائی جائیں، دوسرا شخص بیچ بچاؤ کرتا ہوا کہے کہ اب درگذر کرو، اس طرح درخت پھل کثرت سے دیگا۔ اگر کسی درخت کے پاس آکر کہو کہ مجھے تیرا پتہ یا چھلکا فلاں مرض کے لئے فلاں روز یا ساعت درکار ہے تو اس میں مرض کے ازالہ کی خاصیت پیدا ہو جائے گی۔

زیں مراتب چمن طراز جہات | رنگ ہا چیدہ از مزاج نبات

جہات کے چمن آرائی کرنے والے نے نباتات کے مزاج سے طرح طرح کے رنگوں سے ہر طرف ایک آرائش وزیبائش کا سامان فراہم کر رکھا ہے۔

نار شد دود ے کہ در دل کہسار | لعل و یاقوت کردہ بود بخار
برق زد از مزاج لالہ و گل | جلوہ گر شد ز سبزہ و سنبل

وہی آگ اور دھواں جو پہاڑوں کے دل سے اُٹھتا ہے اور جس نے لعل و یاقوت کی صورت اختیار کی وہ لالہ و گل کے مزاج میں ایک برقی زو ہے جو سبزہ و سنبل کی شکل میں نمودار ہوئی۔ لعل و یاقوت طبقہ جمادات کی چیزیں ہیں ان میں جو بات ہے وہی لالہ و گل میں ہے یہی آگ دونوں طبقوں میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہو رہی ہے، کوئلہ اور ہیرا ایک ہی شے ہے جسے "کاربن" کہتے ہیں۔ کوئلہ کو زیادہ حرارت آفتاب پہنچی جل گیا اور یاقوت کو مناسب حرارت ملی۔ دھواں پیچ و خم کھاتا ہوا پھیلتا ہے اسی طرح سبزہ و سنبل پھیلتے ہیں۔

نرگستاں بخامہ تقدیر   داد پرواز دستگاہ بصیر

نباتات کو جمادات سے ہی مناسبت نہیں بلکہ حیوانات سے بھی ہے۔ نرگس کی شکل آنکھ کی ہے، خامہ تقدیر نے یہ صورت انسان اور نرگس میں ایک ہی جیسی کھینچی ہے۔ اسم "بصیر" کا ظہور نرگس میں ہوا۔ ایک رباعی ہے۔

گر بہ تحقیق ایں بہارت نظر یست   ہر سبزہ زبان شرح و بسط دگر یست
در پردہ گوش گل و چشم نرگس   آرائش کارگاہ سمع و بصر یست

لالہ ہم طرح بینشے انداخت
چشم وا کردہ مردمک پرداخت

لالہ نے بھی بینائی کی شکل و صورت کی بنیاد رکھ دی، آنکھ کھولی، وہ آنکھ کی پتلی بھی مشاہدہ ہو رہی ہے، لالہ کی صورت آنکھ کی طرح گول ہے اور جیسے آنکھ میں پتلی سیاہ ہوتی ہے ایسا ہی لالہ میں داغ ہے۔

تا مہیا کند سمیع آغوش   پنبۂ غنچہ برگرفت از گوش

اسم "سمیع" کا ظہور ہوا اور نباتات کو اپنے آغوش میں لے لئے غنچہ کے کان سے روئی نکال دی، تاکہ وہ ہمہ تن گوش ہو اور جو بات مانع شنوائی ہے دور ہو جائے۔

غنچہ کی صورت بھی گوش و آغوش کی ہے۔

ہر گلے را کہ فہم چشم انگاشت صورت گوش نیز در برداشت

شکل و صورت، صحت و امراض و جذبات و احساسات طبقہ نباتات میں بھی پائے جاتے ہیں۔

تا ز رمز حیا شوی محرم مگذر از فہم پنجۂ مریم

"پنجہ مریم" ایک بوٹی ہے جس کو "لاجونتی" اور بعض شرم بوٹی کہتے ہیں، اگر اس کو ہاتھ سے چھوئیں تو فوراً مرجھا جاتی ہے، اس کے بعد ہاتھ اٹھالیں تو اپنی اصلی حالت پر آجاتی ہے۔ گویا اس بوٹی کو حیا دامن گیر ہے کہ نامحرم غیر سے اپنے آپ کو چھپاتی ہے۔

کاں عجیر نہال شرم نشاں ہمہ چشم است و سر بسر مژگاں

اس بوٹی کی پتیوں پر ہلکے ہلکے نرم کانٹے سے ہوتے ہیں جو مژگاں کی صورت ہیں، یہ عجیب بوٹی شرم کا مجسمہ ہے۔

گر نظر سوئیش افگنی از دور خویش را زود و کند مستور

اگر اس پر نظر دور سے پڑے تو اپنے آپ کو چھپاتی ہے

برگ برگش ز سایہ اغیار چوں مژہ بر نگہ تند ناچار

اس کی پتی پتی نامحرم کے سایہ سے حیا کرتی ہے اور مژگاں کی طرح نگاہ پر چادر ڈالتی ہے۔

بے گماں معنی بصیر ایں جاست کہ سراپاش پردہ دار حیاست

بلاشبہ اسم بصیر کی یہ مظہر ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک پردہ دار حیا ہے۔

حاصل الامر جہان نبات علم دارد ہزار رنگ آیات

علم ہی ہے جو نباتات میں مناسب صورت میں کارفرما ہے۔

حکم اسما دریں تجلی زار داد پیش از جماد عرض بخار

حقیقت میں یہ اسماء الٰہیہ کا ظہور ہے جو اس کائنات میں جلوہ فرما ہیں۔

جمادات سے پہلے "بخارات" تھے یا ہوائیں (   ) تھیں "علم کیمیا" کے عالم جانتے ہیں کہ یہی ہوائیں یا "غاز" ہی جمادات کی صورت میں ظاہر ہوئیں۔

ضبط انفاس بال چند کشاد   شوخی رنگ و بو بروں افتاد

یہ "غاز" جب "ضبط" ہوئیں تو رنگ و بو کی شوخی بھی نباتات میں ظاہر ہوئی، ان ہواؤں کو انگریزی میں ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن، کاربن کہتے ہیں۔ یہ زندگی کی مد ہیں، نباتات کی زندگی انہی سے ہے۔

ایں زماں سحر می طراز د عشق   علم ناز می فرازد عشق

جب اس حقیقت نے جو جمادات سے نباتات میں ارتقائی حالت میں ظاہر ہوئی تو "عشق" نے جادو پھونکا، اور اپنا جھنڈا بلند کیا۔

گرمی سعی آن بخار الکنوں   نواں بر شعلہ، معود فسوں

بخارات تو بلند ہوتے ہیں ان میں جو حرارت ان کی حرکت طبعی نے پیدا کی تھی اتنی بڑھی کہ شعلہ کی صورت میں نمودار ہوئی، چمک دمک کے بعد سرد پڑ گیا اور پستی کی طرف مائل ہوا۔

خامۂ فطرت یقین تقریر   کرد روح نباتش تحریر

خامہ فطرت نے جو نقش بھی کھینچ رکھا ہے وہ یقینی تقریر ہے۔ اس کا نام "روح نبات" لکھ دیا۔

ہر طرف شکل ہا معائینہ شد   دست و پا و جوارح آئینہ شد

طبقہ نباتات میں ہر طرف شکلیں نظر آنے لگیں۔ ہاتھ اور پاؤں اور دیگر اعضاء بھی صاف صاف دکھائی دینے لگے طبقہ نباتات میں دست و پا و جوارح نہیں ہیں۔ ان اعضاء کا کچھ نظری کام بھی ہے، نباتات میں یہی کام یہ کرتے ہیں۔

نخل قامت با قتدار کشید   شاخ ہا دست بر ہوا بازید

درخت سیدھے کھڑے ہوگئے اور ایک وقار کے ساتھ سر اونچا کیا، شاخوں نے ہوا میں اپنا ہاتھ بڑھایا۔

صورت دست و پا و چشم و زباں　　ہمہ زیں جلوہ سر کشید عیاں

ہاتھ، پاؤں، آنکھ، زبان کی صورتیں اس میں جلوہ نما ہوئیں۔

لیکن تصویر کامل ایں جا نیست　　جز ہیولیٰ از شخص پیدا نیست

لیکن یہ صورتیں اور شکلیں ایسی کامل نہیں ہیں جیسی کہ حیوانات میں مشاہدہ ہوتی ہیں، اس طبقہ نباتات میں ابھی تک "ہیولیٰ" نے وہ صورت پیدا نہ کی جو طبقہ حیوانات میں ہے۔

جوف پیدا نشد دریں اعضا　　تا نماید تصرفات ہوا

اس کے اعضا میں جوف پیدا نہ ہوا تاکہ ہوا کی جگہ نکل آئے اور اس کے تصرف سے وہ کیفیت پیدا ہو جو طبقہ حیوانات کے جسم اور ہڈیوں وغیرہ میں ہے۔

ہرچہ زیں صورت و شمائل است

باد در دست و پائے در گل است

ان صورتوں اور شکلوں میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ "باد در دست"، ہوا تو ہاتھ میں اور پاؤں کیچڑ میں، ہوا شاخوں اور پتوں سے لگ کر گزر جاتی ہے، "باد در دست" محاورہ ہے، چونکہ ہاتھ میں ہوا بند نہیں رہ سکتی اس لئے محاورہ میں مراد بے فائدہ کوشش ہے۔ اور "پا در گل" کے معنی پابندی، جو آزادی کے منافی ہے، جمادات میں حرکت نہیں مگر نباتات میں ہے اور وہ باد در دست اور پائے در گل کے ساتھ محدود ہے۔

دست خالی چہ مے بجام کند　　پائے در گل چساں خرام کند

ہاتھ خالی شراب کو پیالہ میں کیسے انڈیل سکتا ہے، یعنی اس نشہ سے محروم ہے جو ہاتھ کی حرکت میں ہے، پابند کس طرح چل پھر سکتا ہے۔

سعی دست تہی دریں گلزار مگر آتش زند بخود چو چنار

اس گلزار میں خالی ہاتھ پاؤں مارنا اپنے آپ میں چنار کی طرح آگ لگانا ہے۔ چنار اور آگ میں خاص مناسبت ہے، اس درخت کے مزاج میں اتنی حرارت ہے کہ اگرچہ سرد ممالک میں پیدا ہوتا ہے مگر اس پر برف گرتی ہے تو پانی ہو کر بہہ جاتی ہے۔

از موالید ہرچہ گشت رقم بود مشق عبارت آدم

ان طبقات جمادات و نباتات کا بیان جو ہم نے کیا ہے تو غرض یہ تھی کہ آدم کی ابتدائی تاریخ لکھی جائے۔

حکمت ایں است آں نقوش خیال
شخص ایں جاست ما بقیٔ تمثال

جس طرح آئینہ میں کسی شخصیّت کا عکس صورت ہوتا ہے اسی طرح شخصیّت تو آدم ہے باقی جو کچھ ہے وہ اس آئینہ کائنات میں "تمثال" ہے۔ یعنی اس آئینہ میں جھلک انسان کی شخصیّت یا وجود ہی کی نظر آتی ہے ان طبقات میں حقیقت تو صرف وہی ہے جو حقیقت انسانی ہے باقی جو کچھ اس کے علاوہ ہے وہ سب صورتیں ہیں جن میں یہ حقیقت رونما ہو رہی ہے، اور یہی حقیقت وجود انسانی میں بدرجہ اتم جلو نما ہوئی۔

بر زباں نام آدمم آمد در نظر ہر دو عالمم آمد

میری زبان پر آدم کا نام آتے ہی دو جہان میری نظروں میں پھر گئے، جو کچھ ان دونوں جہانوں میں ہے اس کا خلاصہ آدم ہے۔ یا یوں کہو کہ آدم کے دم سے دو عالم ہیں۔ ان کی پیدائش کا منشا و حکمت آدم ہے، (لولاک لما خلقت الافلاک)

زیں کف خاک از دو عالم بیش اعتدال حقیقی آمد پیش

آدم خاکی میں دو عالم سے بڑھ کر حقیقی اعتدال پایا جاتا ہے۔

ہر کجا اعتدال جلوہ گر است
کف و موج و محیط یک گہر است

جہاں کہیں اعتدال جلوہ نما ہے وہاں کثرت وحدت میں محو ہو جاتی ہے۔ دریا ہو یا کف ہو یا موج سب اپنی اصل وحدت میں گم ہو جاتے ہیں۔ یہ "اعتدال" کی کمی بیشی ہے کہ کثرت کی نمائش ہو رہی ہے۔ حکماء کا نظریہ یہ ہے کہ تمام کائنات میں حرارت کی ایک خاص مقدار سر گرم عمل ہے۔ یہ مقدار کم وبیش نہیں ہوتی، لیکن اس کی تقسیم میں کمی بیشی کثرت پیدا کرتی ہے۔ پانی، برف، بخارات، ہوا مختلف اشیاء ہیں۔ مگر ان کی اصل حرارت ہے جو مختلف صورتوں میں رونما ہو رہی ہے، حرارت کمتر درجہ پر برف اور ذرا زیادہ درجہ پر پانی اور اس سے اور زیادہ ہو تو بخارات اور آخر ہوا کی صورت۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام کائنات میں "اعتدال" ہی مشاہدہ ہوتا ہے اگر میزانِ عدل (   ) اس عالم اضداد میں توازن قائم نہ رکھتی تو نظام کائنات درہم برہم ہو گیا ہوتا۔ آدم خلاصہ موجودات ہے، اس کے وجود میں یہی فطری اعتدال بدرجہ کمال نظر آتا ہے اور اسی عدل کی وجہ ہے کہ

جسم اصلی ہمیں کفِ خاک است   کہ محیط رموز افلاک است

جسم انسانی تو مٹھی بھر مٹی ہی ہے مگر تمام رموز حکمت اور کائنات کی پیدائش کے مقصد پر یہی آدم خاکی حاوی ہے۔

"عرفان" میں بیدل لکھتا ہے کہ جب میں نے تحقیق کی تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ

یقینم شد کہ در ہر قطرہ جان است
نہاں در ہر کف خاکے جہاں است

یعنی اصل ہر شے کی "حیات" ہے، مادہ تو محض صورتیں ہیں جن میں یہ حقیقت "حیات" رونما ہو رہی ہے۔ صورتیں متغیر اور تبدل اور فنا ہوتی رہتی ہیں اور حیات انہی بہتر سے بہتر صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے، اور بہترین صورت انسانی ہے، اس لئے زندگی اسی صورت میں اپنی ممکن ارتقائی حالت میں مشاہدہ ہوتی ہے، اور یہ کہ انسان اگرچہ بظاہر بلحاظ جسم وجسد حقیر معلوم ہوتا ہے مگر کل کائنات اس کے قلب میں سمائی ہوئی ہے۔

مرجع خلق، منبع اشکال	مرکز علم و مصدر اعمال

تمام کائنات کی پیدائش کا رجوع اسی آدم کی طرف ہے، یہ خود خلاق ہے، تمام شکلوں کا سرچشمہ یہی ہے، اشیاء کی صورتیں اور ان کے تصورات اسی میں محسوس اور متصور ہوتے ہیں۔ علم کا مرکز بھی یہی ہے اور علم کے مناسب اعمال کا صدور بھی اسی سے ہوتا ہے۔

پس ز ترکیب تا جہان بسیط	جسم و علم یک آدم است محیط

کائنات تو مادی جسم ہے اس میں علم کارفرما ہے، لیکن علم کا مشاہدہ انسان ہی میں ہوتا ہے، علم سے خالی کوئی شے نہیں جیسا کہ ہم مثنوی "طلسم حیرت"، کے تحت بیان کرینگے، لیکن انسان مرکز علم ہے، اور اس کا عمل وہ تصرف ہے جو وہ کائنات میں کرتا ہے، بیدل کا ایک شعر ہے۔

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقش آدمی
اے بہار نیستی از قدر خود ہشیار باش

مرکب اور مفرد غرض کوئی شے ہو جسم و علم کی تعریف میں ہی آتی ہے اور ان تمام پر انسان محیط ہے، اس شعر میں اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے کہ آدم کو خلعت خلافت عطا ہوا تو اس لئے کہ "جسم و علم" میں تمام کائنات کی اشیاء اور ہر ایک طبقہ ہستی سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ طالوت بنی اسرائیل میں سب سے چھوٹے قبیلہ "بنیمین"، کے سب سے چھوٹے

خاندان کا سب سے چھوٹا فرد تھا، مگر "جسم وعلم" میں ہر ایک قبیلہ کے ہر ایک خاندان کے افراد سے بڑھ کر تھا۔ اس لئے سموئیل نبی نے اسی کو بادشاہ بنایا اور وجہ بھی بتائی کہ جسم وعلم میں سب سے بڑھ کر ہے۔

مثنوی عرفان کے ابیات گیارہ ہزار ہیں۔ ہم نے صرف ایک موضوع پر چند اشعار کا اقتباس کیا ہے، بیدل کا خاص موضوع تو یہی ہے مگر ضمناً وہ بہت کچھ بیان کرتا ہے، بطور نمونہ ہم صرف ان اشعار کو درج کرتے ہیں جو اس محقق بے بدل نے اختلاف عقائد پر لکھے ہیں۔

اے دلت کارخانہ نیرنگ　　غنچہ ات گلفروش چندیں رنگ

تیرا دل کارخانہ نیرنگ ہے، اس کارخانہ میں تو نت نئی ایجاد کرتا رہتا ہے، تیرا غنچہ دل کتنی رنگینیوں کی گلفروشی کر رہا ہے، شاعرانہ تخیل اور زبان کی حسن وخوبی ایسی باتیں ہیں جس پر ہم نے ابھی تک کچھ نہیں لکھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جو بات اس کے الفاظ اور ان کی بندش اور تشبیہات وغیرہ میں ہے اس کی ترجمانی اگر کی جائے تو شعر کا خون کرنا ہے، بطور نمونہ ہم چند اشعار مناسب مقام پر پیش کریں گے مگر اس کتاب کا اصل مقصد یہ نہیں، ہم صرف بیدل کے حکیمانہ تفکر اور تحقیق کی داد دے رہے ہیں۔

ہیچ گل زیں بہار رنگ نہ بست　　کہ براہ شعور سنگ نہ بست

جو بھی خیال یا تصور دل میں پیدا ہوتا ہے اگرچہ بہار فطرت کا حسین رنگین پھول ہی ہوتا ہے لیکن اس کے حسن اور رنگینی کے مشاہدہ میں سنگ راہ اور امور بھی ہیں، کہ پائے شعور قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے، غرض ظہور تو یہ ہے کہ ہر ایک شے کو اپنے اصلی رنگ میں دیکھا جائے یعنی مشاہدہ حق ہو۔

اصل ہر حق و باطل است یکے　　جادہ بسیار و منزل است یکے

جسے ہم حق و باطل سے تعبیر کرتے ہیں ان کی اصل ایک ہی ہے منزل

مقصود تو ایک ہی ہے اگرچہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے بے شمار راستے ہیں، یعنی مذاہب بہت ہیں اور سب کی منزل حق تک پہنچنا ہے۔

این ہمہ جادہ است منزل نیست
لیک رہرو تمیز و قابل نیست

یہ تمام مذاہب راستے ہیں، منزل نہیں ہے۔ غلط فہمی سے لوگوں نے اپنے اپنے مذہب کو منزلِ مقصود سمجھ رکھا ہے، اور ان میں اتنا شعور نہیں کہ جادۂ و منزل میں فرق کر سکیں۔

اگر این عبرت تناسخ خام — درجہاں ظہور بودے نام
قوم دیگر ہم از وقوع خیال — می شد آئینہ دار این تمثال

راستہ گزرگاہ ہوتا ہے، لفظ "عبرت" نہایت موزوں اور مناسب واقع ہوا ہے، اگر "تناسخ" ہی صحیح "منزل" اس جہان ظہور میں ہوتی تو حقیقت تو بدل نہیں سکتی ہر ایک قوم کا یہی عقیدہ ہوتا کیونکہ "حق" ایک ہی ہے، ہر ایک قوم کے آئینہ عقائد سے یہی صورت تناسخ کی جھلک دکھائی دیتی۔

زین نہال آنچہ برافراشتہ اند — در زمین ہائے ہند کاشتہ اند

اس آواگونی دہرم کے درخت سے جو کچھ خوشہ چینی ممکن ہے اس کے لیے خاک سیاہ ہند ہی موزوں و مناسب ہے، آریہ ہندو تناسخ کے قائل ہیں، کہ ہر ایک روح "چوراسی" جونیں بھوگتی ہے۔

از گروہے دگر برین آثار — نیست آگاہ خفتہ تا بیدار

لیکن دوسری قوموں کا یہ عقیدہ نہیں، ان قوموں میں خواہ جاہل ہو یا عالم اس مذہب سے ناواقف ہیں۔

نہ نصاریٰ است زین مقام آگاہ — نہ خیال یہود دارد راہ

مسیحی اس مقام سے یا اس راستہ یا مذہب سے واقف ہی نہیں اور

یہود کا خیال بھی اس راہ کی طرف منتقل نہیں ہوا۔

درمزاج یہود اگر ساریست حکم توریتہ یک قلم جاریست

ان کے دل و دماغ پر توراۃ کے احکام چھائے ہوئے ہیں، ان کے خیالات اور جذبات اور احساسات کا سرچشمہ ان کی یہی مقدس کتاب ہے جس سے وہ سب کچھ اخذ کرتے ہیں۔

وز نصاریٰ نیز شود مشہود جز بیانے کہ عیسیٰ فرمود

نصاریٰ کے عقاید میں بھی وہی بات مشاہدہ ہوتی ہے جو ان کے حضرت عیسیٰ کے ارشادات ہیں۔

ہر یکے راز درس کامل خویش سبق علم بر زبیست بہ پیش

جو کچھ ان کے پیغمبر یا رشی منی یعنی کامل انسان نے ان کو درس دیا اسی سے سبق علم ازبر کیا۔

تا عقاید حجاب یا نہ دید برہمن کعبہ را بخواب ندید

"العلم حجاب الاکبر" علم سب سے بڑھ کر حجاب ہے، جب عقاید نے پردہ علم کو پھاڑ کر اس کی تار و پود الگ کردی تو حالت یہ ہوئی کہ اب کوئی برہمن کعبہ کو خواب میں بھی نہیں دیکھتا۔

تا مسلماں مدارج دیں خواند بے نیاز از خیال کاشی ماند

مسلمانوں نے جب اپنے دین کے مدارج ذہن نشین کئے تو "کاشی" کا خیال تک ان کے دل میں نہیں آتا، "کاشی" ہندوؤں کا مقدس تیرتھ ہے جیسا مسلمانوں کا کعبہ۔

قصص انبیائے فرقانی بیدیاں راست محض نادانی

قرآن میں انبیاء کے قصے مذکور ہیں جس سے ویدوں کے ماننے والے محض جاہل ہیں۔

حالت دیوتائی شاستری مسلمیں را گواہ بیخبری

اسی طرح شاستروں میں جو دیوی اور دیوتاؤں کے افسانے ہیں مسلمان اس سے بے خبر ہیں۔

زیں حقیقت بزمرۂ اسلام　　نرسانید پیک علم پیام

قاصد علم جو اللہ کا پیغام لے کر آیا یعنی آں حضرت نے مسلمانوں کو ان مذاہب مختلفہ کا پیام دیا۔

نسخ در اُمتِ محمد نیست　　بزم مقبول جائے مرتد نیست

عقیدہ تناسخ اُمت محمدیہ میں نہیں ہے مقبول بارگاہ الٰہی کی بزم میں کسی مُرتد کو اجازت نہیں کہ داخل ہو۔

بیدل کا نظریہ تحقیق یہ ہے کہ "علم" اور شے ہے اور "عقیدہ" اور چیز ہے۔

ہیچ گل زیں بہار رنگ نہ بست
کہ براہِ شعور سنگ نہ بست

علم کا سنگِ راہ عقیدہ ہے۔ عقیدہ لفظ "عقد" سے مشتق ہے، قوتِ فکریہ کو یہی شے جکڑ بند میں رکھتی ہے، اور اسی کا کرشمہ ہے کہ اچھے بھلے انسان کو جاہل بنا کر رکھ دیتا ہے۔ ہزار علمی شواہد اور دلائل عقلیہ پیش کرو مگر جس عقیدہ کی زنجیروں میں اہلِ مذاہب جکڑے ہوئے ہیں اجازت نہیں دیتا کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں، یہی حقیقت قرآن کی اس آیت میں واضح کی گئی ہے۔

یأمرھم بالمعروف وینھٰھم عن المنکر ویحل لھم
الطیبٰت ویحرم علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم
والاغلال التی کانت علیھم۔ (۹ : ۹)

لوگوں نے وہ اشیاء جو فطرتاً پاکیزہ ہیں عقائد کے تحت حرام بنا رکھی ہیں۔ اور امر و نہی یعنی قوانین بھی ایسے وضع کر رکھے ہیں جن میں یہی عقائد

کارفرما ہیں۔ یہ پیغمبر طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام قرار دیتا ہے اور جن رسوم کے طوق ان کی گردنوں کا ہار ہیں اور جس رواج کی زنجیروں کے بوجھ کے نیچے وہ دبے ہوئے ہیں، یہ رسول توڑ پھوڑ کر ان کو سبکدوش کرتا ہے۔

عموماً بحث مباحثہ میں لوگ اپنے اپنے عقائد کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں، گویا یہ حقیقت ثابتہ ہیں، غرض عقیدہ نہایت مکروہ شئے ہے۔

کاں وفا جوہر کرم بنیاد
ہمہ را وعدہ قیامت داد

وہ وفا جوہر اور کرم بنیاد یعنی آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو ان کے اعمال کی سزا و جزا اور مغفرت کا وعدہ بروز قیامت دیا۔

بر مسلماں ز فکر دور اندیش
اگر آید قیامت آید پیش

مسلمانوں کے ذہن میں بھی قیامت کا نقش اتنا گہرا ہے کہ جو کچھ ان کے سامنے ظہور میں آتا ہے ان کی فکر دور اندیش اس میں قیامت کا جلوہ ہی دیکھتی ہے۔

مومناں را ظہور ایں آیات نبود جز بموقف عرفات

ہر ایک مسلمان کا اس پر ایمان ہے کہ سزا و جزا عرصہ قیامت ہی میں ملے گی۔

گر مکافاتے از عمل بینند خویش را ہم دراں محل بینند

اگر اسی دنیا میں اپنے اعمال ناشائستہ کی سزا انھیں ملتی ہے تو یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت قائم ہے اور ہم اللہ کے حضور اعمال کے جوابدہ ہیں۔

علم ما را بحکم رحمت فرد مبتلائے خیال و وہم نہ کرد

رحمۃ اللعالمین کے ارشاد کے مطابق جو علم ہمیں حاصل ہوا ہے، اس نے ہمیں توہمات کی بھول بھلیوں سے بچا لیا۔

اہلِ اسلام از ہر کجا زادند
زیں خیالات فارغ افتادند

مسلمانوں کی قومیت خواہ کچھ ہو خواہ کسی ملک میں رہائش ہو انکی جنم بھومی خواہ کہیں ہو ان توہمات سے بے نیاز ہیں۔

بیدل نے اس موضوع پر طویل بحث کی ہے۔ اور تناسخ کی چند مثالیں بھی بیان کی ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ عقیدہ جب قوی ہو اور ہزارہا سال سے پختہ ہو چکا ہو تو وہ "وراثت" میں منتقل ہوتا رہتا ہے" اور اہلِ عقیدہ جیتی جاگتی دنیا میں وہی کچھ مشاہدہ کرتا ہے جو اس کے عقیدہ کے مناسب تائیدی شہادت ہوتی ہے۔ "وراثت" ایک مستقل موضوع ہے۔ اس پر بحث کی گنجائش اس مقام پر نہیں۔

طلسم حیرت

مثنوی عرفان اور طلسم حیرت اور طور معرفت میں بیدل کا شاعرانہ تخیل اور حکیمانہ تفکر جمع ہے۔ یہ بیدل کے شاہکار ہیں، طلسم حیرت میں اس مادی کائنات کا مذکور ہے اور اس عالم اجسام میں سے خلاصہ موجودات "انسان" کے وجود پر بحث کی گئی ہے، "سلطان حقیقت" ایک بادشاہ ہے اس کی تعریف یہ ہے۔

کہ در ملکِ تقدس بود شاہے　　　معلی مسندے عزت کلاہے

کہ "ملک تقدس" میں ایک بادشاہ تھا، اس کا تخت عالی اور تاج عزت کلاہ تھی۔

"وجوب آباد" بیرنگی حصارش　　　"تعین ہا" سپاہ بیشمارش

"وجوب آباد" اس کے ملک مقدس کا صدر مقام تھا اور "تعینات" اس کی بے شمار سپاہ تھی۔

ز تختش سطح نہ گردوں نشستے　　　دو عالم از کلاہ او شکستے

اس کے تخت کی سطح پر نو آسمان پست تھے اور عالم (دنیا و آخرت) اس کے تاج کی زیبائش کے آگے ماند تھے۔

یہ شہنشاہ اپنے دارالملک "تنزیہ" میں "اقلیم تشبیہ" پر فرمانروائی

کر رہا تھا۔

بدن را مقدمش تشریف جاں داد
زمیں را اعتبار آسماں داد

اس اقلیم میں تشریف فرما ہوا تو "بدن" کو اس کے قدوم میمنت لزوم نے جاں افزائی بخشی، زمین کو آسمان کی عزت نصیب ہوئی۔ "بدن" میں اس نے تین قلعے دیکھے جو پسند فرمائے، اوّل "دماغ"

حصارے دید چوں اندیشہ عالی ۔۔۔ چو ہمت منظر صاحب کمالی

یہ قلعہ خیال کی طرح بلند پرواز اور ہمت کی طرح کمال کا منظر تھا۔

بدہ منزل سواد او مزین ۔۔۔ بہریک منزل استادی معین

عمارت دس منزلہ تھی اور ہر ایک منزل پر ایک ایک پہرہ دار تھا۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں :۔

(۱) سامعہ (۲) باصرہ (۳) شامہ (۴) ذائقہ (۵) لامسہ (۶) حس مشترک (۷) خیال (۸) فکر (۹) وہم (۱۰) حافظہ۔

ان حواس ظاہری اور قوئی باطنی کی تعریف کرتے ہوئے بیدل نے اپنے شاعرانہ تخیل کو بلند تر مقام پر پہنچایا جہاں آج تک کسی شاعر کی رسائی نہیں ہوئی۔ بطور نمونہ ہم صرف (۹) "وہم" کا آگے چل کر ذکر کریں گے، اس قلعہ کو دیکھتا ہوا سلطانِ "حقیقت"

ازاں منزل عنانِ شوق گرداند ۔۔۔ حقیقت جانب حصن جگر راند

"دماغ" سے گزرتا ہوا جگر کی طرف عنانِ توجہ مبذول فرمائی، اس جگہ بھی آٹھ پہرہ دار دیکھے :۔

(۱) غاذیہ (۲) نامیہ (۳) مولدہ (۴) مصورہ (۵) جاذبہ (۶) مسکہ (۷) ہاضمہ (۸) دافعہ۔

جگر سے "دل" کے قلعہ کی طرف نہضت فرما ہوا، اس میں چھ پہرہ دار

اس کے آستانہ پر کھڑے دیکھے۔

(۱) اُمید (۲) خوف (۳) محبت (۴) عداوت (۵) فرح (۶) غم۔

یہ سب کچھ دیکھتا گیا سلطانِ حقیقت ان ممالک میں سے ایسا مقام انتخاب کرنا چاہتا تھا جہاں آرام فرمائے۔

چو سلطاں حقیقت زیں مسالک — نمود آہنگ تفتیش ممالک

مقامے زیں مقاماتِ مجازی — ندید آرام گاہ بے نیازی

ان میں سے سوائے ایک دل کے کوئی پسند نہ آیا۔

مگر معمورہ بیرنگی دل — کہ جاں آنجا تواند کرد منزل

یہ بستی جو دراصل بوجہ بیرنگی اُجڑی ہوئی تھی اور جس میں "جان" (نفس انسانی) مقیم تھی پسند فرمائی کہ چھ پہرہ داروں سے دل کا حال دریافت کیا۔ تو خوف و عداوت وغم نے مخالف رائے دی کہ دل ایسی جگہ نہیں کہ وہاں شہنشاہ آرام فرمائے۔ محبت نے کہا کہ

محبت گفتش اے شاہ دل آرا — بدل جا کن بدل جا کن بدل جا

بادشاہ نے یہ رائے پسند فرمائی۔ اور

بحکم مصلحت تہدید سر کرد

ازیں شہر آں سہ مفسد را بدر کرد

سیاست کا تقاضا تھا کہ بادشاہ نے اس شہر دل سے ان مفسدوں خوف و عداوت وغم کو بدر کر دیا۔

اس کے بعد "بدن" کے چار حکام (۱) خون (۲) صفرا (۳) سودا (۴) بلغم کو خلعت عنایت فرمایا۔

"کرامت شد بخوں تشریف گلگوں" خون کو سُرخ بباس پہنایا، "قبائے زعفری صفرا ببر کرد"، صفرا کو زعفرانی پوشاک عنایت ہوئی جس کے دامن میں نرگستان پیچیدہ تھا۔ "لباسِ عنبریں شد وقف سودا" عنبریں لباس سودا کے

حصہ میں آیا، دوسرا پا سر مہ چشم تماشا، بہ بلغم خلعت برگ سمن داد، بلغم کو سمن کا خلعت ملا۔ لیکن ان حکام میں آخر کار نہ بنی، ہر ایک غلبہ کا خواہاں تھا، ان میں مفسدوں خوف و عداوت وغم کی بن آئی۔ یہ قصہ طویل ہے اور ہر ایک انسان کی آپ بیتی ہے۔

بیدل کا نظریہ وجود یہ ہے کہ

عالم ہمہ یک جلوہ ذات احد است　　　این جا نہ ہیولیٰ نہ صورت جسد است
کثرت آثار چشم واکردن ماست　　　این صفر چو محو شد ہماں یک عدد است

آنکھ کی صورت بھی صفر کی ہے، اس لئے جب کھلی ہو تو ایک عدد پر صفر کا اضافہ کرتی جاتی ہے۔ اس طرح ایک سے دس اور دس سے سو اور سو سے ہزار تا لاانتہا، حقیقت وجود واحد ہے۔ لیکن یہ "چشم واکردن" کا کرشمہ ہے کہ ہم کثرت مشاہدہ کرتے ہیں اب آنکھ بند کر لو، آخر ایک دن خود بخود بند ہو جائے گی تو یہ صفر بھی محو ہو جائیں گے اور وہی ایک باقی رہ جائے گا۔ (تمام اشیاء یعنی کثرت فنا ہونے والی ہے باقی صرف تیرے پروردگار ذوالجلال والاکرام کی ذات ہے)

بیدل "عقل" پر بحث کرتے ہوئے "وہم" کی نسبت لکھتا ہے کہ عقل تو اشیاء کی صورتوں اور حقائق جیسے کہ ہیں مشاہدہ کرتی ہے، لیکن "وہم" محال اندیش ہے۔

دبستاں کمالات محالی　　　خطش بطلاں احکام خیالی
خیالے راکہ در خاطر در آورد　　　محالے کرد واز جنبش بر آورد

خیال یا نقش محسوسات خارجہ کا ہمارے قلب پر ثبت ہوتا ہے، اگر ہو بہو اور من وعن اشیاء خارجی اور ہمارے ذہنی تصوّر میں مطابقت ہے تو یہ "حق" ہے۔ جس کی تصدیق عقلاً اور بداہتاً ہوتی ہے۔ مگر قوت "واہمہ" کا یہ کام ہے کہ اسے باطل بنا کر چھوڑتی ہے جو صحیح خیال کے احکام و آثار ہیں ان پر خط باطل کھینچ دیتی ہے۔

ز مژگاں نشتر آزار فہمی　　　ز گیسو پیچ و تاب مار فہمی

طنین پشہ و نا خوردہ بر گوش — خروش طبل و رعدش بردہ از ہوش
غبارے گر بہ پیش چشم بالید — گمانش چوں صدا بر کوہ پیچید
فرو رفتی ز طبع وحشت اندیش — بکام اژدر از خمیازہ خویش

اکثر شعرا کے کلام میں یہی قوت "واہمہ" کارفرما ہوتی ہے۔ کسی محبوب کی مژگاں کو نشتر آزار سے تشبیہ دیتے ہیں اور گیسو کو سانپ سے کہ پیچ و خم کھا رہا ہے۔ حالانکہ مژگاں اور گیسو کو نشتر اور مار سے دور کی نسبت بھی نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ اندھیرے میں ہم رسی کو سانپ تصوّر کرتے ہوئے ڈر جاتے ہیں، ارشادِ قرآن ہے کہ شعرا کا اتباع گمراہی ہے جو ہر ایک وادی میں سرگردان رہتے ہیں۔ قرآن کی نسبت کفار کہتے ہیں کہ یہ شعر و شاعری ہے۔ جواب دیا گیا کہ ہم نے آں حضرتؐ کو شاعری نہیں سکھائی۔ کچھ عقل و فکر سے کام لو۔ یعنی جو حکیمانہ ارشادات ہیں شعرا کے کلام سے بالکل مختلف ہیں اگر کسی مچھر کی بھنبناہٹ سمع نوازی کرتی ہے تو کان پر کاٹنے سے پیشتر ہی حواس باختہ ہو جاتے ہیں گویا نقارہ رعد کے شور و غل سے کان کے پردے پھٹ گئے، اگر آنکھوں کے سامنے غبار اُٹھے تو گمان یہ ہوتا ہے کہ پہاڑیں آوازیں گونج رہی ہیں، اگر انگڑائی لی تو یہ وہم ہوا کہ اژدھا کے منہ میں آ رہے۔

ہمانا چشم او صفر رقم بود
کہ ہر نقشے از وہ بر یک افزود

وہم کوئی نیا خیال تو پیدا نہیں کر سکتا، صحیح خیال کی ترتیب یا اس فطری تعلق کو جو اشیاء میں ہے بدلتا ہے، اسی وہم کا کرشمہ ہے کہ انسان اپنے سایہ سے بھی ڈرتا ہے۔

حقیقت وجود واحدہ ہے اور حق ہے مگر واہمہ نقش وحدت کو کثرت دکھا رہا ہے۔

بیدل اب تفصیلی بحث کرتا ہے کہ "واہمہ" کو قوت حافظہ سے مدد کیسے

ملتی ہے، "حافظہ" پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

صفائی طینت او لوح محفوظ　　　کز نقش دو عالم بود ملحوظ

حافظہ "لوح محفوظ" ہے کہ اس پر دو عالم کے نقوش مشاہدہ ہو رہے ہیں؛ یہ شعر اعلیٰ حکیمانہ تفکر کا نتیجہ ہے، اور ہر ایک زمانہ کے حکماء مشرق و مغرب کا یہی موضوع رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات خارجی میں اشیاء ایک تو صورتوں کا مشاہدہ ہے جو "محسوسات" ہیں اور دوسرے حقائق کا جوان صورتوں میں رونما ہوتے ہیں، اور یہ "معقولات" ہیں۔ صورتیں خارج میں ہر آن بدلتی رہتی ہیں اس موضوع پر ہم "تجدد امثال" کے تحت بحث کریں گے، لیکن صورتیں ہوں یا حقائق قلب میں ہمیشہ کے لئے محفوظ رہتے ہیں، اور خود انسان بھی انہیں محو نہیں کر سکتا، یہ خیالات (　　　) یا نقوش ہم بالارادہ اور بلا ارادہ شعور یا بلا شعور اخذ کرتے ہیں۔ ہم صرف چاند کو نہیں دیکھتے بلکہ اس کے ساتھ اس ماحول کو بھی دیکھتے ہیں جس میں چاند واقع ہے۔ ہم ایک درخت کی شاخوں اور اس کے پتوں کو شمار نہیں کرتے مگر درخت اس کی شاخیں اور پتے بلکہ تمام باغ اور اس کی روشیں بلکہ زمین و آسمان سب کچھ ایک نظر میں دیکھ چکے ہیں اور یہ ہمارے قلب میں محفوظ ہو گیا۔ خواب میں ہم سب کچھ دیکھیں گے، اور بالارادہ و شعور بیداری میں دیکھتے ہیں۔ قوتِ حافظہ کا کام یہ ہے کہ ان نقوش کو جب ہم چاہیں بیداری میں ہمارے دیدہ تصوّر کے سامنے لاتی ہے اس کو اصطلاح میں "تذکر" کہتے ہیں۔ یعنی کسی نقش یا واقعہ کی یاد۔

ولیکن در دبستان مراتب　　　منقش لوحش از کلک دو کاتب

در و ہم نقش تصویر خیالی　　　ہم از وہمش اثر ہائے محالی

اس لوح محفوظ پر دو کاتب جن کو "کرام کاتبین" کہنا چاہئے حروف یا نقوش لکھتے ہیں یا یہ کہو کہ ہمارے نامۂ اعمال پر سیاہ و سپید، نیک و بد جو کچھ ہم کسب کرتے ہیں، لکھتے جاتے ہیں۔ ایک تو وہی صحیح خیال یا نقش ہے جسے

نیکی سے تعبیر کرنا چاہئے اور یہ عقل ہے، دوسرا "واہمہ" ہے جو صحیح تصویرِ خیال میں اثرِ محال کی رنگینی پیدا کرتا ہے۔

محال کا تصور انسان نہیں کر سکتا۔ اس لئے بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ جو بھی انسان کے ذہن میں خیال پیدا ہو "محال" نہیں۔ مناسب اسباب کے ساتھ "ممکن" ہے۔ واہمہ ضرور بظاہر محال اندیش ہے، مگر ممکنات کے تصورات ہی سے محال اندیشی کرتا ہے۔ اس کی مثال قرونِ اولیٰ کے مذاہب میں ملتی ہے اور ان کے دیوتاؤں اور دیویوں کے افسانوں (   ) میں اس کا مذکور ہے۔ کسی شکل کے چار ہاتھ، اور کسی خر مغز کے دس سر، بیل کا جسد اس کو پر لگے ہوئے ہیں۔ شیر کا چہرہ، بیل کے سم اور علیٰ ہذا القیاس، یہ اشیاء خارج میں تو فطرتاً موجود نہیں لیکن انسان نے ممکنات کے توڑ جوڑ یا ترتیب بدلنے سے ایک نئی شکل پیدا کی اور پھر خارجی اسباب سے مورتیاں بھی گھڑ لیں، حقیقت یہ ہے کہ قوتِ واہمہ بڑے کام کی چیز ہے، محال اندیش ضرور ہے مگر جب عقل کے سامنے پیش کرتی ہے تو وہ اس کو ممکن صورت میں ڈھالتی ہے، تمام اختراعات اور ایجادات میں عقل واہمہ کی ممنون ہے۔ "بے مصلحتے نیست ظہورِ شیطان"

زہر رنگئے توہم ساز صد آہنگ   محال اندیش چوں کیفیت بنگ

رنگ ایک ہو تو واہمہ اس کو سو رنگوں میں دکھاتا ہے، جس طرح بھنگ کے نشہ میں انسان زمین پر رہتے ہوئے فلک کی سیر کرتا ہے یہی کیفیت واہمہ قلب میں پیدا کرتا ہے، اسی طرح

ہمانا چشم او اصفر رقم بود
کہ ہر نقشے از وہ بر یک افزود

یعنی کثرت جو ہم مشاہدہ کر رہے ہیں چشم وہم سے کرتے ہیں، فی الحقیقت یہ وحدت ہی ہے جو کثرت کی صورت میں جلوہ گر ہے۔

جسے "علم" کہتے ہیں وہ اشیاء ہی کی معرفت ہے اور اس تعلق کا جاننا

جس سے اشیاء آپس میں مربوط ہیں۔ اشیاء میں تو کثرت مشاہدہ ہوتی ہے، اور اختلاف اور کثرت لازم ملزوم ہیں، بلکہ ان میں تخالف تضاد کی حد تک ہے۔ اس میں ربط "وحدت" ہی ہو سکتی ہے، ہمیں کسی شے کا علم حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اس کو نقطہ وحدت پر نہ لائیں۔

کثرت کا مشاہدہ تو ہو رہا ہے، سوال یہ ہے کہ "وحدت" کا مشاہدہ کس طرح ہوتا ہے، اس کے دو طریق ہیں، ایک استدلال عقلیہ سے اور دوسرے بداہتاً۔ یہ ظاہر ہے کہ بدیہی امور میں کوئی الجھن کوئی شک وشبہ نہیں ہوتا، "آفتاب آمد دلیل آفتاب" استدلال عقلیہ میں غلطی کا احتمال ہی نہیں بلکہ واجب ہے کہ انسان عقلاً غلطی کرے، کیونکہ اسی پر اس کا ذہنی ارتقا منحصر ہے۔ طبقہ حیوانات ماسوٰی انسان غلطی نہیں کرتا مگر ترقی بھی نہیں کرتا استدلال عقلیہ میں چند امور بنیادی ہیں، "عینیت" یعنی دو اشیاء کا مختلف زمان و مکان میں ہر ایک تفصیل میں بعینہٖ ایک جیسا ہونا، مماثلت اور مشابہت اور تخالف اور تضاد بہ تعلق زمان و مکان مثلاً دور و نزدیک اور تہ و بالا اور پس و پیش اور علیٰ ہذالقیاس اور علّت وغیرہ۔ ان قوانین تحقیق کے تحت کسی شے کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور نامعلوم معلوم ہوتا ہے، یہ طریق استدلال اصطلاح میں تذکر و عبرت و تدبّر و تفکّر سے موسوم ہے "عقل" ایسے امور میں جو ما بعد اسبعیہ سے تعبیر نہیں ہوتے اور خواہ بدیہی ہوں مدد کرتی ہے، ان امور میں اس کی تصدیق واجب ہے۔

طورِ معرفت

یونیورسٹی لائبریری لاہور میں قلمی نسخہ مثنوی محیطِ اعظم اور طورِ معرفت کا موجود ہے۔ یہ نسخہ اسداللہ خاں غالب کے زیر مطالعہ رہا ہے۔ اور اس پر غالب مرحوم کی مُہر ثبت ہے۔ غالب نے دونوں مثنویوں کی تعریف میں ایک ایک شعر اپنا اس نسخہ پر لکھا ہے۔ مہر پر ۱۲۳۱ھ ثبت ہے۔

از بس صحیفہ بنوعے ظہور معرفت است
کہ ذرّہ ذرّہ چراغاں طور معرفت است

مرحبا بے راکہ موجش گل کند جام جم است
آبحیواں آبجوئے از محیط اعظم است

اس سے بڑھ کر بیدل کے کلام کی تعریف و توصیف اور کیا ہوسکتی ہے کہ غالب سا بلند پایہ شاعر مداح ہے۔

طورِ معرفت میں بیدل نے مظاہر فطرت، قوس و قزح و شفق و کہسار و کوہ و ابر وغیرہ پر وہ کچھ لکھا ہے کہ قلم توڑ دیا ہے۔ اس کے بعد اور کوئی کیا لکھے گا۔ اس مثنوی اور مثنوی طلسم حیرت کے ابیات چھ چھ ہزار ہیں۔ مگر مکمل اب دستیاب نہیں ہوتی۔ ہم طورِ معرفت سے چند ابیات دربارہ قوس و قزح اور حباب کا

انتخاب کرتے ہیں۔

زموج سبزہ و گل رنگ ہا جست
شفق تابے زد و قوس و قزح بست

گھاس اور پھول کی سبز اور سُرخ رنگینی اُبھری، اس سے شفق نمودار ہوئی اور قوس و قزح بنی۔

گر از وصف قزح گیرد بیاں رنگ
بہ بالد از زمیں تا آسماں رنگ

اگر قزح کی تعریف میں بیان کسی رنگ میں کیا جائے تو زمین سے آسمان تک رنگینی ہی چھا جائے گی۔

رگِ ابرِ بہارستانِ نیرنگ   طلسم ریشہ فردوس در چنگ

قوس و قزح کو دیکھو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابرِ بہار کی رگوں سے رنگینی برس رہی ہے یا باغ فردوس نے جو طلسم باندھ رکھا ہے وہ اس کے قبضہ تصرّف میں ہے۔

پرِ طاؤس صرف رشتہ دام   خیال لعل نوخط بر لب جام

مور کے پروں کی رنگینی اور نقش و نگار کی تحسین تو لوگ کیا کرتے ہیں، یہ سمجھو کہ قوس و قزح نے جال پھیلا رکھا ہے جس کے تاروں میں مور کے پر اُلجھ کے رہ گئے یا جام کے لب پر لعل نوخط کا تصوّر کرو، یعنی ایک حسین کے سُرخ لب جس پر سبزہ کا آغاز ہو جام کے لب سے ملے ہوئے ہیں جس میں بادہ ارغوانی کا بھی ایک رنگ ہے، یہ سب رنگینیاں مل کر قوس و قزح بنی۔

کشیدہ خامہ نقاش فطرت   خطوط امتحاں رنگ قدرت

نقاشِ فطرت کے خامہ نے قدرت کی رنگینیوں کو امتحاناً خطوں میں کھینچا کہ معلوم ہو کس درجہ پر ہیں۔

نزول قطرہ ہا از اوج افلاک   اگر بینی بسوئے مرکز خاک

خدنگ بے خطائی ایں کمان است کہ تا آماجگاہ دل روان است

اگر تو یہ نظارہ دیکھ رہا ہے کہ آسمان کی بلندی سے قطرے مرکز خاک کی طرف گر رہے ہیں تو یہ تصوّر کر کہ تیر ہیں جن کا نشانہ خطا نہیں ہوتا۔ اور اسی "دھنک" سے یہ تیر پرواز کرتے ہوئے دل کے ہدف پر بیٹھتے ہیں۔

چند اشعار ابر، شفق اور حباب پر ملاحظہ ہوں۔

چہ ابر آئینہ نازکِ گل و مل بہار صد شبستان زلف و کاکل

ابر کیا ہے؟ گل و مل کی لطافت و نزاکت کا آئینہ دار ہے زلف و کاکل کی سو شبستان کی بہار ہے، بہار کے موسم میں پھول کھلتے ہیں اور بہار ہو اور ابر ہو تو دور شراب کا لطف اور زیادہ ہوتا ہے۔ گھنگھور گھٹا کی زلف و کاکل سے تشبیہ نہایت موزوں ہے۔

ولے زلفے کہ در یک جنبش باد ہزاراں دل تواند کرد ایجاد

زلف بھی وہ کہ ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے لہرائے تو ہزاروں دل گرفتار ہو کر رہ جائیں۔

جنوں پیما بہ چشمے گریہ آہنگ
سیہ مستے شکستہ شیشہ در چنگ

ایک عالم وحشت میں جا رہا ہے اور آنکھ رونے پر آمادہ ہے، بدمست ایسا کہ ٹوٹا ہوا شیشہ پنجہ میں ہے۔ یہ تو الفاظ ہیں ان سے جو کیفیت ذہن میں آتی ہے وہ کچھ اور ہے "سیہ مست" انتہائی بدمست کو کہتے ہیں، ابر سیاہ کے ہاتھ میں شیشہ مے تو ہے مگر ٹوٹا ہوا، سیہ مستی کا یہ کرشمہ ہے، شیشہ ٹوٹا تو بادہ گر کر زمین پر آ رہا۔ اس پر اس جنوں زدہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے۔

سپہرے ریزش سیارہ خرمن شبستاں چراغاں زیر دامن

آسمان کی طرح چھایا ہوا ہے اس کے خرمن میں سیاروں کے دانوں کا انبار ہے مگر وہ اب چمکتے نظر نہیں آتے، ابر نے ان آسمانی چراغوں کو اپنے

دامن کے نیچے چھپایا ہوُا ہے۔

چو مژگان ہجوم اشک بستہ قدح در دست و مینائی شکستہ

مژگان سیاہ کی طرح جس پر آنسوؤں کا ہجوم ہو، قدح ہاتھ میں اور صراحی ٹوٹی ہوئی۔

ہماں دیوانۂ ژولیدہ موئیست
کہ با سودائی خویشش ہائی ہوئیست

وہی دیوانہ ہے کہ بال ژولیدہ (جٹادھاری) اپنی وحشت میں ہاوہو میں مست ہے۔

گہے از برق برآفاق خندد گہے برخاک سیل گریہ بندد

کبھی تو آفاق پر بجلیاں گراتا ہے ساتھ ہی رعد کی گرج سے قہقہہ بھی لگاتا ہے کبھی زمین پر آنسوؤں کا سیلاب بہا دیتا ہے۔

بہ تیغ کوہ گاہے سینہ مالد گہے گیرد رہ دشت و بنالد

"تیغ کوہ" پہاڑ کے پہلو کو کہتے ہیں، کبھی پہاڑ کے پہلوؤں سے سینہ رگڑتا ہے اور کبھی جنگل کا راستہ لیتا ہے اور روتا ہے یعنی برستا ہے۔

نگویم ابر مستے نشہ فیلے بگردوں موج زن دریائی نیلے
و لے فیلے کہ تا جوشید میلش بہ پیچد کوہ را خرطوم میلش

میں یہ نہیں کہتا کہ ابر نشہ میں مست ہاتھی ہے آسمان پر ایک دریا نیل طغیانی میں ہے مگر ہاتھی وہ کہ جب جوش میں آتا ہے تو اس کی سونڈھ پہاڑ کو گھیرے میں لے لیتی ہے۔

بہر جائیکہ شبنم رشحہ کارد مزاج عالم از خشکی برآرد

جہاں کہیں تھوڑی سی اوس کا ترشح بھی ہوتا ہے، عالم کی طبیعت سے خشکی دور کر دیتا ہے، شفق کے متعلق چار شعر ملاحظہ ہوں۔

چہ گویم زیں شفق ہائی جہان تاب کہ آتش ہم نمی باشد بایں آب

شفق ایک تو طلوعِ صبح کے بعد اور ایک غروبِ آفتاب کے وقت اُفق پر ظاہر ہوتی ہے، ان کی نسبت کیا کہا جائے آگ میں بھی وہ آب یعنی چمک دمک نہیں۔

دو عالم رنگ و رنگ شعلہ دود   ہوا حل کردو بر گردونش اندود

عالم صبح و شام شفق کے رنگ میں رنگیں مگر رنگ دھواں جو شعلہ ہے جیسے ہوا نے حل کر کے آسماں کے چہرہ پر غازہ کر دیا ہے۔

دمے کایں شعلہ نیرنگ افروخت   جہاں در نالہ آمد کاسماں سوخت

جس وقت یہ شعلہ نیرنگ بھڑکا جہاں سے شور اٹھا کہ آسمان جل رہا ہے۔

کدامیں بسمل ایں جا پرفشاں شد
کہ خونش رفتہ رفتہ آسماں شد

وہ کون بسمل تھا جو تڑپ کر یہاں پہنچا کہ اس کا خون رفتہ رفتہ آسمان بن گیا۔

"حباب" پر تو ہیچ میچ قلم توڑ دیا ہے۔ شمع و شاعر وغیرہ پر شعراء نے بہت کچھ لکھا ہے طورِ معرفت سے شفق اور شاعر اور ابر پر کتنے مضامین جمع ہو سکتے ہیں۔

نہ ہے وضع حباب بے سر و پا   کہ حیرانی ز نقش اوست پیدا

پانی کا بلبلہ کیا ہی عجیب شے ہے کہ نہ سر نہ پاؤں، اس کی شکل و صورت سے حیرانی ہوتی ہے۔

نفس در دامنِ دل پاشکستہ   نگہ با شرم عقد دیدہ بستہ

اس کا سانس دل کے دامن میں پاؤں توڑ کر بیٹھ رہا، نگاہ مارے شرم کے آنکھ سے باہر نہیں نکلتی۔

"نگہ با شرم عقد دیدہ بستہ" میں اشارہ "دلہن" کی شرم وحیا و حجاب کی طرف ہے، نگاہ نے شرم کے ساتھ عقد باندھا پردہ نشین ہوگئی "حباب" کی صورت آنکھ کی ہے مگر نگاہ پردہ مژگاں سے باہر نہیں آتی۔

اگر چشم است بر غیرش نظر نیست   وگر پا از خودش بیروں سفر نیست

آنکھ ہے تو غیر پر نظر نہیں پڑتی پاؤں ہیں تو اپنے وجود سے باہر نہیں نکلتے۔

چو ساغر بادشاہ عالم آب　　کلاہ آرائی ناز از وضع آداب

حباب ساغر کی طرح "عالم آب" کا بادشاہ ہے۔ بحر یا دریا عالم آب ہے، "عالم آب" میخانہ کو بھی کہتے ہیں، اس مناسبت سے حباب ساغر ہے جس سے اس کی صورت ملتی جلتی ہے، اور بادشاہی کی مناسبت سے کلاہ یا تاج کی شکل بھی ہے۔

حیا چوں چشم حصن آہنیش　　خموشی ہم چو لب نقش نگینش

"حصن" کے معنی قلعہ جس میں بیٹھ کر بیرونی حملے سے محفوظ ہو جاتے ہیں، حیا کی جگہ آنکھ ہے، مگر حباب کی آنکھ ایک آہنی قلعہ ہے یہ قلعہ بھی سربمہر ہے۔ حباب کی صورت دیکھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہر ہے، "مہر" سے تخیل "مہر بر لب" کی طرف منتقل ہوا جو خموشی کے ہم معنی ہے، جس شے پر مہر لگا دی جائے وہ بند ہو جاتی ہے، لب پر مہر لگنا محاورہ ہے۔ یعنی خاموش ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حباب میں دونوں باتیں مشاہدہ ہوتی ہیں ایک "حیا" اور دوسری "خاموشی"۔ حیا کا تقاضا بھی خاموشی ہے حیا کا تعلق آنکھ سے اور خاموشی کا لبوں سے۔ دونوں سربمہر ہیں۔

چو او نتواں صفائی سینہ دادن　　نفس را صیقل آئینہ دادن

حباب کی طرح کسی کا کیا دل و گردہ ہے کہ سینہ صاف ہو، سانس سینہ سے نکلتا ہے جب سینہ صاف ہو تو سانس بھی لطافت میں صاف ہونا چاہئے۔ مگر اگر آئینہ پر سانس پھونکا جائے تو وہ مکدر ہو جاتا ہے۔ لیکن حباب کی کیفیت ہی مختلف ہے، کہ یہی سانس اس کے آئینہ سینہ کو صاف کر رہا ہے گویا صیقل کا کام دے رہا ہے اور کدورت رفع کر رہا ہے۔

نہفتہ از نفس آں سربسر چشم　　پری در شیشہ چوں نظارہ در چشم

حباب کی صورت سربسر آنکھ کی ہے مگر ہوا بھی ہے جو اس نے باندھ

رکھی ہے، آنکھ کا کام نظارہ ہے۔ نگاہ پرواز کرتی ہے تو کسی منظر پر پڑتی ہے اور یہ منظر حسین پری رو ہے، ان مختلف خیالات کو اس شعر میں ربط دیا گیا ہے کہ حباب دم بخود ہے سر بسر آنکھ کی صورت ہے مگر جس طرح نظارہ آنکھ میں سمایا ہوتا ہے اسی طرح اس نے شیشہ میں پری اُتار رکھی ہے، آنکھ میں بھی شیشہ ہے اور اسی شیشہ پر بیرونی دُنیا کا عکس پڑتا ہے تو ہم اسی عکس کو دیکھتے ہیں جسے بیرونی اشیاء کی صورتوں سے تعبیر کرتے ہیں، اسی طرح حباب میں ہوا شیشہ کا کام دے رہی ہے، جس میں جہانِ رنگ خارجی کا عکس پڑتا ہے جسے "نظارہ" سے موسوم کیا جاتا ہے، اگر مسئلہ تجدد امثال سمجھ لیا ہے تو یہ سمجھنا آسان ہے کہ یہ نظارہ پری ہے مگر حباب نے اسے شیشہ میں بند کر رکھا ہے۔ یعنی حباب کے آئینہ میں بیرونی دنیا کا عکس ہے۔

نفس در آئینہ دزدیدہ زاں رنگ
کہ اشکش سوخت آتش در دلِ سنگ

بیدل کے تخیّل کی لطافت اور بلندی کو کون پہنچ سکتا ہے، ہر ایک شعر کی شرح کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ اور حقیقتاً یہ ہے کہ ایک کیفیت ہے جو ذہن میں آتی ہے، نثر میں ادا نہیں ہو سکتی۔ اور شعر کی خوبی ہی یہ ہے کہ نثر میں ادا نہ ہو سکے، اس شعر میں وہی ہوا یا سانس کا تخیّل ہے، کتنی تشبیہات ہیں جن کے پیرایہ میں اس نے اس خیال کو واضح کیا ہے، آئینہ خود پتھر ہے، اور پتھر میں آگ ہوتی ہے۔ لیکن جب پتھر آئینہ کی صورت اختیار کرتا ہے تو یہ آگ جل کر آب کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، علم کیمیا کے عالم جانتے ہیں کہ پانی کے دو اجزا دو ہوائیں ہیں ایک ہوا خود آگ ہے اور دوسری آگ کی معاون و ممد ہے، جب دونوں ایک خاص تناسب سے ملتی ہیں تو آگ کی ضد پانی بن جاتا ہے، اور پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ یہ فطرت کی صفت عجیب ہے، یہی مطلب اس شعر کا ہے کہ آئینہ میں ہوا اس وضع سے دم بخود ہے کہ اس کے آنسو

پتھر کے دل کی حرارت ٹھنڈا کر رہے ہیں۔

چراغش در کمین پاس ناموس نفس دزدیدہ تر از وضع فانوس

ہوا آگ کو بھڑکاتی ہے لیکن یہی آگ جب چراغ کی روشنی میں ہو تو ہوا کے جھونکے اسے بجھا دیتے ہیں، حباب کی صورت چراغ کی ہے، اور اس میں ہوا بھی ہے گویا چراغ رہ گذر باد پر ہے اور بجھ جائے گا۔ اس خطرہ سے بچنے کے لئے جو حباب کی زندگی کو لاحق ہے اس نے دم سادھ لیا ہے۔ چراغ پر فانوس بھی ہوتا ہے، جس کا ایک مقصد یہ ہے کہ چراغ کو بیرونی ہوا کے حملہ سے بچائے، لیکن حباب کے اندر تو خود ہوا ہے، اور فانوس باہر ہوتا ہے اور باہر کی ہوا کے لئے روک تھام کا کام دیتا ہے۔ اس لئے حباب نے اس خطرہ کا سدِّ باب اس طرح کیا، ہوا باندھ رکھی ہے۔

سُبک روحی وکار امتیازش تہی از خود شدن سامان سازش

سبکی جسے ہم محاورہ میں ہلکا پن کہتے ہیں "وقار" کی نفی ہے۔ اور جو ہاتھ خالی ہو یا جس کے گھر میں آتو بولتا ہو وہاں اسباب وسامان مفقود ہوتا ہے، یہ اضداد ہیں جو بیدل نے ان تمام ابیات میں جو ہم لکھ چکے ہیں جمع کر دئے ہیں۔ سبکی سے وقار اور تہی دستی سے سازوسامان کا مفہوم پیدا کیا ہے۔ سانس میں سانس یا روح ہے، "روح" اور "راح" اور "ریح" ایک ہی لفظ ہے، جس کا ترجمہ ہوا ہے، یہ روح کتنی سُبک یا لطیف ہے کہ حباب کی امتیازی خوبی بھی اسی کی لطافت میں ہے، "تہی از خود شدن" کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں غیر کی گنجائش کا کیا سوال ہے جبکہ وہ آپ ہی اپنے آپ سے خالی ہے، بیدل نے خودی اور بیخودی کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ مناسب مقام پر چند اشعار کا حوالہ دیا جائے گا۔ حباب کا سازوسامان ہی "تہی از خود شدن" ہے۔

چناں بر آب دارد سیر تمکیں کہ گوئی بیضہ مرغابیست ایں

مرغابی یعنی بطخ وغیرہ پانی کے جانور ہیں اور خشکی پر رہتے ہیں، پانی میں غوطے بھی لگاتے ہیں مگر ان کے پروں کا دامن تر نہیں ہوتا، اسی طرح حباب پانی پر تمکنت کے ساتھ سیر کر رہا ہے، گویا مرغابی کا انڈا ہے۔

بہر آب از سبک ساری رواں است
تہی چوں گشت کشتی بادباں است

ہر ایک پانی پر خواہ دریا کا ہو یا بحر کا، بے تکلف پیر رہا ہے، جب اپنے آپ سے خالی ہوا تو یہی کشتی بادبان کا کام دے رہی ہے، بادباں میں ہوا بھرتی ہے تو کشتی ہوا کے زور سے تیز رو ہو جاتی ہے۔ چونکہ حباب "از خود تہی" ہے اس لئے یہ تو ہوئی کشتی کی صورت ہوا جو اس کے اندر ہے بادباں کا کام دیتی غرض حباب کشتی بھی ہے اور بادباں بھی، اس لئے اس کی روانی کے اسباب اس کے اندر ہی موجود ہیں، غیر کا محتاج نہیں۔

باں رنگش نزاکت نقش بستہ است
اگر چشمے بہم مالد شکستہ است

اس کی نزاکت کا یہ عالم ہے، نزاکت نے یہ رنگ باندھا ہوا ہے کہ اگر آنکھ ملے تو ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے، فارسی میں رنگ بستن اور شکستن محاورہ ہے۔ ہم محاورہ میں رنگ جمانا اور رنگ اُڑنا کہتے ہیں، نزاکت نے اپنا رنگ اس وضع سے جما رکھا ہے کہ اگر ذرا آنکھ ملے تو اُڑ جائے یعنی حباب کا وجود ہی فنا ہو جائے، حباب کی صورت آنکھ کی ہے لیکن یہ تب تک ہی زندہ ہے جب تک چشم بستہ ہے، ذرا آنکھ کھُلی اور یہ کہیں کا نہ رہا۔

نگاہ از نازکی نکشودہ مژگاں　　قدم از عاجزی نشکستہ داماں

نگاہ نزاکت کی وجہ سے مژگاں اُٹھا نہیں سکتی اور قدم ضعف کی وجہ سے اُٹھ نہیں سکتا۔

ہوا صہبا ایاغے دل شکستہ　　نفس روغن چراغے شعلہ جستہ

بفانوسِ نفس می سوزد و بس   خیالے محض می افزود و بس

اس نیم نفس نے جو ہوا باندھ رکھی ہے اس میں ایک نشہ ہے، خود ٹوٹے ہوئے پیالہ کی شکل ہے جس سے مستی ٹپکتی ہے، اس کا سانس یا یہ ہوا جو سراپا ہے چراغ میں تیل کا کام دیتی ہے، یہ خود چراغ کی صورت ہے مگر "شعلہ جستہ" ہے، چراغ میں تیل ہوتا ہے اور وہی جلتا ہے، اس سے شعلہ نکلتا ہے، یہ سب کچھ حباب ہی ہے، یہ سامان نور و نار بھی اسی میں ہیں، اس کے فانوس میں اسی کا سانس جل رہا ہے اور محض خیال کی صورت نمایاں ہو رہی ہے، اس شعر میں "سورہ نور" کی ابتدائی آیات کی طرف اشارہ ہے، کہ چراغ ہے اس میں روغن زیتون ہے اور اتنا صاف ہے کہ اس میں صلاحیت ہے کہ بغیر آگ دئے خود بخود بھڑک اٹھے۔

چو صبحش در قفس غیر از نفس نیست
ولے تا پر زند سازِ قفس نیست

صبح کو بھی نفس ہی کہا گیا ہے۔ صبح کی طرح اس کے قفس میں سانس کے سوا اور کچھ نہیں ہے، گویا یہ ایک پرند ہے جو پنجرہ میں بند ہے، اگر پھڑپھڑائے تو پنجرہ ندارد، پانی کا بلبلہ ایک قطرہ آب میں ہوا کے سوا اور کچھ نہیں اگر یہ ہوا نکل جائے تو بلبلہ ختم ہو گیا۔

معمائے چنیں عالم ندارد   کہ تا بشگافت نامے ہم ندارد

تمام دنیا جہان میں حباب ایک معما ہے، اسے حل کرو تو اس کا نام و نشان مٹ جائے گا۔

بیدل نے ابر و شفق و حباب وغیرہم پر جو کچھ لکھا ہے اس کا شاعرانہ تخیل بلاشبہ بہت بلند ہے لیکن وہ اس سے کچھ اخلاقی نتیجہ بھی اخذ کرتا ہے، چنانچہ "حباب" پر اتنا لکھ کر کہتا ہے کہ

مپرس از من تماشائے حبابم   کہ من ہم گر بخود اندیشم آبم

یہ مشاہدہ جو حباب کا میں نے کیا ہے اس کا اطلاق مجھ پر بھی ہوتا ہے کہ میں تو حباب کی طرح نقش بر آب ہوں، میری بھی اصل اور زندگی یہی آب ہے۔ (کل شئی حی من الماء)

شبے کز گریہ طوفاں کاریم بود حباب آئینہ دلداریم بود

ایک رات جب میرا گریہ طوفاں برپا کر رہا تھا حباب میں مجھے دلجوئی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

نفس در پردہ دل آہ می بیخت
نگاہ از چشم حیراں نالہ می ریخت

دل کے پردہ میں نفس آہ بھر رہا تھا، نگاہ چشم حیرت زدہ سے نالہ وفغاں کر رہی تھی۔

تارِ نظر اور نالہ ایک ہی روش پر چلتے ہیں، یہ گریہ وزاری حباب میں بھی مشاہدہ ہوتی ہے، اب حباب زبانِ حال سے کچھ کہہ رہا ہے۔

کہ اے غافل تو خود ہم چشم مائی
ز وضع بیدلی بیدل چرائی

کہ اے بے خبر تو خود میرا ہم چشم ہے، تیری وضع بیدلی میری وضع "تہی از خود شدن" ہے، تو دل شکستہ اور مایوس کیوں ہے۔

طرب ہا کن گرت اشکے و آہیست
سرے بے مو دریں عالم کلاہیست

خوش رہ، خوشی منا اگر اشک اور آہ کا ساز و سامان تیرے پاس ہے جو لازمہ عشق ہے تو اس عالم میں جو "سر بے مو" ہے وہ تاج ہے۔ "سر بے مو" وہ سر جس پر بال نہ ہوں۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

کے کشد بار کلاہ مہدی را سرے ما
ہست موئے سر ما بر سر ما افسر ما

کلاہ نمدی کا بوجھ میرا سر برداشت نہیں کر سکتا، میرے اپنے سر کے بال میرے سر پر کلاہ ہیں، بیدل کہتا ہے کہ ان بالوں کا بوجھ بھی ناقابل برداشت ہے، قلندر کو اس کی بھی ضرورت نہیں۔ "سر بے مو" بھی تو کلاہ کی صورت ہے۔

مثنوی طور معرفت چھ ہزار ابیات پر مشتمل ہے، ہم نے چند اشعار پیش کئے ہیں وہ بھی جستہ جستہ، مثنوی کے آخر میں ارشاد تفسیر "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" کی ہے۔

بیا اے بیدل بے حاصل خویش بخود پیچیدہ اما غافل از خویش

اے بیدل تو کتنا اپنی حقیقت سے بے خبر ہے اگرچہ تو اپنی ذات سے اُلجھا ہُوا ہے مگر اپنی خودی سے غافل ہے۔

حق از ساز تو پیدا و تو باطل
دل از جیب تو در جوش و تو بیدل

حق تیرے ہی ساز ہستی سے نغمہ سرا ہے اور تو اسے باطل سمجھ رہا ہے دل تیرے ہی پہلو میں تڑپ رہا ہے اور تو بیدل ہے۔

بصد دل چوں صنوبر بیدلی چند سراپا حاصلی بے حاصلی چند

صنوبر کی طرح سینکڑوں دل تیرے پہلو میں ہیں تو کب تک بیدل رہیگا۔ تو سراپا حاصل ہے، خود مقصد ہے، کب تک بے حاصلی کا شکوہ کرتا رہیگا۔

بوہمت صرف شد عمر گرامی تمامت کرد آخر نا تمامی

تو ہمات میں تیری عمر گراں مایہ صرف ہوگئی، آخر ناتمامی نے تجھے ختم کر کے رکھ دیا۔

نہ گرد ت زیب دامان ہوا شد نہ رنگت با شکستے آشنا شد

تیرے غبار ہستی نے ہوا کے دامن پر کچھ زیبائش پیدا نہیں کی نہ تیرے رنگ نے شوخی کا اظہار کُھل کر کیا آدم خاکی ہے اور ہوا وہوس کا پُتلا، اس میں بھی اس نے کوئی شان پیدا نہیں کی، رنگ کی شوخی اس کے کھُلنے پر ظاہر ہوتی ہے

نہ داغے سر کشید از لالہ زارت
نہ خونے ریخت رنگ نو بہارت

تیرے لالہ زار سے کوئی داغ نہ اُبھرا، اور یہی لالہ کے حُسن کو دو بالا کرتا ہے اور نہ تیرے لہو نے نو بہار کا رنگ پیدا کیا۔

اگر حسنی بدہ عرض جمالے   وگر آئینۂ بنما مثالے

اگر تو حسن ہے تو جمال میں جلوہ نما ہو تو کوئی حسین صورت دکھا۔

حسن آئینہ میں حسین صورت ہی دکھاتا ہے۔

بہر دامن چو گرد آویختن چند   بہر رنگے چو آب آمیختن چند

گرد و غبار کی طرح ہر ایک کے دامن کو آلودہ کرنا یا اس سے وابستہ رہنا کب تک، ہر ایک رنگ میں پانی کی طرح ملنا کب تک۔ اگر کسی کا دامن پکڑیں تو محاورہ میں اس کی دستگیری قبول کرنا ہے، یا توصل یا وسیلہ کے معنی ہیں، رنگ پانی ہی میں حل ہوتا ہے۔

اگر گردی بداماں خود آویز   وگر آبی بروی خویشتن ریز

اگر تو گرد ہے تو اپنے ہی دامن سے وابستہ رہ اور اگر پانی ہے تو اسے اپنی آبرو بنا۔

فراموشی نیاز این و آں کن   بخود پرداز و کار صد جہاں کن

جو بھی تیرا غیر ہے، یہ ہو یا وہ بھول جا، خود شناس ہو اور سو دنیا جہاں کا کام سرانجام دے۔

شوی تا از نماز عشق محرم   وضوئے کن بخون ہر دو عالم

نماز کے لئے اوّل وضو شرط ہے، نماز عشق کا وضو دو عالم کے لہو سے ہوتا ہے، یعنی دو عالم مقصد بالذات نہیں، اس کثرت کی نفی اثبات وحدت ہے، تو نماز عشق سے واقف اسی حالت میں ہو سکتا ہے جب دو عالم سے ہاتھ دھو کر یک سو ہو۔

زنقش غیر اگر آگاہ نیست براہِ کفر ہم گمراہیت نیست

اگر غیر کا نقش یا تصوّر تیرے دل میں نہیں تو کفر کے راستہ پر چل کر بھی تو گمراہ نہ ہوگا۔

اگر آلودۂ احرام غیری ہمہ گر کعبہ باشی ننگ دیری

اگر تو نے غیر کا احرام باندھا ہؤا ہے تو خواہ تو سرتاپا کعبہ بھی ہو بُت خانہ بھی تجھ سے عار کرے گا۔

جہاں یک برق تازی نگاہ ہست
تو گر پوشی نظر عالم سیاہ ہست

یہ عالم یہ کائنات کیا ہے تیری اک نگاہ کی جولانی، ایک ہی نگاہ برق تاز تمام جہان کو تیرے آغوش مژگاں کے احاطہ میں لے آتی ہے۔ اگر تو بند کرے تو تمام عالم تاریک ہے، معلوم ہؤا کہ یہ تیری برق نظر کا نور ہے جس سے یہ عالم منوّر ہے۔ تو نظر ہٹالے تو یہ سیاہ ہے۔

اگر نظّارۂ غیر است در پیش بسوز و داغ شو در آتش خویش

اگر غیر کا نظارہ تیری نگاہ کے سامنے ہے تو اپنی ہی آگ میں جل بھن کر داغ ہوتا رہ۔

کہ نزد آگہی افروختنہاست سزائی کارِ غفلت سوختنہاست

عقل و شعور کے نزدیک تو چمکنا دمکنا پسندیدہ ہے مگر غفلت کے کاموں کی سزا جلنا، پشیمان ہونا ہے۔

بہ عین قرب محروم حضوری
بجو خود را کہ از خود سخت دوری

تو عین قرب میں ہوتے ہوئے حضوری سے محروم ہے اپنے آپ کو ڈھونڈھ خود شناس ہو تو اپنے آپ سے بہت دور ہے، حالانکہ فی نفس الامر تو اپنی خودی کے نزدیک تر ہے اس قرب کے ہوتے محروم ہے۔

مباش از جستجوئے خویش نومید
ہمیں نور است رہبر تا بخورشید

تو اپنی خودی کی تلاش میں لگا رہ، مایوس نہ ہو، تیری خودی اسی سورج کی ایک کرن ہے جو نور کا سرچشمہ ہے، یہی تیری رہنمائی اس چشمہ نور تک کرے گی۔

بکنہ خویش تا نتواں رسیدن — جمال حق چہ امکانست دیدن

جب تک تو اپنی کنہ اپنی ہی حقیقت سے واقف نہ ہوگا۔ یہ کب ممکن ہے کہ تو جمال حق کے دیدار سے مشرف ہو۔

حکیم سنائی "حدیقہ" میں کہتا ہے کہ

آنکہ در نفس خو زبوں باشد — عارف کردگار چوں باشد

جسے اپنے ہی نفس کی معرفت نہیں وہ اپنے رب کی معرفت کیسے حاصل کرسکتا ہے۔

خواجہ حافظ کا ارشاد بھی یہی کچھ ہے، بیدل کہتا ہے۔

دراں وادی کہ طالب نیست معلوم
طلب ہا جملہ موہوم است موہوم

طالب اور مطلوب میں رابطہ طلب کا ہے۔ جب طالب ہی وادی تحقیق میں نامعلوم ہو تو ظاہر ہے کہ طلب ایک امر موہوم ہے۔

وگر اسرار خود فہمیدہ باشی — یقین نقش ذاتی دیدہ باشی

امر موہوم اور شے ہے جس سے یقین کا مرتبہ حاصل نہیں ہوسکتا اگر تو "اسرار خودی" کو سمجھ گیا ہے تو یقیناً تجھے نقش ذات کا مشاہدہ بھی ہوگا۔

نخست از رہ غبار خویش بردار — وگر از منزل حق سر بروں آر

اس جادۂ تحقیق خودی کو ضرور ہے کہ گرد و غبار سے صاف کر اور یہ تیرے توہمات ہیں جو دیدہ مشاہدہ میں اڑا اڑ کر خاک دھول ڈال رہے ہیں۔

جب یہ راستہ گرد و غبار سے صاف ہو جائے گا تو منزل حق بھی صاف صاف دکھائی دے گی اور تو وہاں پہنچ جائے گا۔ اوّل تزکیہ نفس کی ضرورت ہے۔

توئی سر منزل تحقیق و عالم تگ و پوئے کہ ہم در تست مدغم

منزل اور یہ عالم کیا ہے تو خود ہے۔ تیری خودی ہے۔ اور منزل تک دوڑ دھوپ بھی تو ہی کر رہا ہے جو تیرے وجود کا خاصہ ہے۔ تیرے ہی وجود کا جزو ہے۔

ز منزل تا نخواہی سر کشیدن دریں صحرا محال است آرمیدن

جب تک تو منزل پر نہیں پہنچتا تو ناممکن ہے کہ تو دشتِ ہستی میں ایک دم آرام سے بیٹھ سکے۔

یکے منزل دوئی راہست ایں جا بفہمد ہر کہ آگاہست ایں جا

منزل تو ایک ہی ہے مگر راستے اس کی طرف کثرت سے جاتے ہیں اس راز کو حق آگاہ حضرات ہی سمجھتے ہیں۔

زمیں تا آسماں گامے ندارد رہ منزل بجز نامے ندارد

حقیقت یہ ہے کہ زمیں تا آسماں ایک نگاہ کے ایک قدم کا فاصلہ بھی نہیں۔ اس لئے راستہ خواہ کوئی ہو ایک نام ہی نام ہے ورنہ موجود نہیں۔ جو کچھ ہے منزل وحدت ہی ہے۔

دوئی تا بست مشکل بایدت رفت کہ ہر گامے دو منزل بایدت رفت

جب تک دوئی یا کثرت کا تصوّر ذہن میں ہے تو یہ منزل نہیں بلکہ راستہ ہی راستہ ہے اور کبھی طے نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہر ایک قدم دو منزلوں کی طرف اُٹھے گا، اور کسی منزل تک رسائی نہ ہوگی۔

ز نام خضر تا آگاہ باشی ہمہ گر منزلی در راہ باشی

خضر کا کام تو راستہ پر رہنمائی کرنا ہے اور جب تک منزل پر نہ پہنچ جائیں خضر رہبر ہے۔ اس لئے جب تک تیرے ذہن میں خضر کا تصوّر ہے خواہ

تو سرتا پا منزل ہی کیوں نہ ہو، ابھی راہ میں ہے۔

نہ بندی تا بفہم خویش احرام　　پلید نہاست برق نبض آرام

خضر بہر حال تیرا غیر ہے، تیری خودی ہی تیرا خضر اور رہنما ہے جب تک خودشناسی کا احرام نہ باندھے گا، یہ سمجھ کہ کعبہ مقصود کا حج نصیب نہ ہو گا۔ یہ نبض مضطرب ہی رہے گی حالانکہ تجھے منزل پر اطمینان قلب حاصل ہونا چاہیئے۔

تسلّی در ہمیں آرام گاہ است　　زمنزل آنچہ بیرونست راہ است

ظاہر ہے کہ منزل سے باہر جو کچھ بھی ہے راہ ہی ہے اور راہ پر دوڑ دھوپ ہی ہے آرام اور اطمینان تو منزل پر ہی میسر ہو سکتا ہے۔

رُباعیات

رباعیات کی تعداد بھی ہزاروں ہے۔ چند رباعیات ہم بعض اشعار کی تشریح کرتے ہوئے لکھ چکے ہیں، چند ایک ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

بیدل نخوری عشوہ اوہام ملا
آفاق پراست لیک از جنس خلا
جز وحدت صرف نیست در غیب و شہود
الا لفے دارد و باقی لا

یہ عالم کثرت ہے، اور سطحی مشاہدہ سے کثرت ہی محسوس ہوتی ہے یہ فریب نظر ہے، اسے اصطلاح میں "مشاہدہ حسی" کہتے ہیں، حقیقت" وحدت صرف" ہے خواہ ظاہر ہو یا باطن، لفظ "الا" میں الف تو حقیقت ہے باقی "لا" ہے، الف تو ثابت شدہ حقیقت ہے "لا" حرف نفی ہے۔ باقی ہیچ۔

انساں کہ نمودش آگہی عقبیٰ را
در ہیچ مکان کرم نخواہد خارا
شیطان چہ کس است اندکے فہم کنید
آں کس کہ شناخت ملک خود دنیارا

دنیا تو ہم مشاہدہ کر رہے ہیں، عقبیٰ کا تصور شعور عقلی سے ذہن میں پیدا ہوا، دنیا ہو یا عقبیٰ اللہ تعالےٰ کی رحمت سے جو کچھ ہے رحمت کی مناسبت سے خوب ہی ہے، اس رحم و کرم کا تقاضا ہی یہ ہے کہ کسی زمان و مکان میں کچھ بھی ایسی بات نہ ہو جو اس کے نامناسب ہے، اس لئے شیطان کا وجود جو ہمیں اس رحم و کرم سے دور رکھنا چاہتا ہے ایسے شخص کا ہی ہے جو دنیا کو اپنی

ذاتی ملکیت خیال کرتا ہے۔ شیطان اور شیطانی اعمال کا نتیجہ فتنہ وفساد اور عذاب دنیوی اور اُخروی ہے۔ جو فرعون اس دُنیا کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اس میں تصرف بھی اسی عقیدہ کے تحت کرتا ہے وہ ہمیں عذاب میں مبتلا کرتا ہے، اور خود راندۂ درگاہ الٰہی ہے۔

ہر گاہ کہ غنچہ گشت و نشگفت حباب — رمز حق و خلق ہیچ نہ نہفت حباب
لیکن نہ شنید موج سرگشتۂ ما — آں حرف کہ پوست کندہ گفت حباب

جب تک حباب غنچہ کی صورت ہے اور پھول کی طرح کھلا ہوا نہیں اس کی ہستی بجا ہے۔ حق و خلق کی رمز بیان کر رہا ہے اور کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھتا، لیکن ہماری موج سرگشتہ یہ حالات گوشِ ہوش سے نہیں سنتی جو حباب پوست کندہ بیان کر رہا ہے، محاورہ میں کہتے ہیں پوست کندہ حالات بیان کرتا، جب تک کسی شے پر پوست ہے وہ محجوب ہے، جب یہ حجاب اُٹھا دیا جائے تو اس شے کے اندرُونی حالات منکشف ہوتے ہیں، حباب کی بیرونی جلد پھٹ جاتی ہے تو جو کچھ اس کے اندر ہے ظاہر ہو جاتا ہے اور یہ صرف ہوا ہے، جب تک اس پوست کے ساتھ ہے وہ حباب سے موسوم ہوتا ہے جب پوست اُتر گیا تو حباب نہ رہا اپنے اصل پانی میں محو ہو گیا۔ یہی کیفیت خلق کی ہے، حق کا اظہار تو اس وقت ہوتا ہے جب یہ سانس یا ہوا جو ہستی موہوم نے باندھ رکھی ہے مفقود ہو جائے، ہر ایک شے تعینات میں محدود ہے، جب ان تعینات کی حد توڑ دی جائے تو اصل شے اپنے اصل کی طرف رجوع کرتی ہے۔ ہر ایک شے جو معیّن اور مشخص ہے محدود اور مخلوق ہے۔

آں حُسن کہ آئینہ امکاں پرداخت — ہر ذرّہ بصد ہزار خورشید نواخت
بایں ہمہ جلوہ نور در پردۂ غیب — تا انساں گل نکرد خود را نشناخت

وہ حُسن ازلی جب آئینہ امکان میں منعکس ہُوا ہر ایک ذرّہ کو لاکھ سورج کا نور عطا کیا۔ باوجود اس کے کہ ذرّہ ذرّہ نور ہے مگر پردہ غیب سے جب تک

انسان کا ظہور نہ ہوا اس حسن نے اپنے آپ کو نہ پہچانا۔ یعنی اسم و صفات الٰہیہ کا ظہور تو ہستی کے ہر ایک طبقہ اور ہر طبقہ کے ذرّہ ذرّہ میں ہے مگر علم و شعور مرتبہ انسان ہی میں ظاہر ہوا۔ یہ کہنا چاہیئے کہ ماسوائے انسان جو بھی ہے اس میں علم معرفت کا اظہار نہیں ہوتا۔

گر طبع سلیم قابلِ تفہیم است — انسانست آنکہ مصدر تعظیم ست
ایں کعبہ کہ مرکز سجود من و تست — تمثال حضور دل ابراہیم است

اگر تجھے طبع سلیم عطا ہوئی ہے اور تجھ میں فہم و تفہیم کی صلاحیت ہے تو سمجھ لے کہ یہ انسان ہے جو مصدر تعظیم ہے جس سے تعظیم کا ظہور ہوتا ہے، یہ کعبہ جو میرے اور تیرے سجدہ کا مرکز ہے، کیا ہے حضرت ابراہیم کے دل کا تصوّر ہے۔

تحقیق کہ فہم آں بحیرت دال است — بے پردہ باندازِ مقام حال است
شکلے کہ بخاک سایۂ میخوان — درآب نظر کنی تمثال است

یہ رباعی بہت بلند پایہ ہے بیدل کا نظریہ تحقیق یہ ہے کہ

ہرکس ایں جا از مقام و حال خود گوید خبر
از زبانم حرف او گر بشنوی باور مکن

ہر ایک محقق کی تحقیق اس کی اپنی حدِ نظر ہے، وہ جو کچھ ذات باری کی نسبت بیان کرتا ہے وہ اپنے ہی حال اور مقام کی خبر دے رہا ہے۔ اگر وہ یہ کہے کہ اللہ تعالےٰ کی ذات ایسی اور ایسی ہے تو باور نہ کر، وہ برتر از خیال و قیاس و وہم ہے۔ البتہ جتنا کسی کا فہم بلند اور بلند تر ہے اور جو کچھ وہ ذات باری کی نسبت کہتا ہے اپنے ہی قرب کا مقام بتا رہا ہے۔ عارف کامل وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ:۔

ما عرفناک حق معرفتک

اس رباعی میں ہر ایک شخص کی حد نظر کو ایک مثال سے واضح کیا کیا گیا ہے کہ خاک پر ہم کسی شئے کا سایہ اور پانی میں اسی شئے کے عکس کو تمثال

کہتے ہیں۔ تمثال نسبتاً زیادہ صاف اور واضح ہے، اسی طرح جتنا کسی شخص کا ذہن بلند ہوگا اتنی ہی حقیقت زیادہ صفائی سے منکشف ہوگی، مگر یہ سایہ اور تمثال ہی ہے ذات خاک اور پانی سے باہر ہے اور وہاں تک رسائی ممکن نہیں۔

آئینہ خلق طرفہ جوہر دارد صورت دگر است عرض دیگر دارد
می گویند او حق است و ما باطل محض از باطل حرف حق کہ باور دارد

لوگوں کی ذہنیت بھی عجیب ہے۔ آئینہ میں صرف صورت ہی نظر آتی ہے اور یہ موہوم ہے اسی پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ مشاہدہ ہو رہا ہے سب "مایا" ہے ہیچ ہے، فریب نظر ہے البتہ ایک اور ہستی حق ہے۔ اگر یہ خود باطل ہیں تو ان کا قول بھی باطل ہے، حقیقت یہ ہے کہ کائنات باطل نہیں (ربنا ماخلقت ھٰذا باطلا)

ہرکس اسرار عدل رحماں فہمید آنسوی تخیلات اعیاں فہمید
خود محتسب نیک و بد خویشتنم حق را قاضی جمال نتواں فہمید

سورہ الرحمٰن کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے کہ ارض و سمٰوات کو رحمٰن نے خلق فرمایا تو اس میں میزانِ عدل رکھ دی، جس سے تجاوز کوئی شے نہیں کرتی، یہ عدل جس سے نظم و نظامِ عالم قائم ہے ان تصورات کے دوسری طرف ہے جو اشیاء کا ہمارے ذہن میں ہے، یہ عدل انسان قائم نہیں رکھ سکتا البتہ "قسط" سے کام لے سکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ جو کچھ علم ہمیں اپنی نسبت ہے وہ کسی اور کو ہماری نسبت ویسا ہی صحیح نہیں ہو سکتا، اس لئے اپنے اعمال نیک و بد کا احتساب جیسا ہم خود کر سکتے ہیں کوئی اور نہیں کر سکتا۔ قاضی جمال اکبر شاہی عہد کی مشہور شخصیت ہے، وہ لوگوں کے اعمال کا محاسبہ اسی صورت میں عدل و انصاف سے کر سکتا ہے جب اس پر حق کما حقہ منکشف ہو اور یہ ممکن نہیں، "حق" کا قیاس اپنے ذہنی تصورات پر نہ کرنا چاہئے، حق ان سے

ماورئی ہے۔

آن دم کہ حقیقت قدم پیدا شد دانی چہ گونہ کیف دکم پیدا شد
مارا او دید ہستی آمد بوجود خود را دیدیم ما، عدم پیدا شد

حقیقت وحدت ہے، جب اس کا ظہور ہوا، یعنی اس کا انکشاف ہم پر ہوا تو "کیف وکم" کا سوال بھی پیدا ہوا، یعنی چہ وچند وچوں میں ہم اُلجھ گئے، اس نے ہماری طرف دیکھا تو ہستی کا ظہور ہوا، ہم نے اپنے آپ کو دیکھا تو عدم پیدا ہوا۔ ہستی اور عدم دو متضاد امور ہیں۔ اگر ہم با حق ہیں تو موجود ہیں اور جب اس سے علٰحدہ ہو کر اپنے آپ کو دیکھیں تو عدم ہیں، حقیقت قدیم ہے۔ حادث مخلوق ہے، بنگاہ حقیقت میں تو ہستی موجود ہے، ہماری نگاہ میں عدم ہے۔ (لم یکن شی مذکورا) اسی کے ہم معنی یہ رباعی ہے۔

امروز کہ برخویش نظر وا کردیم
ایجاد خیال دی و فردا کردیم
یعنی پیش از وجود بودیم قدیم
موجود شدیم و عدم انشا کردیم

غالب مرحوم نے بھی اچھا کہا ہے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا

عقل آمد طومار دلائل وا کرد جمعیت نسخہ یقیں اجزا کرد
آرائش لفظ زنگ معنی گردند گلچینی ہا بہار را رُسوا کرد

عقلاً کسی شے کا فہم نہیں ہو سکتا جب تک اس کا تجزیہ نہ کیا جائے، اور چہ وچند وچوں یعنی عقلی استدلال سے ثابت نہ کیا جائے۔ حقیقت تو بالبداہت ثابت شدہ ہے، جس طرح الفاظ کی رنگینی سے معنی زنگ آلودہ ہو جاتے ہیں، اور ذہن معنی کی طرف نہیں بلکہ لفظوں کے حُسن کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اسی طرح عقل فسوں ساز نے دلائل کی طرف متوجہ کر دیا۔

چوں یقین منحرف افتاد دلائل بالید
راستی رفت کہ ممنوں عصایم کردند

"یقین" تو عینی شہادت سے حاصل ہوتا ہے، دلائل کی ضرورت اسوقت ہوتی ہے جب حقیقت پوشیدہ ہو، قاضی جمال کے قیاسات سے توحق کا اظہار نہیں ہوسکتا، بہار تو گل فروش ہے، مشاہدہ کرو تو بہار کی رنگینی ان ہی میں نظر آئے گی، اگر گل چینی کروگے تو بہار کا مشاہدہ ختم ہوجائے گا۔ گل چینی لفظی آرائش استدلال عقلیہ کی طرح ہے جب تک جمعیت ہے یقین بھی ہے، جب اس کا شیرازہ بکھرا تو پھر دلائل سے جمعیت حاصل نہیں ہوسکتی۔

تقلید زہرچہ رنگ می گرداند جا برصد طبع ننگ می گرداند
غلطیدن یک سنگ ازیں کوہ بلند پہلوئی ہزار سنگ می گرداند

پہاڑی کی بلندی سے اگر ایک پتھر وزنی لڑھکتا ہوا نیچے کی طرف آئے تو راستہ میں جو بھی پتھر پڑے وہ بھی اس کے ساتھ لڑھکتا ہوا نیچے آرہے گا، یہی کیفیت تقلید کی ہے، اگر ہم کسی شخص کا اتباع کریں اور اس سے کوئی غلطی سرزد ہو تو ہم اس کا بھی اتباع کریں گے۔

کفر گیرد کاملے ملت شود علتے را ملتے علت شود

اس لئے "ترک تعلید گیر تحقیق ایں است"، تحقیق بلندی کی طرف لے جاتی ہے، اور تقلید گڑھے میں گراتی ہے۔

ہر سانحہ کہ شد بافسانہ دلیل بیکاری خلق شہرتش راست کفیل
موسٰی تا حال می شگافد دریا فرعون ہنوز می خورد غوطہ بہ نیل

کوئی واقعہ جس میں افسانوی پہلو نکلتا ہو۔ بیکار لوگ اس کی شہرت کے خود کفیل بن جاتے ہیں اور اس کا ڈھنڈورا ایسا پیٹا جاتا ہے کہ بار بار اسی کا تکرار ہوتا ہے، یہ سمجھو کہ موسٰی ابھی ابھی دریا کو عصا سے پھاڑ کر جارہے ہیں اور فرعون ابھی تک نیل میں غوطے کھا رہا ہے۔

عالمے را سرگزشت رفتگاں از کار برد
ہر کجا افسانہ باشد ہیچ کس بیدار نیست

فردوس باتفاق ارباب علوم آنسوی ثوابت و بروجست و نجوم
یعنی سعد و نحس تا در نظر است عیشت ناممکن است و راحت معلوم

تمام اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ بہشت آسمان کے باہر دوسری طرف ہے، لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ فلاں ستارہ سعد اور فلاں نحس ہے اور اس کا اثر ہم پر پڑ رہا ہے، ہم تو اسی کرۂ ارض پر انہی کو دیکھ رہے ہیں اس لئے عیش ناممکن اور راحت مفقود ہے، وہ تو بہشت میں ممکن ہے، ستاروں اور سیاروں اور بروج میں ان کا داخلہ اور خروج ہی کارفرما ہے اور اثر انداز ہو رہا ہے تو عیش و آرام ندارد۔

ہرچند جہاں بے قیاس علیم یکسر بے بہرہ مساس علیم
زیں سمع و بصر فریب دانش نخوری عالم دگر نیست ما لباس علیم

شیخ اکبر کا نظریہ یہ ہے کہ کائنات "صور علمیہ" ہیں، یعنی علم حق تعالےٰ کی صورتیں ہیں، بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ "ما معلوم حقیم نہ علم حق" یعنی عالم الغیب والشہادۃ تو ذات حق تعالےٰ ہے ہم "معلوم" ہیں نہ کہ خود علم، اگرچہ ہم بھی ایک جہان علم ہیں مگر علم حق تعالےٰ تک ہماری رسائی نہیں اس سے مس ہم نہیں کر سکتے، حواس ظاہری سمع و بصر ذریعہ دانش ضرور ہیں مگر جو علم ان سے ہمیں حاصل ہوتا ہے اس نے حقیقی علم کی بو بھی نہیں سونگھی، یہ کہو کہ ہم اس علم پر ایک حجاب ہیں؛ العلم حجاب الاکبر۔

بیدل در درس گاہ رمز مطلق از آگاہی نمیتواں برد سبق
اجزاء محاط را کہ کرده است محیط ما علم حقیم نے عالم حق

اللہ تعالےٰ کا علم ہر ایک شے پر محیط ہے۔ انسان کا علم ایسا نہیں کہ تمام کائنات کلاً و جزواً اس کے احاطہ علم میں آجائے۔ بس اتنا ہے کہ ہم علم حق

ہیں، حق کے عالم نہیں، اس رباعی میں بیدل شیخ اکبر کی تائید کرتا ہے۔

اے مُردہ انتظار محشر بُردن حیف است بہر فسانہ ات خون خوردن
درصورت آفاق نظر کن کاین جا ہر روز قیامت است و ہر شب مُردن

کب تک تو محشر کے انتظار میں مریگا، اس کے بارہ میں جو کچھ فسانے بیان کئے جاتے ہیں سُن سُن کر مارے غم کے گھُل رہا ہے آفاق میں نظر کر کہ اس جگہ روز قیامت ہے اور ہر ایک رات مرنا، نیند بھی موت کی بہن ہے، سویا اور مرا ہُوا دونوں برابر، صبح اُٹھے تو سمجھو کہ حشر قائم ہُوا۔

اے طالب جمعیت اوقات مباش حرفے ز قلندر بشنو و فارغ باش
گر آگہی از مقتضیات دوراں شب خواب کن و روز بہ فکر تلاش

اگر تو چاہتا ہے کہ تجھے ہر وقت جمعیت خاطر حاصل ہو تو ایک قلندر کی بات سُن اور بے فکر ہو، اگر تجھے دن اور رات کی گردش کے تقاضا کا علم ہے تو رات لمبی تان کر سورہ اور دن کے وقت تلاش معاش کر، اللہ تعالیٰ نے رات آرام کے لئے اور دن معاش کے واسطے بنایا ہے۔ راتوں کو جاگنا اور دن کو سونا کہاں کی عقل مندی ہے۔

تا زندگیست مست باید بودن آزاد ہر چہ ہست باید بودن
عالم یکسر مقید وہم خود است مارا بیدل پرست باید بودن

جب تک زندگی ہے مست حال رہنا چاہئے جو کچھ بھی ہے سب سے آزاد اور بے تعلق رہنا چاہئے۔ ایک دنیا اپنے توہمات میں اُلجھی ہوئی ہے، ہمیں تو بیدل پرست ہونا چاہئے۔ نہ دل ہو نہ کسی سے اُلجھئے۔

نہ قیصر جلوہ کن نہ فغفور نشیں نے مست بروں آئے نہ مخمور نشیں
گر حاصل عزتیست منظور ہوس از دیدۂ خلق اندکے دور نشیں

تیرا باہر نکلنا خلوت نشیں ہونا قیصر و فغفور کی طرح نہ ہونا چاہئے، نہ اپنی مستی کا اظہار لوگوں پر کرے اور نہ مخمور گوشہ نشیں ہو، اگر تیری خواہش

عزّت کے حصول کی ہے تو تھوڑا خلق سے دور بیٹھ رہ۔

در ملک تعصب از خیال باطل یکسر بدر افتادہ خوشہ ہائی نخل
زیں جاست کہ روز و شب در ایذای ہم اند رندان بزبان و زاہدان از تہ دل

لوگوں نے کچھ باطل عقائد سے ایسی وابستگی پیدا کر رکھی ہے کہ اس کے خلاف کچھ سننا نہیں چاہتے اور اسی کو ضرور منوانا چاہتے ہیں اسے "تعصب" کہتے ہیں، رند تو زبان سے اور زاہد تہ دل سے ایک دوسرے کو ایذا پہنچا رہے ہیں۔

ہر گاہ کشد مہر حقیقت علمے از شبنم امکاں نتواں یافت نمے
توحید بہارے و خزانے دارد یعنی ز تو خلد و از ما عدمے

آفتاب طلوع ہوتا ہے تو شبنم اس کی حرارت سے اڑ جاتی ہے اسی طرح جب آفتاب حقیقت کا ظہور ہوگا تو ممکنات کی شبنم میں نم باقی نہ رہے گی، توحید کی بھی بہار اور خزاں ہے یعنی بہار خلد دائمی بہار تو تیری ہے اور میری جانب سے خزاں عدم۔

اے رہرو اگر ز خویش غافل باشی سرگشتہ تر از راہ بمنزل باشی
چوں گوہر اگر بضبط خود پردازی در دریا ہم مقیم منزل باشی

اے سالک اگر تو اپنی خودی سے غافل خود شناس نہیں تو منزل پر پہنچ کر بھی تو اسی طرح سرگشتہ رہے گا جیسے "راہ" دور دراز ہے اور اگر گوہر کی طرح تجھے جمعیت حاصل ہے تو دریا میں رہتے ہوئے بھی تو ساحل پر مقیم ہے۔

حال است بمستقبل اگر وا رسی امروز شماری چو بفردا برسی
عقبیٰ دور از وجود مردم دنیاست دنیا باشد مے کہ آنجا برسی

جب تو "کل" تک پہنچے تو وہ حال ہی ہوگا۔ مستقبل تو اسی وقت تک ہے جب تک حال نہ ہو اور تیری وہاں تک رسائی نہ ہو، جب رسائی ہوگی، تو مستقبل حال ہوگا، اہلِ دنیا سے اسی طرح عقبیٰ دور ہے لیکن جب تو عقبیٰ میں پہنچے گا تو وہ دنیا ہی ہوگی۔

اے جوہر ہوش محرم راز برآ — رندانہ ز زہد مکر پرداز برآ
عالم ہمہ یک مسخرہ ریش و فش است — از سلسلہ خجلت ایں ساز برآ

جو شخص ہوشمند محرم راز ہے اسے رندانہ اس ریا کاری سے باہر نکلنا چاہئے جو رند نمائش کر رہا ہے، ایک دنیا ریش و فش کی مسخرہ ہے، تو اس ساز و سامان خجلت کے سلسلہ سے باہر آ،

ہم صحبت شیخ شو مقامات آموز — با زاہد انس گیر طامات آموز
اے حرص بزرگیت سرو برگ خیال — چیزے ز فسونہائے کرامات آموز

لوگ جو پیران خانقاہ کے مرید ہوتے ہیں یا ورد و وظائف میں مشغول رہتے ہیں اور ریاضت میں جان کھپاتے ہیں تو تحت الشعور ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگ انہیں بزرگ سمجھیں، ان کے لئے مقامات و طامات کافی نہیں، کچھ کرامات کا جادو بھی سیکھنا چاہئے۔

کبر و حسدے کہ مردم اندوختہ اند — باید فہمید از کہ آموختہ اند
شیطان عمریست مردہ و مقتدیاں — باہم شمع مزارش افروختہ اند

یہ کبر و حسد جو لوگوں نے دلوں میں جمع کر رکھا ہے جاننا چاہئے کہ کہاں سے سیکھا ہے۔ شیطان تو عرصہ ہوا مر گیا۔ اس کے مریدوں نے اس کی قبر پر مل جل کر دیا جلا رکھا ہے۔

بیدل در معرض کمالات بیاں — بر معنی ہزل منویسی نقصاں
در انجمن قدرت حق ہم زیں رنگ — بے مصلحتے نیست ظہور شیطاں

جو شخص کلام میں اپنے کمالات کا اظہار کر رہا ہو اگر کبھی ہزل گو بھی ہو تو یہ کوئی عیب کی بات نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کائنات میں اسی طرح شیطان کا ظہور بھی بے مصلحت نہیں ہے، یعنی ہزلیات شیطنت تو ہے مگر یہ بھی بے مصلحت نہیں۔ بیدل کے کلام میں ہزلیات کا حصہ کمتر ہے، چند اشعار ہیں جن میں وہ اہلِ مذاہب کے توہمات کا مضحکہ اڑاتا ہے، مثلاً شاہ عالمگیر کے

عہد میں داڑھی کو خاص اہمیت حاصل تھی اس لئے بھی کہ عہدِ اکبری میں لوگ اس سے فارغ البال تھے۔ بیدل کہتا ہے کہ "جز پشم نبود کہ کاہید و فزود" آخر یہ بال ہی تھے، بڑھے تو کیا اور گھٹے تو کیا، اسی طرح زیارت قبور اور پیر پرستی کی مذمت کرتا ہے، بات یہ ہے یہ توہمات جن کو جزوِ دین سمجھا گیا ہے اسی لائق ہیں کہ ہزلیات میں ان کا مضحکہ اُڑایا جائے، وہ خود ایک غزل کے مقطع میں کہتا ہے کہ آج دین تو یہی ریش و فش ہی ہے " ملت و کیش چہ معنی دارد" مذاہب کے بارہ میں لکھتا ہے کہ سب راہیں، منزل سے دور، "مذہب" مشتق ہے "ذہب" سے، معنی چلنا، مذہب کے معنی "روش"۔ یہ راہیں ہی ہیں، جو لوگوں نے اختراع کر رکھی ہیں لیکن وہ کہتا ہے کہ اصل راہ اتنی ہی ہے جتنا مژگاں کا باہمی فاصلہ، ذرا مژگاں اُٹھا کر دیکھو تو تمام کائنات تا حدِ نظر اس کے آغوش میں آ رہے گی، لیکن اہلِ غرض نے ان راہوں کو اتنا دور دراز اور دشوار گزار بنا رکھا ہے کہ منزل پر پہنچنا ناممکن ہو گیا۔

بے قطع نفس منزل آسائش کو ‏ ‏ تا رہ باقیست رفتنی در پیش است

تا مرد براخلاق نہد کردارش ‏ ‏ باید زدم تیغ کشیدن عارش

کارے کہ بہ تبسمش سرانجام دہد ‏ ‏ بر چین جبیں نیفگنی زنہارش

اگر انسان اخلاق حسنہ میں اپنے اعمال ڈھالے تو مناسب نہیں کہ تلوار کا دم بھرے یا اس سے کام لے، جو کام خندہ پیشانی سے خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام ہو سکتا ہے وہ تیور چڑھانے سے کیوں ہو، تلوار اور تیور کی صورت ملتی جلتی ہے،

گر دست رسیست زر مدارید دریغ ‏ ‏ از بے ثمراں ثمر مدارید دریغ

تا تہمت خست نکشد ہمت ہما ‏ ‏ اخلاق زیکدگر مدارید دریغ

اگر خدا نے توفیق عطا فرمائی ہے اور تمہارے ہاتھ سخاوت سے کشادہ ہیں تو جو بے زر ہیں ان کو زر دو، جو بے ثمر ہیں ان کو ثمر دو، ثمر کسی بارور درخت

ہی میں ہوگا۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ اہل سخا سخاوت سے کام لیں اور ایثار کریں اس لئے کہ تمھاری ہمت بخل کی تہمت سے متہم نہ ہو ایک دوسرے سے اخلاق کے ساتھ پیش آئے تو بہت مناسب ہے۔

بیدل دارد ز طبع اہل ہمت　　آثار سخا بجلوه چندیں صورت
بر بیخبراں پند و محتاجاں سیم　　بر خورداں لطف و با بزرگاں خدمت

اہلِ جود و سخا کی طبیعت سے داد و دہش کا ظہور مختلف صورتوں میں ہوتا ہے جو بے خبر ہیں ان کو پند و نصیحت سے خبردار اور متنبہ کیا جاتا ہے، چھوٹوں کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہیں اور بزرگوں کی خدمت اور احترام کرتے ہیں۔

آواز کریم را "صلا" می خوانند　　سائل چو دم زند دعا می خوانند
یک نغمۂ شوق قسمت چہ فقر و چہ غنا　　کز پردہ ہر ساز جدا می خوانند

ایک تو اہل کرم غنی ہیں دوسرے فقیر بینوا سائل، اہلِ کرم جب آوازِ سخاوت سے بلاتے ہیں تو اصطلاح میں اس کو "صلا" کہتے ہیں، فقیر کو جو کچھ ملتا ہے تو جو الفاظ اس کے مُنہ سے نکلتے ہیں اس کو دُعا کہتے ہیں، اصل میں صلا اور دعا کا مفہوم ایک ہی ہے، دونوں فقر ہو یا غنا ایک نغمۂ شوق ہی ہے ....

.... مگر ہر ایک ساز کے پردے سے پنچم اور مدھم سُروں کی بلندی و پستی ہی کا فرق ہے، سر یا آواز بہر حال ایک ہی ہے۔

اندیشۂ بخل از یقیں مہجور یست　　با خلق حسد ز فیض معنی دوریست
بر خویش ستم روا مدار اے غافل　　چشمے واکن کہ تنگ چشمی کوریست

بخل ایک ایسا مذموم فعل ہے جس کو یقین یعنی ایمان اور عمل صالح سے دور کی نسبت بھی نہیں۔ اور "حسد" جو بخل ہی کی ایک شاخ خاردار ہے یا میوہ تلخ ہے فیض معنی سے لگا نہیں کھاتا، حقیقت یہ ہے کہ بخیل اور حاسد اپنے ہی نفس پر ظلم و ستم روا رکھتے ہیں، ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیں تو نظر آئے گا کہ تنگ

چشمی اندھاپن ہی تو ہے۔

این سنگ دلاں خاک سیاب بچشم یک شکک ندیدہ شرم احباب بچشم
محواند بذوق خست آرائیہا چوں آئینہ نان دربغل و آب بچشم

بخیل نہایت سیاہ باطن سنگ دل ہوتا ہے، دنیوی اسباب یہی خاک دھول ہے جواس کی آنکھوں میں پڑتی ہے، دوست تنگی کی وجہ سے پریشان حال ہوں اور مارے شرم کے دست سوال دراز نہ کریں، یہ ان کے حالات دیکھتے ہوئے بھی نہیں پسیجتے، کتنی بے آبروان کی آنکھیں ہیں کہ آبدیدہ نہیں ہوتیں، خست کی صورت جس میں یہ محو ہیں آئینہ کی طرح ہے نان تو بغل میں دبائے ہوئے ہیں اور آنکھوں میں آب ہے۔ یہ شعر نہایت لطیف ہے، آب و نان دونوں آئینہ میں ہیں، نان بغل میں اور آب آنکھوں میں، مگر یہ نان ایسا ہے کہ اس سے کسی کا پیٹ نہیں بھرتا بلکہ خود بخیل اپنے آپ سے بخل کرتا ہے، آب وہ ہے کہ اس سے کسی کی پیاس نہیں بجھتی، خست آرائی میں بخیل محو ہے۔

ساز وحشت حقیقتے ساکن نیست ظاہر ہر چند پر زند باطن نیست
گو ہر دو جہاں بگفت و گو خوں گردد حرفیکہ بخاموشی رسد ممکن نیست

دنیوی ساز و سامان و اسباب محسوس ہو رہا ہے اور "ظاہر" ہے۔ اس کے لئے دوڑ دھوپ وحشت ہے، اضطراب ہے، جو "سکون" کی ضد ہے سکون "باطن" میں ہے، انسان فطرتاً سکون کا طالب ہے۔ لیکن اس ظاہری اسباب کی فراہمی سے جمعیت دل، اطمینان قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر دو جہانوں کی خاک چھانو اور اس موضوع پر گفتگو کرتے رہو وہ بات جو "خاموشی" سے حاصل ہو سکتی ممکن نہیں۔ اس رباعی کا مطلب یہ ہے کہ ظاہر عالم صورت ہے اس میں جو اصل معنی یا حقیقت ہے وہ ان صورتوں کی چھان بین سے نہیں ملے گی۔ اہلِ فکر انھیں نظر انداز کرتے ہیں اور اس حقیقت کو خاموش فکر سے پالیتے ہیں، یہ بات قیل و قال، مدرسہ اور بحث و مباحثہ و مناظرہ سے حاصل نہیں ہوتی جو محض درد سر

اور وحشت ہے۔

"تا چرخ بساط ثابت و سیار است — خاموشی مرکز و سخن پرکار است
بے تخم بود دویدن ریشہ محال — یعنی بے نقطہ سیر خط دشوار است"

جب تک آسمان پر تاروں اور ستاروں کی بساط بچھی ہوئی ہے، تارے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتے جیسا قطب تارہ ہے، ستارے گردش کرتے ہیں، جیسے مریخ و زحل و مشتری وغیرہ، مگر یہ سب ایک مرکز کے گرد گردش کرتے ہیں اور مرکز قائم اور ثابت ہے ہمارے نظام شمسی میں سورج مرکز ہے۔ اسی طرح "خاموشی" مرکز ہے اور "سخن" پرکار کی طرح اس کے گرد گردش کر رہا ہے، یا یہ کہو کہ بیج مرکز ہے اور "ریشہ" جو شاخوں وغیرہ میں نشو و نما پاتا ہے اسی "تخم" سے وابستہ ہے۔ اس لئے مرکز نقطہ ہے اور اس کے گرد خط کی گردش ہے۔ جب تک نقطہ نہ ہوگا خط بھی نہ ہوگا۔ یہ مرکز یا نقطہ وحدت ہے اور خط کثرت نقاط سے ہی بنتا ہے، جب تک نقطہ وحدت کی طرف رجوع نہ ہو کثرت کی حقیقت منکشف نہ ہو گی۔ ریاضی میں "نقطہ" وہ ہے جس کا نہ طول ہو نہ عرض، یہ اقدار ان خطوط میں ہیں جن سے مختلف شکلیں مثلث و مربع وغیرہ بنتی ہیں۔ اس لئے اس عالم صورت کی قدر و قیمت اگر کچھ ہے تو اس حقیقت کی دی ہوئی ہے جو "وحدت" ہے۔

تا از ما و منت پشیمانی نیست — جمعیت آبرویت ارزانی نیست
ضبط نفست قدرت تسخیر ہواست — تسخیر ہوا غیر سلیمانی نیست

یہ من و تو کے امتیازات نے جو بحر و بر میں شورِ حشر برپا کر رکھا ہے اگر تیرا دماغ اس سے پریشان ہے اور تجربہ کے بعد تو پشیمان نہیں ہوتا تو یہ سمجھ کہ وہ آبرو جو جمعیت دل یا اطمینانِ قلب کی ہے سستی نہیں پڑتی۔ "ضبطِ نفس" سے مراد ہوا ہوس کو مسخر کرنا ہے، یہ قدرت اور طاقت ضبطِ نفس یعنی خاموشی میں ہے مشہور روایت ہے کہ سلیمانؑ کے حکم سے ہوا مسخر ہو گئی تھی۔ سلیمان کی قوت

نے ہوا کو مسخّر کیا ہوا تھا اگر تو بھی ضبطِ نفس سے کام لے تو تو بھی سلیمان ہے۔ من و تو خود بینی و خود رائی ہے۔

خود بینی و خود رائی در مذہب رنداں نیست
کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی (حافظ)

آں نشاء کل کہ سر بسر آگاہیست — در ہر جزوش ظہور غفلت گاہیست
ہر جا بتامّلش گرہ می کردیم — در رشتۂ افہام ہماں کوتاہیست

رشتہ یا دھاگا کو اگر گرہ پہ گرہ دیتے جائیں تو اس کا طول کم اور کمتر ہوتا جائے گا۔ بیدل نے اس تخیل سے حکیمانہ بات یہ پیدا کی ہے کہ کل تو سر بسر آگاہی اور شعور ہی ہے کہ ہموار ہے لیکن اس کا ہر ایک جُز و غفلت کا مقام ہے جب ہم اس میں تامل یا فکر کرتے ہیں تو اس میں گرہیں ڈالتے چلتے ہیں یہی فہم کی کوتاہی بن جاتی ہے، بوقتِ تامل جب ہم سر بزانو ہوتے ہیں تو گرہ کی صورت پیدا کرتے ہیں، یعنی جو حقیقت، بالبداہت ثابت شدہ ہے اس میں استدلال عقلیہ سے اُلجھن پیدا کرتے ہیں، یہی وجہ ہے حکماء کا کسی نظریہ پر کبھی اتفاق نہیں لیکن انبیاء و رسل ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں، وہ ایک ہموار راستہ پر چلتے ہیں اور راہِ عقل ناہموار راستہ پر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔

ہر جا ستمے بر دل شاد رسد — از دست شعور زحمت ایجاد رسد
بر بند دمے چشم زتمیز و بخواب — اُمید کہ غفلتے بفریاد رسد

کسی پر ظلم و ستم ہو رہا ہو اور فریاد کر رہا ہو تو فریاد رس بھی کوئی ہونا چاہیئے۔ بیدل نے اس سے ایک بات پیدا کی ہے کہ یہ شعور ہی ہے جو زحمت ایجاد کر رہا ہے اس لئے دلِ ناشاد پر جو ستم ہو رہا ہے وہ اسی کے ہاتھوں ہو رہا ہے، آنکھیں موند لے اور سو جا، اُمید ہے کہ غفلت سے کچھ فریاد رسی ہو جائے گی۔

در ہر راہے کہ مقتدا می ایستد — پیرو بے اختیار و امی ایستد
سیلاب ہر کجا سرش خورد بسنگ — ہر موج کہ باشد بقفامی ایستد

جس راستہ پر رہنما چلتے چلتے رُک جائے تو پیرو خود بخود رُک جائیں گے، سیلاب بہتا ہوا اگر پتھروں سے ٹکرائے تو اس کی لہریں پیچھے کی طرف ہٹتی ہیں۔ بیدل کی رباعیات بلکہ تمام کلام میں اس کے مشاہدات ہی کا مذکور ہے، وہ ان سے اخلاقی نتائج پیدا کرتا ہے اور موزوں لفظوں میں بیان کرتا ہے۔

ہرکس مضمون عافیت می داند　　از سطر نفس درس فنا می خواند
راحت می خواہی از خموشی مگذر　　کایں وضع بوضع نیستی می ماند

عافیت، راحت، سکون واطمینان قلب کے مضمون سے جو بھی واقف ہے نفس کی آمدورفت سے درس فنا پڑھ رہا ہے، سانس ہر ایک دم میں فنا ہوتا ہے مگر جب تک زندگی ہے یہ سلسلہ آمدورفت جاری، ایک دم چین سے بیٹھنا قبر میں ہی نصیب ہوگا، گفت وگو یا حرف وصورت اسی سانس کے رشتہ سے وابستہ ہیں، اگر تو راحت چاہتا ہے تو وہ خاموشی میں ہے۔ یعنی اس سانس سے اضطراب حرف وصوت دور کردے۔ چونکہ راحت کامل نیستی میں ہے خاموشی کی وضع اسی نیستی سے ملتی جلتی ہے۔

اے محرم موج وطپش آموختنش　　غیر از کف پوچ چیست اندوختنش
غافل مشو از تامل وضع صدف　　چیزے دارد لب از سخن دوختنش

بحر تحقیق میں اہل فکر ہی غوطہ لگاتے ہیں، اور سطح بحر پر موج اور کف ہرزہ نوا ہیں۔ اگر انہیں جمع کیا جائے تو کیا حاصل ہوگا۔ صدف کو دیکھو کہ اس کے دونوں لب ملے ہوئے ہیں اسی خاموشی میں ایک قیمتی شے ہے، معنی دارد کہ در گفتن نمی آید، یہ گوہر ہے۔ یعنی اہل فکر تامل سے گوہر مقصود پالیتے ہیں اور فکر خاموشی سے وابستہ ہے، جو لوگ منہ کی بکواس اور قلم کی گھس گھس میں مشغول ہیں وہ سطح پر موج وکف کی طرح مضطرب اور پریشان حال ہیں لیکن کامل سکون خاموشی سے بھی حاصل نہیں ہوتا۔

تا شور نفس پرور ما و من است　　ہر سو نظر افگنی جنوں انجمن است

اوہام گرفتست جہات امکاں　　جمعیت کو گوشہ دل ہم سخن است

شورنفس سے ما و من کی پردہ دری ہو رہی ہے۔ جس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھو جنون نے انجمن آرائی کی ہوئی ہے شش جہت امکانی توہمات کی گرفت میں ہیں۔ اطمینانِ قلب کسے نصیب، دل کے گوشے باہم ہم سخن ہیں، کوئی خیال دل میں بے حرف پیدا نہیں ہوتا۔

تافضل و ہنر آئینہ پردازنشد　　اقبال درش بروے کس باز نشد
فولاد بر آہن شرف از جوہر یافت　　بے علم بجنس خویش ممتاز نشد

جب تک کسی شخص کے فضل و ہنر کا اظہار لوگوں پر نہیں ہوتا تب تک وہ مقبول عام و خاص نہیں ہوتا، لوہا اور فولاد ایک ہی شے ہے۔ جوہر دونوں میں ہے لیکن لوہے میں پوشیدہ ہے اور فولاد میں نمایاں اس لئے فولاد کو لوہے پر فضیلت دی گئی ہے، ہر ایک شے اپنی جنس میں ممتاز درجہ حاصل نہیں کرسکتی جب تک اس کا جوہر علم ظاہر نہ ہو یعنی وہ خواص و حقائق، جو اس میں پوشیدہ ہیں جب تک ظاہر نہ ہونگے گراں قدر نہ ہوگی۔

بیدل زبساط دہر وحشت انگیز　　گرپائے ہست سر برون آر و گریز
آوارہ یاس بیش ازیں نتواں زیست　　جائے بنشینی کہ نگوید برخیز

اس دُنیا کے در و دیوار سے وحشت ٹپکتی ہے اگر تیرے پاؤں ہیں تو سر پر رکھ کر بھاگ، جو زندگی سے مایوس ہوچکا ہے اس کا جینا اور مرنا برابر ہے ایسی جگہ جاکر بیٹھ جا کہ کوئی نہ کہے کہ اُٹھ، ایسی کونسی جگہ ہے؟ "آثار قدیمہ" والے مُردوں کی ہڈیاں بھی اُکھاڑ رہے ہیں، "اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے، مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے" یہ بھی مقامِ عبرت ہے کہ قبریں انہی کی اُکھڑ رہی ہیں جو اغنیاء تھے، مرنے کے بعد بھی اپنی آرام گاہ کی آرائش و زیبائش کا خیال نہ چھوٹا۔

غالب کہتا ہے کہ ؎

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں

غالب نے رہ گذر ایسی جگہ تصوّر کی ہے جہاں سے کوئی اُٹھا نہیں سکتا حالانکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں چلنے پھرنے والے ٹھکراتے ہیں، اور کچلتے ہیں۔

بیدل بر خلق کسر شاں نمائی | تاثیر تواں شدن کماں نمائی
خاصیت ایں معرکہ عاجز کشی است | ایں جا نہ نہار ناتواں نمائی

اس گیرودار دنیا میں جو معرکہ آرائی ہو رہی ہے، ظاہر ہے کہ زبردست کمزور کو دباتا ہے، اور کمزور کچلا جاتا ہے اس لئے اس عاجز کُش خونخوار دنیا میں جس شخص نے اپنی کمزوری کا اظہار کیا اسے کچل کر رکھ دیں گے۔ اس لئے کبھی یا تو سرے سے کمزور نہ ہونا چاہیئے۔ توانائی پیدا کرنی چاہیئے مقابلہ کرنا چاہیئے، یا اپنی کمزوری دوسروں پر ظاہر نہ ہونے دو، ورنہ مارے جاؤگے۔

دیوانِ بیدل

فارسی شاعری میں شعر کی اصناف تو بہت ہیں، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، مگر غزل کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ کسی کا حصّہ نہیں، اور یہی زبان زد خلائق ہے۔ غزل کا موضوع بھی مختلف ہے۔ عشقیہ اور صوفیہ کو خاص امتیاز حاصل ہے، تصوّف دراصل فلسفہ نظری اور عملی ہے، تصوّف میں عشق بھی کارفرما ہے جسے عشقِ حقیقی کہتے ہیں، بیدل نے تمام اصناف شعر میں بہت کچھ لکھا ہے، سردست ہمیں غزلیات کا جائزہ لینا ہے، مناسب تو یہ تھا کہ ہم ہر ایک غزل سے دو دو تین تین شعر منتخب کر کے ان کا مفہوم اُردو میں بیان کرتے۔ لیکن بقول غالب اس بحرِ بکراں میں شناوری کون کرسکتا ہے، حروف "ت" اور "د" اور "میم" وغیرہ کی ردیف میں بیدل نے جتنی غزلیں لکھی ہیں فرداً فرداً ان کی تعداد اکثر شعرا کے دیوان اور کلیات کے اشعار سے بڑھ کر ہے، سردست ہمارے مدِّ نظر بیدل کا شاعرانہ تخیّل بھی نہیں، صرف حکیمانہ تفکّر ہے۔ لیکن بیدل نے دونوں کو اس ہنرمندی سے جمع کیا ہے کہ حکمت کی خوبی اس کے حسنِ کلام میں اہلِ نظر مشاہدہ کریں تو ان کو جُدا کرنا مشکل ہے۔ پہلے ہم بیدل کی غزلیات سے وہ شعر انتخاب کرتے ہیں۔ جن میں اس نے خودی اور بیخودی، امروز و فردا، دنیا و عقبیٰ، آزار اور آسائش

بالخصوص ہستی کی گتھی سلجھانے کی کوشش کی ہے۔

آج تک جو کچھ حکماء نے لکھا ہے وہ جستجوئے حق ہی ہے۔ اس لیئے سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہمارے پاس کوئی معیارِ حق بھی ہے یا دریافت ہو سکتا ہے۔ قرآن عظیم نے شروع میں ہی معیار پیش کیا ہے کہ "ذالک الکتاب لاریب فیہ" وہ کتاب کائنات یا صحیفہ فطرت ہے جس میں کوئی اُلجھن نہیں اور اُلجھن ہی کا نتیجہ شک وشبہ ہوتا ہے اور اس ذہنی حالت میں قوتِ فیصلہ تذبذب میں آرہتی ہے۔ بیدل نے نکات میں بھی یہی کچھ لکھا ہے کہ جو کچھ اشیاء محسوسہ معینہ مشخصہ کے سوا نظر آئے سب سودا ہے۔ اس لئے جو کچھ بصر وبصیرت سے مشاہدہ ہو رہا ہے اور سب ایک ہی طرح مشاہدہ کرتے ہیں حق ہے۔ انسان پر کیا موقوف ہے حیوانات بھی لیل ونہار میں اختلاف جو کچھ ہے فطرتاً محسوس کرتے ہیں، دن کے وقت فکرِ معاش ہے تو رات آرام کے لئے۔ ہم چہار عنصر اور نکات کے تحت بیدل کے نظریہ تحقیق پر بحث کر چکے ہیں، مثنوی عرفان وغیرہ میں وہ اس امر کی تصریح بھی کرتا ہے کہ کائنات کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ مختلف صورت ہو گی کیونکہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص کل پر حاوی ہو اس لئے اگر کسی نے ہر ایک شے پر تغیرات وارد ہوتے اور آخر فنا ہوتے دیکھا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ دنیا ہیچ ہے اور اس لئے "اے ہیچ در فکرِ ہیچ میپیچ" تو جہاں تک اس کا مشاہدہ ہے یہ نتیجہ بھی صحیح ہے، اس طرح اختلاف رائے کی وجہ یہ ہے کہ ہم ایک ہی شے کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یعنی کسی شے کے جزو کو دیکھتے ہیں، کل نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ کل کے احکام و آثار سے واقف ہیں، ہمیں ایک ذرّہ کے بھی حقائق کا کلۃً علم نہیں۔

انسان طبعاً "رازجو" واقع ہوا ہے۔ "رازجوئی" کی عادت اوائل عمر میں نمایاں ہوتی ہے، بچے عموماً بڑے بوڑھوں سے چند وچہ وچوں دریافت

کرتے رہتے ہیں، بلکہ بعض اوقات بڑے بوڑھوں سے جواب بن نہیں آتا، وجہ رازجوئی یہ ہے کہ نوعمری میں جو کچھ محسوس ہوتا ہے دُنیا اور عجیب ہی معلوم ہوتا ہے، لیکن رفتہ رفتہ جب اس ماحول کو جس میں ہماری پرورش ہوتی ہے عادتاً دیکھتے رہتے ہیں تو اس میں کوئی بات جاذبِ دل نہیں رہتی اور رازجوئی کا جذبہ بھی سرد پڑتا جاتا ہے۔ لیکن بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں جو رازجوئی کی طرف ہمیشہ مائل رہتی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آخر میں "محقق" کہلاتے ہیں انہی میں سے ایک بیدل بھی تھا، اس کے کلام میں ابتدائی تحریک تحقیق کا بھی مذکور ہے، چنانچہ دو مسلسل غزلوں کا یہی موضوع ہے، ایک غزل کا مطلع ہے۔

صبح از چہ خرابات جنوں کرد بہارش
کآفاق گرفتہ است بخمیازہ خمارش

اس شعر میں دو مشاہدات کو یکجا بیان کیا گیا ہے، جب نیند کے ماتے صبح اُٹھتے ہیں تو انگڑائی لیتے ہیں اور بادہ شبانہ کا نشہ جب اُترتا ہے تو خمار کی وجہ سے بادہ خوار انگڑائی لیتا ہے، شاعرانہ تخیل یہ ہے کہ صبح رات بھر تو میخانہ جنوں میں متوالی رہی، یعنی یہ سیہ مست تھی، اب انگڑائی میں اس نے تمام آفاق کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ صبح کس خرابات جنوں میں رنگ رلیاں مچاتی رہی کہ اس کی انگڑائی نے آفاق کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ بیدل کے اکثر اشعار کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان کا مفہوم نثر میں ادا نہیں ہو سکتا۔ ایک ذہنی کیفیت ہے اور شعر کی خوبی بھی یہ ہے کہ نثر میں ادا نہ ہو سکے۔

دوسری غزل کے چند اشعار یہ ہیں:۔

چنیں کشتۂ حیرت کیستم من
کہ چوں آتش از سوختن زیستم من

میں کس کا کشتۂ حیرت ہوں کہ آگ کی طرح جل رہا ہوں مگر میری

زندگی بھی اس جلنے میں ہی ہے، آگ اگر نہ جلے مُردہ ہے، اور جب تک جلتی رہے زندہ ہے۔ میں کشتہ حیرت بھی ہوں، حیرت نتیجہ ہے لاعلمی کا، یعنی ہم جو کچھ مشاہدہ کرتے ہیں چونکہ سمجھ نہیں سکتے کہ کیا مشاہدہ کرتے ہیں اس لئے حیرت میں آ رہتے ہیں، باوجود اس امر کے کہ میں کشتۂ حیرت ہوں مگر زندہ بھی ہوں اور میری زندگی آگ کی طرح ہے کہ جب تک مسلسل جلتا ہوں زندہ ہوں اگر ایک دم ٹھنڈا پڑ جاؤں تو خاکستر ہو کر رہ جاؤں گا، اگر یہ لفظ "حسرت" ہو تو معنی ایک ہی ہے۔

نہ شادم نہ محزوں نہ گردوں نہ خاکم
نہ لفظم نہ مضمون نہ معنیستم من

ہر ایک شے ایک خاص حالت میں نظر آتی ہے۔ مگر میری عجب حالت ہے کہ کسی ایک حالت کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔ "نہ شادم نہ محزوں" نہ تو میں ایک ہی حالت شادی میں اور نہ ایک ہی حالت غم کی تصویر ہوں، بلاشبہ یہ تمام حالات مجھ پر وارد تو ہوتے ہیں مگر عارضی ہیں، میری فطرت کے نزدیک بیگانہ سے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ میں نہ آسمان ہوں اور نہ زمین اور نہ عبارت کا مضمون اور لفظ و معنی۔

اگر فانیم چیست ایں شورِ ہستی
دگر باقیم از چہ فانیستم من

اگر میں فانی ہوں تو ہنگامۂ ہستی کیا ہے، اور اگر میں باقی ہوں تو مر کر فانی کیوں ہوتا ہوں۔

غالب مرحوم نے بیدل کی دونوں غزلیات کی ترجمانی بھی خوب کی ہے، ایک غزل کا مطلع ہے۔

دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے   آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اسی غزل میں "ابر کیا ہے اور ہوا کیا ہے" وہی چہ و چوں و چرا ہے جو تحقیق

کی بنیاد ہے۔ شعر ہے کہ

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

غالب نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ موجود صرف "ذات واحد" ہے، اس لئے ہستی میں یہ شور اور ہنگامہ کس لئے اور کس کا برپا کیا ہوا ہے؟ ایک سوال اٹھایا ہے مگر جواب نہیں دیا، جواب مخاطب پر چھوڑ دیا ہے، ظاہر ہے کہ ہنگامہ میں ایک سے زیادہ شخصیتوں کی شرکت واجب ہے، ایک سے زیادہ موجود ہی نہیں۔ بیدل نے یہ واضح کیا ہے کہ اگر میں فانی ہوں اور فانی سے شورِ ہستی کا ظہور ناممکن ہے تو پھر یہ ہنگامہ آرائی کرنے والا کون ہے جو موجود ہونا چاہئے، اگر میں موجود ہوں تو میرے ساتھ یہ فنا کا دُم چھلا کیسے اور کیوں لگا ہوا ہے، اس کا جواب اسی غزل میں دیتا ہے کہ

بنازاے تخیل، ببال اے توہم
کہ ہستی گماں دارم و نیستم من،

یہ تخیل اور توہم کا کرشمہ ہے کہ گمان ہستی اپنے لئے کرتا ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ "نیست" ہوں، غالب نے چہ و چند و چوں کا تخیل تو بیدل ہی سے لیا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ شیخ فضل اللہ المعروف قاضی شیخ جمال الدین جمالی دہلوی کے ایک مطلع کی ترجمانی معلوم ہوتی ہے۔

اے از جمالت ایں ہمہ غوغا برائے چیست
چوں جملہ حسن تست تماشا برائے چیست

شیخ جمالی کمبوہ ذات تھی۔ دہلی میں عہدہ قضا پر عہد اکبری میں مامور تھے ۹۴۲ھ میں وفات پائی، حاجی بھی تھے اور اپنے زمانہ کے اکثر علماء و حکماء سے ملنے والے بھی تھے، چنانچہ ملا جلال دوانی صاحب اخلاق جلالی سے مراسم دوستانہ بھی تھے، آپ کا ایک شعر بہت مشہور نعت میں ہے۔

موسیٰ ز ہوش رفت بیک پر تو صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمے

بیدل نے بھی ایک رباعی میں قاضی صاحب کے فتاوے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "حق را قاضی جمال نتواں فہمید" قاضی جمال نے مطلع میں اس سوال کا جواب کہ "تماشا برائے چیست"، اور "غوغا برائے چیست" بظاہر لفظوں میں نہیں دیا مگر لاجواب مطلع میں اشارہ یہ ہے کہ "برائے من و تو" ہے، بیدل کی ایک غزل کا مطلع ہے۔

ہر کہ اینجا میرسد بے اعتدالی می کند
شمع ہم در بزم مستاں شیشہ خالی می کند

ایک شعر ہے۔

درس دانش ختم کن کائینہ داسیم و زر
زنگی مکروہ را ملا جمالی می کند

ملا جمال کمبوہ کا رنگ روسیاہ تھا اور شاہی ملازم شاہی خزانہ سے تنخواہ لیتے چاندی سے ہاتھ اور زر سے دل سیاہ ہوتا ہے۔

تلبئے شبہ پرست حق و باطل بودن
مرد ایں محکمہ آنست کہ قاضی نشود

نواب شکر اللہ خاں کا ذکر "چہار عنصر" کے تحت ہم کر چکے ہیں۔ ان ایام میں سخن فہمی اور سخن گوئی بھی قابلیت کا ایک معیار تھا۔ ہر ایک صاحب سیف صاحب قلم بھی تھا۔ عہد اکبری سے آخری تاجدار مغلیہ کے دور تک اکثر امراء وزرا بھی ادیب اور صاحب دیوان تھے،" مائثر رحیمی" اور دیگر تذکروں میں ان لوگوں کا مذکور ہے۔ شکر اللہ خان سپہ سالار بھی تھا اور ادیب بھی، تذکرہ مرأۃ الخیال امیر شیر علی خاں لودھی نے لکھا ہے اس میں بیدل اور ہم عصر شعرا کے حالات بھی لکھے ہیں۔ ایک دن نواب شکر اللہ خاں کے ہاں مجلس شعر و سخن گرم تھی۔ ناصر علی سرہندی اور بیدل بھی موجود تھے۔ بیدل نے ایک غزل پڑھی جس کا مطلع ہے۔

بیدل

نہ شد آئینہ کیفیّت ما ظاہر آرائی
نہاں ماندیم چوں معنی بچندیں لفظ پیدائی

مفہوم شعر تو یہ ہے کہ اگرچہ لفظوں کی صورت میں معنی کا انکشاف ہوتا ہے۔ لیکن میں یا میری حقیقت کا اظہار کسی صورت میں نہ ہُوا۔ ناصر علی نے کہا کہ معنی تابع لفظ ہے، جب لفظ پیدا ہُوا تو البتہ معنی بھی ظاہر ہونا چاہیئے۔ بیدل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ آپ معنی تابع لفظ سمجھتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی لفظی حیثیت سے کچھ زیادہ نہیں لیکن "من" کی ماہیت کسی لفظ سے منکشف نہیں ہوسکتی۔ مثلاً "حقیقت انسان" باوجود کتابوں میں شرح وبسط کے ساتھ اس موضوع پر بحث کی گئی ہے لیکن یہ حقیقت پوشیدہ ہی رہی' ناصر علی نے خوب داد دی۔

مثنوی "عرفاں" میں بیدل کہتا ہے کہ جب میں نے تحقیق شروع کی تو آخر

یقینم شد کہ در ہر قطرہ جانیست
نہاں در ہر کف خاکے جہانیست

مجھے یقین ہوگیا کہ ہر ایک قطرہ میں جان ہے، اور ہر ایک ذرّہ ایک جہان ہے۔

ایک غزل کا مطلع ہے۔

ایں دل حیرت سرا از نقش قدرتہا پر است
ذرّہ از ساماں مہر و قطرہ از دریا پر است

کدام قطرہ کہ صد بحر در رکاب ندارد
کدام ذرّہ کہ طوفان آفتاب ندارد

ہمارے زمانہ کی علمی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ ہر ایک ذرّہ میں کامل نظام شمسی موجود ہے، اور ہر ایک قطرہ میں دریا موجزن ہے۔ بصرو

بصیرت سے نقوش ان اشیاء کے اور ان کے حقائق ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، قلب انسانی ایک آئینہ ہے اور حیرت سرا ہے۔ نہ تو اشیاءِ آفاقی اور نہ ان کے نقوش یا تصورات ذہنی ہمارے پیدا کردہ ہیں۔ بیدل اکثر اشعار میں یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ پیدا کرنے والا وہی خالق کائنات ہے اور ایک ہی ہے۔

بہرحال معیارِ صداقت بھی صحیفہ کائنات ہے، لیکن بیدل ایک خاص بات بھی کہتا ہے اور یہی اس کی اپنی تحقیق ہے کہ ہر ایک محقق کی تحقیق حرفِ آخر نہیں، جسے ہم تحقیق کہتے ہیں وہ محقق کی اپنی حدِ نظر ہے۔

ہر کس ایں جا از مقام و حالِ خود گوید خبر
از زبانم حرف اوگر بشنوی باور مکن

ہر ایک محقق کا نظریہ جسے وہ اپنی تحقیق سے تعبیر کرتا ہے خود اس کے حال اور مقام کا پتہ دیتا ہے کہ اس کے ذہن کی رسائی اس حد تک ہے۔ اسی طرح اگر میں یا کوئی اور کسی کی نسبت جو اس کا غیر ہے یہ کہے کہ وہ ایسا اور ایسا ہے تو باور نہ کر۔ مطلب یہ ہے کہ کنہ ذات معلوم کرنا محال ہے۔ ذات کی نسبت جو کچھ حکماء نے آج تک کہا ہے وہ ان کا اپنا نظریہ ہے اور بس۔ البتہ ہر ایک نظریہ کی بلندی اور پستی کا اندازہ اسی نظریہ کی بلندی اور پستی سے ہو سکتا ہے۔ ایک رباعی میں بوضاحت لکھتا ہے کہ کسی شے کا سایہ خاک پر تاریک ہوتا ہے جو شخص سایہ اس حال میں دیکھ رہا ہے وہ اسے تاریک ہی کہے گا اور سچ کہتا ہے۔ دوسرا شخص اسی سایہ کو پانی میں تمثال کی صورت میں دیکھتا ہے اگر وہ اسے تمثال سے تعبیر کرتا ہے تو وہ بھی سچ کہتا ہے۔ دونوں کا مشاہدہ اور تحقیق ان کی اپنی حدِ نظر تک ہے۔ اصل شے سایہ اور خاک و آب و تاریکی و تمثال سے باہر ہے اور ان سب سے بے نیاز ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچ کر بیدل کہتا ہے کہ جس حد تک تزکیہ نفس

اور تصفیہ قلب ہو یہ سایہ یا "ظل" اسی حد تک صاف مشاہدہ ہوگا، اس سے بڑھ کر ہم تحقیق کر ہی نہیں سکتے، یعنی اپنی محسوسات معینہ مشخصہ کی صورتوں اور حقائق سے آگاہ ہو سکتے ہیں، اور یہ سب ظل ہی ہے۔ اس موضوع پر بیدل نے مختلف پیرایہ میں اکثر اشعار میں دادِ تحقیق دی ہے۔

تنزیہ بے نیاز است از انقلاب تشبیہ
گو برہمن دو روزی محو صنم بر دل آ

تنزیہ تشبیہ کی مثل نہیں ہے تشبیہ خواہ سایہ ہو یا تمثال اس پر ہر آن تغیرات واقع ہوتے ہیں، اور کبھی ایک حال پر اس کا قیام نہیں، لیکن تنزیہ اس انقلاب سے پاک ہے۔ برہمن بت پرستی میں محو ہے تشبیہ اور اس کے انقلاب کا پجاری ہے، اگر وہ چاہتا ہے کہ حقیقت آشنا ہو تو اس تمثال پرستی کو ترک کرنا چاہیئے اور اس کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جس کی یہ تمثال ہے، یا جس نے یہ تمثال پیدا کی ہے۔

بغیر عکس ندانم دگر چہ خواہی دید
اگر در آئینہ بینی جمال یکتا را

آئینہ خواہ کتنا ہی صاف ہو اس میں تو صرف عکس ہی نظر آئے گا۔ اس لئے جمال یکتا یا حسن وحدت اسی حد تک ممکن ہے۔

پرتو خورشید جز در خاک نتواں یافتن
یک زمین تا آسماں از اصل خود دوریم ما

آفتاب کا سایہ خاک ہی پر پڑتا ہے جو انتہائی کثیف ہے، اسی طرح ہمارے جسد خاکی میں یہی ظل جلوہ فرما ہے، آفتاب تو آسمان میں اور سایہ زمین پر، یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم اپنی اصل سے اتنا ہی دور ہیں جتنا عرصہ یا فاصلہ زمین و آسمان میں ہے۔

چہ ممکن است رود داغ بندگی ز جبیں
زمیں فلک شود و آدمی خدا نہ شود

اگر یہ ممکن بھی ہو کہ زمین آسمان بن جائے پھر بھی داغ بندگی جو ہماری پیشانی پر ازلی وابدی ہے مٹ نہیں سکتا اور یہ ممکن ہی نہیں کہ آدمی خدا بن جائے۔

مگو ممکن ز حد خویش بگذشت   نہ او واجب شد و نے ممکن ایں گشت

حسن یکتائی و آغوش دوئی وہم است وہم
تا تو از آئینہ می یابی اثر دیدار نیست

حُسن یکتائی کو دوئی کی آغوش میں دیکھنا محض وہم محال اندیش ہے، جب تک تو آئینہ میں اس کا عکس دیکھ رہا ہے یہ سمجھ کہ حُسن یکتائی کا دیدار نہیں ہوگا۔ لیکن

باید از ہستی بہ تمثالے قناعت کردنت
میہماں خانہ آئینہ بیروں در است

اس کے سوا چارہ نہیں کہ آئینہ ہستی میں اسی ظل اسی تمثال پر قناعت کی جائے، خانۂ آئینہ میں مہمان کی صورت تو جلوہ گر ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مہمان خانہ آئینہ کے دروازہ سے باہر ہی ہے، اسی تخیّل کو بیدل نے ایک اور شعر میں بیان کرتے ہوئے ایک اور بات پیدا کی ہے۔

حُسن یکتا چہ جنوں داشت کہ از ننگ دوئی
خواست بر سنگ زند آئینہ بر بازدہ دست

اس شعر کا مطلب سمجھنے کے لئے پہلے اس شعر کو سمجھنا چاہئے۔

کجا ست غیر جز اثبات ذات یکتائی
تو ئی "در آئینہ وار دُمنی" کہ از تو جداست

اگرچہ آئینہ میں تیرا عکس تو ہی ہے مگر تجھ سے جُدا ہے، اس لئے تیرا غیر اعتباری ہے، اس لئے اس کی نفی تیری ذات کی یکتائی کا اثبات ہے، اگرچہ تیرا عکس فی الحقیقت تیرا غیر نہیں لیکن اس لئے کہ تجھ سے جُدا ہے اسے

غیر کہہ سکتے ہیں، اسی کی نفی سے غرض تیری یکتائی ثابت کرنا ہے، کائنات آئینہ ہے اور اس میں ذات کے اسماء و صفات جو عکس ذات ہیں جلوہ فرما ہیں، ان کی نفی "ذات بحت" کا اثبات ہے، اب مناسب تو یہ تھا حسن یکتا کی غیرت اس آئینہ کو پتھر پر مار کر توڑ دیتی مگر میرے سر پر مارا، اس میں تلمیح ہے، اور اشارہ آیہ کریمہ کی طرف ہے، کہ "امانت" کو پہاڑوں پر پیش کیا گیا مگر سموات وغیرہ سب یہ بار امانت اٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔ آئینہ سنگ ہی ہے، یا جلا شدہ سنگ آئینہ ہے، اور پہاڑ یہی سنگ ہیں، مطلب یہ ہے کہ انسان عقلمند با شعور مخلوق ہے اور یہی "عین" "د" "غیر" میں تمیز کرتا ہے اس لئے ذات کی شخصیت اور اس کے عکس کو ایک دوسرے کا غیر یہی کہہ سکتا ہے۔ اس شعر کا لطف "چہ جنوں داشت" میں ہے۔ عقل کی نفی جنوں کا اثبات ہے، اور جنوں حسن یکتا نے ہمیں دیا ہے۔ بیدل نے اکثر اشعار میں عقل و جنوں پر جسے اصطلاح میں عشق سے موسوم کرتے ہیں لطیف بحث کی ہے۔ علامہ اقبال نے بیدل کے ایک شعر کی تشریح "بانگ درا" میں کی ہے۔ شعر یہ ہے کہ

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

خواجہ حافظ فرماتے ہیں:—

خرد ہر چند نقد کائنات است — چہ سنجد پیش عشق کیمیا کار

اگرچہ عقل کائنات کا سرمایہ ہے اور تمام کائنات میں یہی ایک شے قدر و قیمت کی ہے مگر عشق کے مقابلہ میں اس کی کچھ قیمت نہیں، عشق کیمیا کار ہے۔ کائنات خاک ہے اس کو زر اسی کیمیائی عشق سے بنا سکتے ہیں، عقل ہر ایک شے کو ایک دوسرے کا غیر دکھاتی ہے، عشق کی نگہ میں کثرت محو ہو کر وحدت جلوہ نما ہوتی ہے۔

یہ بحث تو طویل ہے، بیدل نے اکثر اشعار میں مختلف پیرایہ میں یہی تخیل واضح کیا ہے، آئینہ و تمثال کی نسبت کہتا ہے۔

تمثال بغیر از اثر شخص چہ دارد
خوش باش کہ خود را لو نمودن ہنر اوست

یہ شعر نہایت لطیف ہے۔ ہر ایک انسان کو "انا الموجود" کا احساس ہے، حالانکہ بقول شیخ سعدیؒ

این مدعیان در طلبش بے خبر اند
کا نرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد

موجود تو ایک ذات واحد ہی ہے۔ لیکن ہمیں اپنی موجودگی کا احساس اس اثر سے ہو رہا ہے جو وجود حقیقی کی تمثال نے ہم میں پیدا کر رکھا ہے۔ یعنی اس کی تمثال ہم ہیں اور یہ جلوہ صفات ہے چونکہ وہ بالذات موجود ہے، اس لئے تمثال کو بھی "انا الموجود" کا دعوےٰ ہے۔ ذات قائم اپنی ذات میں ہے اور حق مطلق ہے۔ ہم قائم بالحق ہیں۔ اسماء کا قیام مسمّیٰ سے اور صفات کا قیام موصوف سے ہے۔ اسی نظریہ کو آفتاب اور سایہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اگر سایہ یہ چاہے کہ آفتاب تک پہنچے تو ظاہر ہے کہ جہاں آفتاب جلوہ گر ہوگا سایہ محو ہو جائے گا۔ کثرت صفات میں ہے، ذات میں تعدد نہیں۔

صفات ہر چہ بود ذات را تعدد نیست
بفکر لالہ و گل خوں مخور بہار یکیست

بہار تو ایک ہی ہے اس کی رنگینی لالہ و گل ہی میں مشاہدہ ہو سکتی ہے۔ اس لئے عالم کثرت کا قیام وحدت سے ہے، اگر کثرت کا اپنا وجود ذاتی بھی کوئی ہوتا "لفسدتا" تو یہ نظم و نظام عالم قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

پیوستگی بحق ز دو عالم بریدن است
دیدارِ دوست، ہستی خود را ندیدن است

پرواز سایہ جز بسر بام مہر نیست
از خود رمیدن تو بحق آرمیدن است

"دو عالم" سے مراد "دوئی"

نظر آئے دو عالم جس کو اک عالم یہاں اپنا
سمجھ لیجے بشر احول ہے وہ ساری خدائی کا

بیدل نے آفتاب اور سایہ کا مضمون مختلف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ یہ شعر بھی لطیف ہے۔

جز ہستی مطلق ز مقید نتواں یافت
اشیا ز ہمہ یکسایۂ خورشید نقاب اند

سایہ دراصل وہی آفتاب ہے جس پر ایک نقاب پڑا ہے اس لئے ہستی مطلق ہی ہے جو مقید میں مشاہدہ ہو سکتی ہے۔ ہستی مطلق خود تقیدات سے پاک ہے وہ ازلی اور ابدی مطلق ہی ہے مطلق ہی رہے گی۔ لیکن اس شعر میں بیدل نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ جسطرح آفتاب کا سایہ اس خاکدان پر پڑتا ہے اور لطیف شے کو ہم کثیف ہی میں دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح ہستی مطلق کا مشاہدہ مقید ہی میں ممکن ہے۔ خواجہ حافظ کا ارشاد ہے کہ

حجاب و پردہ ندارد نگار دلکش ما
تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

ہزار سایہ ہوں آفتاب پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ البتہ جہاں تک انسانی مشاہدہ کا تعلق ہے "ذرہ ابر ناپدید کند"۔ "اللہ نور السموات والارض" یہ نور چونکہ لطیف ہے ہم نہیں دیکھ سکتے لیکن سموات اور ارض میں مشاہدہ کر سکتے ہیں سموات اور ارض خود تاریک ہیں لیکن اسی نور سے

ہمیں اشیاء کائنات نظر آتی ہیں ابصار اس نور کے درک سے عاجز ہیں، یہ نور خود ہمارے ادراک کو نہ صرف درک کرتا ہے بلکہ اسی نور سے ہم اشیاء کائنات اور اس نور کی موجودگی کا شعور رکھتے ہیں، اس کی مثال وہی ہے جو سورۂ نور میں بیان کی گئی ہے۔ ایک تاریک مکان میں نور شمع مکان اور مکان کی ہر ایک شے کو روشن کر رہا ہے۔ لیکن ہم اشیاء کو تو دیکھتے ہیں اس نور شمع کو جو اشیاء پر پڑتا ہے نہیں دیکھتے اور غلط فہمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اشیاء بذاتہ روشن ہیں، اب اگر شمع مکان میں نہ ہو تو ہماری آنکھوں میں بھی نور نہ ہوگا اور تمام دنیا جہاں تاریک ہوگی۔

در عالمے کہ با خود رنگے نبود ما را
بودیم آنچہ بودیم او وا نمود ما را

آنحضرتؐ کا ارشاد ہے "عرفت ربی بنور ربی" میں نے اپنے رب کو اپنے رب کے نور سے پہچانا "ہمیں نور است مہرتابِ خورشید" بیدل کا نظریۂ معرفت ہم بیان کر چکے ہیں کہ مثل کو مثل ہی پہچان سکتا ہے، اس لئے اللہ کی معرفت اللہ ہی کو ہے، اللہ کا نور اللہ کا عین ہے، اور اسی نور سے اپنی معرفت ذاتی حاصل ہے، اور یہی نور انسان میں بھی اسے خود شناس بناتا ہے، اس لئے "من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ" جو خود شناس ہے وہ حقیقت شناس ہے۔

علامہ محمود شبستری "گلشن راز" میں بھی یہی حقیقت واضح کرتے ہیں کہ اگر سورج کو برہنہ آنکھ سے دیکھیں تو اس میں خیرگی اور تیرگی پیدا ہوگی لیکن اگر اس کا عکس پانی میں دیکھیں تو اگرچہ ہم آفتاب کو نہیں دیکھ رہے مگر ایک کیفیّت ذہن میں پیدا ہوگی۔

اگرچہ بیدل دیگر صوفیاء محققین کی طرح "وحدت الوجود" کا نغمہ سنج ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے جس کا اسے خود اعتراف ہے اور جیسے مولانا جامی

نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ

سر وحدت منطق الطیر است جامی لب بربند
جز سلیمانے نشاید فہم ایں گفتار را

یہ جانوروں کی بولیاں کوئی سلیمان ہی ہو تو سمجھے، یہ مسئلہ عام فہم نہیں، بہرحال

دوسرا ہر دوسرا میں اور تو کوئی نہیں
ہستی موہوم میری یا خدا کی ذات ہے

مزید بحث ہم بعض اشعار کی شرح کے تحت کرینگے۔ ان مسائل کو شرح و بسط سے بیان کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ بیدل کا کلام سمجھنے میں آسانی ہو، کیونکہ زیادہ تر یہی اس کے کلام کا موضوع ہے۔

امروز و فردا بیدل کا نظریہ زمان و مکان کے بارہ میں یہ ہے کہ تمام کائنات ایک "واقعہ واحدہ" ہے اور "حضرت علم الٰہی" سے خارج معدوم ہے۔ یہ مسئلہ نہایت دقیق ہے۔ اس گتھی کو ہمارے زمانہ کے حکماء نے بھی سلجھانے کی کوشش کی ہے، اور افلاطون سے لے کر آج تک کائنات کے بارہ میں جو کچھ نظریئے پیش کئے گئے ہیں ان میں دو نظریئے نمایاں ہیں، ایک تو یہ کہ کائنات مادی دنیا ہے، اور یہی قدیم ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ تمام کائنات ایک "قلب" عظیم کے اندر موجود ہے جس کو "خیال" (   ) سے موسوم کرتے ہیں اور جسے مادہ کہتے ہیں وہ صرف خیالی صورتیں ہیں، اوّل الذکر حکماء کو مادہ پرست اور مؤخر الذکر کو سوفسطائی خیال پرست (   ) کہتے ہیں۔ بحث صرف قلب (   ) اور مادہ (   ) پر آرہتی ہے۔ مادہ پرست یہ کہتے ہیں کہ مادہ ہی سے قلب کی پیدائش واقع ہوئی ہے، اور خیال پرست اس کے خلاف قلب کو مقدم کہتے ہیں، قلب

کا کام تصوّرات یا خیالات ہیں اور مادہ مکان و زمان ہی میں مشاہدہ ہوتا ہے، ان دونوں میں جو اختلاف عمل ہے اسے دیکھتے ہوئے "ڈیکارٹ" کے متبعین نے یہ نظریہ قائم کیا کہ قلب کا جسم پر اور جسم کا قلب پر کوئی اثر نہیں ہوتا، اگر یہ صحیح ہو تو کائنات میں قلب اور جسم متوازی خطوط پر سرگرم عمل ہو جاتے ہیں جو کہیں نہیں ملتے، "ڈیکارٹ" کے نظریہ "دوئی" کو لبنز (   ) وغیرہ نے مسترد کر دیا۔

آئیڈیل ازم (   ) کے نزدیک مادہ حقیقی شے نہیں۔ بشپ "بارکلے" نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے، کانٹ (   ) (۱۷۲۴ء — ۱۸۰۴ء) کا نظریہ یہ ہے کہ دو حقیقتیں موجود ہیں۔ مقدم حقیقت مادی ہے مثلاً شکل و صورت، وزن وغیرہ اور ثانوی حقیقت رنگ، ذائقہ وغیرہ، اوّل الذکر تو آفاق میں مادی دنیا کے اوصاف ہیں اور مؤخر الذکر احساسات یا تصوّرات ذہنی ہیں۔ اوّل الذکر جو کچھ خارج میں موجود ہے وہ انسان اور انسانی ذہن سے بے نیاز پہلے ہی موجود ہے۔ بارکلے (۱۶۸۵ء — ۱۷۵۳ء) اس نظریہ کو مسترد کرتا ہے۔ ہیگل (۱۷۷۰ء — ۱۸۳۱ء) کا نظریہ کسی حد تک کانٹ کے مطابق ہے۔ لیکن وہ کانٹ کے نظریہ کثرت کو وحدت میں محو کرتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ ایک ہی حقیقت موجود ہے، جسے وہ "مطلق" (   ) کہتا ہے، یہ مطلق نہ صرف حقیقت مجردہ ہے بلکہ عالم صورت بھی یہی ہے۔ تمام عالم ایک وحدت ہے جو کثرت پر محیط ہے اور کثرت میں اختلاف اور تضاد سب موہوم ہے، یعنی "دوئی" غیر حقیقی ہے، اور یہ کہ عالم قلب ہی ہے۔

مگر ز عالم اضداد بگذری ورنہ
بہشت ہم بمقابل جہنمی دارد

نقش نیرنگ دو عالم رقم لوح دل است
ہمہ از ماست گر ایں آئینہ بر ما بخشند،

ہیگل کے نظریہ کے مطابق تمام اشیاء اور ان کی شکل وصورت وغیرہ میں اختلاف محض "نسبتی امور" ہیں۔ ہم اشیاء کا تقابل امثال واختلاف و اضداد وغیرہ سے کرتے ہیں اور یہی کچھ کسی شے کی نسبت ہمارا مبلغ علم ہے۔ لیکن یہ تمام امور غیر حقیقی ہیں، اور یہی کیفیت ہمارے تصوّرات اور عقائد کی بھی ہے۔ جیسے ہم "حق" کہتے ہیں اس کا تصوّر "کذب" کے تصوّر سے وابستہ ہے، جیسے ہم حقیقی کہتے ہیں اس کی ضد غیر حقیقی بھی ہمارے پیش نظر ہوتی ہے، اگرچہ یہ دونوں ذہنی امور ہیں لیکن جسے ہم امر واقعہ سے تعبیر کرتے ہیں اس کی موجودگی واجب ہے، اور وہ قائم بالذات ہونا چاہئے نہ کہ اس کی ہستی کا انحصار کسی دوسرے امر واقعہ پر ہو، اگر ایسی صورت ہو یعنی حقائق کی کثرت ہو اور سب قائم بالذات ہوں تو ہیگل کا نظریہ باطل ہوگا، مگر ہیگل اس نظریہ ہی کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ عالم صرف "واقعہ واحدہ" ہے جسے وہ مطلق سے موسوم کرتا ہے، بیدل اور تمام صوفیاء محققین کا بھی یہی نظریہ ہے کہ عالم واقعہ واحدہ ہے اور یہ کہ واقعات جو ہم مشاہدہ کرتے ہیں نسبتی امور ہیں اور اس واقعہ واحدہ سے وابستہ ہیں یعنی حق مطلق قائم بالذات ہے اور کائنات قائم بالحق ہے خود قائم بالذات نہیں، اس نظریہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے مسئلہ تجدد امثال کو پیش نظر رکھنا چاہیئے جس پر ہم بیدل کے نقطہ نظر سے بحث کریں گے، اور اسی کے تحت زمان ومکان وامروز وفردا اور دنیا وعقبیٰ وغیرہ مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔

تجدد امثال

یہ حقیقت تو ہر ایک اہل نظر پر منکشف ہے کہ کائنات اور کائنات کی ہر ایک شے پر تغیرات

واقع ہوتے ہیں، اس انکشاف کے بعد محققین نے ان تغیرات کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی۔ معلوم ہوا کہ عالم میں قوانینِ فطرت آفرینش سے سرگرم عمل ہیں اور انہی سے نظامِ عالم قائم ہے۔ یہ قوانین خود نہیں بدلتے اور ناقابلِ تبدیل و تحویل ہیں لیکن تمام تغیرات انہی کے پیدا کردہ ہیں۔ ان تغیّرات کی وجہ سے تمام کائنات اور کائنات کی ہر ایک شے ارتقائی مرحلے طے کرتی چلی آرہی ہے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ تجدد امثال کا مفہوم یہ ہے کہ ہر ایک شے کی امثال بدل رہی ہیں۔ خود یہ شے یا اس کی حقیقت یا ماہیت جو کچھ بھی ہے جسے ہم نہیں جانتے نہیں بدلتی۔ ہر ایک شے کی صورت ہی بدلتی ہے، اس لئے ہر ایک شے تغیّرات کے زیرِ اثر "خلق جدید" میں رونما ہوتی ہے۔ صورت نہ صرف ظاہری ہے بلکہ ذہنی بھی ہے یعنی قانون تجدّد کائنات خارجی اور ذہنی دونوں صورتوں پر مؤثر ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے علوم و فنون بھی بدلتے رہتے ہیں۔

"ہربرٹ سپنسر کہتا ہے کہ اوّل تو کسی ایک زمانہ میں بھی حکماء کا ایک نظریہ پر اتفاق کبھی نہیں ہوا اور اگر بالفرض اس کا امکان بھی ہو تو واجب ہے کہ خلف سلف سے اختلاف کرے اگر ایسا نہ کرے گا تو ذہنی ارتقاء رُک جائے گا۔ قومیں جو رجعت پسند ہوتی ہیں اور اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنا پسند کرتی ہیں جس کو اصطلاح میں تعامل کہتے ہیں ان پر ذہنی جمود چھایا ہوا ہوتا ہے اور وہ دیر سویر مٹ جاتی ہیں۔ ارشاد قرآن ہے کہ "اللہ تعالےٰ کسی قوم کے حالات نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی ذہنیت کو نہ بدلے اور جب نہیں بدلتی تو اس کے برے دن آجاتے ہیں جو ٹالے سے نہیں ٹلتے"۔

مشہور یونانی فلسفی ہریکلیٹس (۵۴۰ - ۴۷۵ قبل از مسیح) کا نظریہ یہ تھا کہ ہر ایک شے متغیر اور متبدل ہو رہی ہے۔ ایک

دوسرے فلسفی پرمینا ئڈز (۵۰۰ قبل از مسیح) کا نظریہ یہ تھا کہ اگرچہ اجزاء پر تغیرات واقع ہوتے مشاہدہ ہو رہے ہیں مگر کائنات کلی جوں کی توں ہے۔ یعنی نہ تو ذرّہ بھر بڑھتا ہے اور نہ کم ہوتا ہے اور تغیرات محض فریب نظر ہیں، فریب نظر کی مثال "زینو" (   ) نے یہ پیش کی ہے کہ فرض کرو ایک تیر کمان سے نکلا، ہدف تک اس کو کچھ عرصہ درکار ہے۔ اس عرصہ کے لمحات میں تیر کو پرواز کرتا ہُوا تصوّر کرو ہر ایک لمحہ میں تیر کسی خاص مقام پر ہونا چاہیئے یا نہ ہونا چاہیئے۔ اگر وہ وہیں ہے جہاں اسے ہونا چاہیئے تو وہ متحرک نہیں اس لئے حرکت محض فریب نظر ہے۔ اسی قسم کے سوفسطائی دلائل بہت ہیں افلاطون نے اپنا نظریہ "عالم مثال" (   ) انہی دو نظریوں پر قائم کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں نظریئے صحیح ہیں، اور ان میں کوئی تضاد نہیں۔ فرق صرف دونوں محققین کی حد نظر کا ہے۔ جہاں تک محسوسات کا تعلق ہے تغیرات بالبداہت ثابت شدہ حقیقت ہیں۔ اور جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں دوسرا نظریہ بھی صحیح ہے کہ حقیقت مطلق ناقابلِ تغیر و تبدل ہے۔

ہمارے زمانہ میں ارتقا پر جو کچھ حکماء نے لکھا ہے اس سے "تجدد امثال" کی قطعی تائیدی شہادت ملتی ہے، لیکن مادہ پرست یہ کہتے ہیں کہ کل کائنات ایک عظیم الشان مشین کی طرح ہے جس کے پُرزے اور ان کا عمل ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہے ہیں اس لئے اس نظریہ کو میکینسٹک (   ) کہتے ہیں کسی وقت کسی نے یا اتفاقیہ کسی سبب سے اس میں حرکت پیدا کردی یا پیدا ہوگئی۔ اور اب یہ کل اور اس کل کے پُرزے خود بخود سرگرم عمل ہیں یہ وہ نظریہ ہے جس کی پُرزور مخالفت "برگساں" (   ) نے ہمارے زمانہ میں کی، مادہ پرست تو یہ کہتے ہیں کہ زندگی مادہ ہی کا خاصہ ہے۔ برگساں یہ کہتا ہے کہ مادہ زندگی

کی پیداوار ہے۔ برگسان نے حیاتیات (   ) اور نفسیات (   ) پر اپنے دلائل کی بنیاد استوار کی ہے۔

ہم نے ان حکماء کے نظریوں کا حوالہ اس لئے دیا ہے تاکہ بقول بیدل معلوم ہو کہ "کدام گنج کہ در خانہ خراب تو نیست" ہمارے زمانہ میں فلسفہ یعنی نظری حکمت کے ساتھ سائنس یعنی عملی حکمت نے ایک انقلاب عظیم ذہن انسانی میں پیدا کیا اور مادہ اب صرف ایک قوت (   ) اصل میں رہ گیا ہے۔ اور اس قوت کی حرارت کی کمی بیشی سے مختلف مادی صورتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ اور یہ کہ یہ قوت بھی محدود ہے۔ اور اس کی تقسیم غیر مساوی سے تغیرات وغیرہ واقع ہو رہے ہیں اور یہ کہ اس قوت کا رحجان مساوی تقسیم کی طرف ہے۔ اور جب یہ اعتدال پر آجائے گی تو کائنات میں حرکت مفقود ہو جائے گی یعنی ایک قسم کا جمود مطلق واقعہ ہو گا۔ اسے کہتے ہیں:-

(   )

حکماء اسلام میں سے غالباً سب سے پہلے محی الدین شیخ اکبر نے اصطلاح تجدد امثال قرآن کی بعض آیات سے اخذ کی (واذا شئنا بدلنا امثالهم تبدیلا۔ ۲۹: ۲۰) نیز (افعیینا بالخلق الاول بل هم فی لبس من خلق جدید۔ ۲۶: ۱۵) چنانچہ فصوص الحکم میں اپنی کتاب تجلیات کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ میں نے کشف میں اکابر صوفیہ جنید بغدادی وغیرہ کو دیکھا کہ وہ ترقی کر رہے ہیں مگر ان کو اس کا شعور نہ تھا، میں نے آیہ (واتوا بہ متشابھا) کی تفسیر کرتے ہوئے انھیں قانون تجدد امثال سے آگاہ کیا۔ شیخ اکبر یہ کہتے ہیں کہ نہ صرف اس دنیوی زندگی میں بلکہ بعد ممات بھی زیر اثر تجدد امثال ارتقاء جاری ہے۔ اس مسئلہ کے نتائج اہم ہیں۔

(۱) جہان کبھی کہنہ و فرسودہ نہیں ہوتا ہر آن اس کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ

نوی بیدل از ساز امکان نرفت نشد کہنہ تجدید ایجاد ہا

درکارگہ تجدید یکست چمن سازیست
تقویم بہار این جا پارینہ نمی باشد

تجدید کے کارخانہ میں جو کچھ بھی بنتا ہے نیا ہی بنتا ہے اس چمن پر ہمیشہ بہار کی رونق رہتی ہے۔

اے میوہ زرد و زرد رس کہنہ مشو
باغ طربی ز خار و خس کہنہ مشو
ہنگامہ آثار و تجدد گرم است
اے معنی تازہ پیش کس کہنہ مشو

میوہ پختہ ہو کر زرد پڑ جاتا ہے مگر پختگی سے مراد کہنگی نہیں اور نہ وہ خار و خس میں بدلتا ہے اس کی حقیقت ہمیشہ تر و تازہ ہے۔ تجدد کے زیر اثر وہ کبھی کہنہ نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ بظاہر کہنگی کے آثار محسوس ہوتے ہیں مگر تو خود باغ طرب ہے اور ہمیشہ تر و تازہ ہے۔

(۲) چونکہ عالم کی امثال بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے عالم ہر آن فنا ہوتا اور ہر آن اس کا مثل ظہور میں آتا ہے، اس لئے اللہ تعالی ہر آن خالق اور مبدی اور بدیع او مصوّر وغیرہم ہے، (کل یوم ھو فی شان)

(۳) تجدد میں ارتقاء لامحدود ہے۔ (اجر غیر ممنون)

زکارگاہ تجدد عیاں نہ شد بیدل
جز ایں قدر کہ کسے ایں جا با نتہا نرسید

اے بے دل کارگاہِ تجدد سے اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ اس جگہ کوئی شخص انتہا کو نہ پہنچا۔

(۴) ارتقاء کا لازمی نتیجہ ہے کہ ہر ایک شے کا آخر اوّل سے بہتر ہے۔ (الاٰخرۃ خیر و ابقیٰ)

(۵) تجدد میں رجعت یعنی ہستی میں تکرار نہیں۔

تکرار مبند یدبرا وراق تجدد تقویم نفس را خط پارینہ نباشد

جس طرح ہر ایک سانس ایک نیا ہے اور جو گذر گیا وہ دوبارہ نہیں آتا، اسی سے رشتہ زندگی وابستہ ہے، اسی طرح دفتر ہستی کا جو ورق اُلٹ گیا وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، وہ کبھی گردش کرتا ہوا دوبارہ رونما نہ ہوگا۔

نشست و برخاست نمی گردد از سپند مگر،
چہ ممکن است کہ نقش کسے دو بار نشیند

جس طرح سپند کا دانہ ایک دفعہ ہی مجمر میں جل کر آواز دیتا ہے اور پھر ہمیشہ کے لئے خاموش ہوتا ہے اسی طرح ممکن نہیں کہ کوئی نقش دوبارہ ثبت ہو سکے۔ "برگساں" نے لکھا ہے کہ فرض کرو آپ غیر متحرک ساکن شے کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ شے ایک ہی جگہ پڑی رہی اور آپ اسے ایک ہی جانب سے ایک ہی زاویہ نگاہ سے اور ایک ہی روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اس کا تصور لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہے گا۔ میرا حافظہ بھی موجود ہے جو تذکرہ سے گذشتہ تصورات کو سامنے لا رہا ہے، میری قلبی حالت جوں جوں جادۂ وقت پر گامزن ہوتی جائے گی، ان تصورات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ گو وہ ایک دوسرے کے مشابہ اس حد تک ہوں کہ ان میں امتیاز پیدا کرنا مشکل ہے، مگر ہر ایک تصور ایک دوسرے کا غیر ہے۔ "برگساں" کے لفظوں میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم "بلا توقف متغیر" ہو رہے ہیں، خواہ یہ اشیاء خارجی کے تصورات ہوں یا ہمارے قویٰ باطنی یا خواہشات یا جذبات یا ارادہ وغیرہ ہو اور جسے حال سے موسوم کیا جاتا ہے وہ صرف تغیرات کا دوسرا نام ہے۔ احساس ہو یا خیال یا ارادہ وغیرہ مسلسل معرض

تغیر میں ہے اور اگر یہ رَو رُک جائے تو زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔" اس لئے ایک حالت سے گزر کر دوسری حالت میں آنا یا ایک ہی حالت میں مسلسل رہنا ایک ہی بات ہے دونوں میں کچھ فرق نہیں، بات صرف اتنی ہے جیسے شیخ اکبر نے واضح کیا ہے کہ ہمیں تغیرات کا فوری احساس اس لئے نہیں ہوتا کہ نہایت لطیف اور ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں ہمارا دریہی وجہ ہے کہ ہم باوجود ان تغیرات کے یقین کرتے ہیں کہ ہم عمر کے ہر ایک دَور میں ایک ہی ہیں۔

جب یہ حقیقت مُسلم ہے کہ:۔

مکرر رونما ہوتا نہیں ہے کوئی ہستی میں
مثال اس آئینہ خانہ میں ممکن ہو تو پیدا کر
نقش آئینے میں پڑے اور مٹ گئے
اس گھر میں جو گیا وہ غریب الوطن ہُوا

(امیر مینائیؒ)

تو اس کے نتائج پر جو بہت دور رس ہیں غور کرنا چاہیئے۔ بیدل اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ "بیدل" دوبارہ نہیں ہوگا، ایک رباعی میں کہتا ہے کہ ہزار کوثر و تسنیم نثار کروں اگر بیدل دوبارہ ہو۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہ کرنی چاہیئے کہ بیدل حیات بعد ممات کا قائل نہیں، وہ خود کہتا ہے کہ

صورت ایں انجمن گر محو شد پروا کراست
خانہ نقاش ما نقش دگر خواھد نمود

اگر یہ انجمن جہاں ہم صورت دو چار بیٹھے ہیں درہم برہم ہو جائے تو کیا پرواہ ہے وہی نقاش جس نے اس انجمن کا نقشہ کھینچا اور نقش بنا دے گا۔

پیکر خاکی مارا برہ سیل فنا
یاد بربادی ازاں نیست کہ معمارے ہست

میرے خاکی جسم کو سیلاب اگر بہا کر لے جائے اور ضرور لے جائے گا تو مجھے اس بات کا اندیشہ نہیں کہ میں معدوم ہو جاؤں گا۔ اس لئے کہ معمار موجود ہے۔ جس نے پہلے میرا خاکی جسد بنایا وہی جس صورت میں چاہے گا اسے تعمیر کریگا۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ بیدل دوبارہ پیدا نہ ہوگا خواہ کچھ اور ہو غور کرنا چاہئے کہ انسانی صورت میں پیدائش سے لے کر موت تک ہم کتنی صورتیں بدل چکے ہیں، موت کے بعد ہم ان میں سے کس پسندیدہ صورت میں رونما ہوں گے؟ بیدل نے مزید تشریح شہادت ارتقا میں کی ہے جس کا مذکور مثنوی "عرفان" کے تحت ہم کر چکے ہیں "طین" یعنی جمادات سے ترقی کرتے ہوئے ہم انسان بنے، اگر ارتقاء کا یہ سلسلہ جاری رہے اور جاری ہے تو ہمیں توقع رکھنی چاہئے کہ بہتر صورت میں رونما ہونگے۔ اس تحقیق کے ضمن میں وہ کسی شخصیت کی آمد ثانی کا بھی قائل نہیں، چنانچہ ایک رباعی میں کہتا ہے کہ

باز آمدن مسیح و مہدی ایں جا از تجربہ مزاج اعیان دوراست

مینار دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ
اور انتظار مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے (اقبال)

اہل کتاب نصاریٰ کا یہ عقیدہ کہ مسیح دوبارہ دُنیا میں آئیں گے۔ اور عام مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ مسیح کے ساتھ مہدی کا بھی ظہور دوبارہ ہوگا، تحقیق سے بہت بعید ہے۔ اس لئے کہ ہستی میں تکرار نہیں ہے۔ مہدی خلافت عباسیہ کے آٹھویں تاجدار معتصم باللہ کے عہد میں "سامرا" (سر من رائے) کے ایک غار میں پوشیدہ ہو گئے تھے، اور ان کی آمد ثانی یا ظہور ثانی کا انتظار سنی اور شیعہ دونوں کو ہے۔ مہدی شیعہ کے بارہویں

امام غائب ہیں۔

انسان روزانہ اپنے ہم جنس انسانوں کو مرتا اور اسی طرح خاک میں ملتا دیکھ رہا ہے جس طرح دیگر حیوانات لیکن اس یقینی واقعہ کا مشاہدہ کرتے ہوئے بھی عمر ابد کا طالب ہے۔ یہ یقین کرتے ہوئے کہ مرنا ایک روز ضرور ہے پھر بھی چاہتا ہے کہ میں نہیں تو میرا نام ہی سہی یہی زندہ رہے۔

بہر کہ می نگرم طالب دوام و بقاست
مدار خلق بفکر محال می گذرد

میں ہر ایک شخص کو دیکھ رہا ہوں کہ یہی چاہتا ہے کہ دائمی زندگی ہو، بات یہ ہے کہ لوگوں کی زندگی کا مدار ہی فکر محال پر ہے علاوہ ازیں خضر کی کہانی لوگوں کے ازبر ہے۔

تجدد پرفشاں وغرہ عمر ابد بیدل
نیاز خضر کن را ہے کہ در صحرائے بنگ افتد

جب یہ امر مسلم ہے کہ ہر ایک شے پر تغیرات واقع ہو رہے ہیں اور کسی شے کو کسی ایک حالت پر بقا نہیں تو "عمر ابد" کا خیال خام پختہ کرنا انتہائی بے بصیری ہے۔ مناسب ہے کہ اس "ورق الخیال" کو جو بھنگ کے جنگل میں پیدا ہوتا ہے حضرت خضر کی نذر کر دو یعنی اس طرح بے پر کی اڑانا بھنگڑوں ہی کی ذہنیت کے مناسب ہے۔ لفظ "نیاز" نے خاص لطف پیدا کر دیا ضعیف الاعتقاد خضر کے نام پر نذر و نیاز بھی دیتے ہیں۔

تا کے زخلق پردہ بروافگنی چو خضر
مُردن بہ از خجالت بسیار زیستن

کب تک تو خلق سے چھپتا پھرے گا۔ خضر کی طرح چہرہ پر نقاب ڈالے گا۔ درازیِ عمر بھی شرمساری ہے اس سے بہتر تو مرنا ہی ہے، جو شخص شرمسار ہو وہ منہ چھپاتا پھرتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسی ہی شرمندگی خضر

کو بھی لاحق ہے، یہ تخیل غالب نے اس طرح ادا کیا۔

ہیں زندہ ہم کہ ہوئے روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

اس تحقیق کے تحت بیدل قاضی جمال کے فتاوے کی نسبت بھی یہی کہتا ہے کہ احکام شرعیہ حالات کے تابع ہوتے ہیں اور حالات ہمیشہ بدلتے ہیں خواہ ذہنی ہوں یا خارجی اس لئے ان کے مناسب احکام بھی بدلنے چاہئیں۔ نئے نئے حالات کے مناسب نئے احکام وضع ہونے چاہئیں یعنی ہمیں اپنی ذہنیت کو خارجی حالات کے مناسب بدلنا چاہئے۔ حق را قاضی جمال نتواں فہمید۔

بیدل کا دوسرا نظریہ تجدد امثال کے تحت یہ ہے کہ امروز و فردا اور دُنیا و عقبیٰ اور زمان و مکان سب اعتباری یا نسبتی امور ہیں۔ اور غیر حقیقی ہیں۔ اصل میں کائنات واقعہ واحدہ ہے اور حال ہی حال موجود ہے یہ صرف تغیرات ہیں جن کو ہم ماضی و مستقبل سے موسوم کرتے ہیں چند اشعار اس موضوع پر ملاحظہ ہوں۔

نہ دی گذشت نہ فردا بہ پیش می آمد
تجدد من و ما تا قیامت آغا زیست

غبار ماضی و مستقبل از حال تو می خیزد
درا امروز است گم گرد اشگافی دی و فردا را

دامن حال سے گرد جھاڑیں تو کچھ تو ماضی اور کچھ مستقبل کی صورت اختیار کرے گی، جسے تو کل گذشتہ اور آیندہ کہتا ہے دونوں حال ہی میں پوشیدہ ہیں۔ جب تو "آج" کو کھول کر دیکھے گا تو دونوں ظاہر ہو جائیں گے، اسی تخیل کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ

غم مستقبل و ماضی است کا نزا حال می نامی
نقابے درمیاں است از غبار پیش و پس ایں جا

جب غبار ہمارے آگے پیچھے اُڑ رہا ہو اور ہم اس میں گھرے ہوں تو لاچار اس خیال سے کہ یہ خاک دھول ہماری آنکھوں میں نہ پڑے یا مُنہ میں نہ جائے ہم چہرہ ڈھانپ لیتے ہیں۔ یہی کیفیت ذکرِ ماضی اور فکرِ مستقبل کی ہے کہ دونوں گرد و غبار ہیں جو ہمارے حال پر چھائے ہوئے ہیں۔ اور ہمارا حال بھی غبار آلودہ ہو کر رہ گیا، ہماری عمر یعنی حال اسی ذکرِ ماضی و فکرِ مستقبل میں گزر جاتا ہے اس لئے حال بھی ضائع ہو رہا ہے۔

برفریب نسیہ نقد خرمیہا باختیم
ساغر امروز ما بدستی فردا شکست

کہتے ہیں کہ نو نقد نہ تیرا اودھار، مگر ہم اودھار جو متوقع ہے کہ کل ملیگا اس طرح کھا کر بیٹھ رہے کہ جو نقد خرمی تھا وہ بھی ضائع ہو گیا اور اس سے کچھ فائدہ نہ اُٹھایا۔ یہ کہئے کہ "ساغر امروز" ہاتھ میں تھا اور اسمیں نقد استعداد یا ظرف بادہ خوشگوار بھی تھا لیکن بن پیئے فردا کا نشہ اتنا چڑھا کہ ساغر امروز ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔

جنوں بیخودی پیش برد سعی اہل
کہ کار عالم امروز نذر فردا کرد

دور از کار توقعات بھی مالیخولیا ہے کہ جو کام آج کا ہے اسے کل پر اُٹھا رکھا۔

بفکر نسیۂ موہوم نقد نیز نماند
مپرس درغم مستقبلم چہ حال گذشت

اودھار کی اُمید پر جو ایک امر موہوم تھا جو کچھ ہاتھ میں نقد تھا وہ بھی نہ رہا فکر مستقبل کے بارہ میں کچھ نہ پوچھ کہ مجھ پر کیا گزری یعنی حال اسی غم میں گزر گیا۔ چونکہ "حال" ہی اصل شے ہے اس لئے

درہائے فردوس وا بود امروز   از بے دماغی گفتیم فردا

فردوس کے دروازے آج کھلے ہوئے ہیں لیکن ہماری بے دماغی کا یہ عالم ہے کہ کہتے ہیں کل اس میں داخل ہوں گے۔

نشاط ایں جا، بہار ایں جا، بہشت ایں جا، نگار ایں جا
تو کز خود غافلی صرف عدم کُن دور بینی را

نشاط و بہار و بہشت و نگار جو آج یہاں موجود ہیں اگر ان سے چشم پوشی کی جائے تو ظاہر ہے کہ ہم اپنے آپ سے غافل ہیں اور اس کا فائدہ نہیں اُٹھاتے اور اُمید موہوم پر یہ بھی ضائع کر رہے ہیں، یہ دور بینی اسی وقت ممکن ہے جب نزدیک بینی نہ ہو اس لئے یہ سمجھ لو جس شے کی توقع ہے وہ محض موہوم و معدوم ہے۔

زبس بردہ است افسونِ امل از خود جہانے را
گر از امروز می پرسی ز فردا گفتگو دارد

یہی دور از کار توقعات ہیں جس نے ایک دنیا کو موجودہ حالات سے غافل بنا رکھا ہے۔ اگر کسی سے امروز یعنی آج کے حالات دریافت کرو تو کل کی باتیں سُنائے گا۔

بیدل کا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ تم اس کرۂ ارض پر پیدا ہوئے اور اسی جگہ ایک عمر بسر کرنی ہے آخر اس کی بھی کچھ غرض و غایت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں اپنے فضل و کرم سے وہ سب کچھ دے رکھا ہے جس کی ہمیں ضرورت ہے، بلکہ ہماری پیدائش سے پہلے ہی مہیا کر رکھا ہے۔ نشاط ایں جا، بہار ایں جا، بہشت ایں جا، نگار ایں جا، لیکن ہم نے اس جنّت کو دوزخ بنا رکھا ہے۔

داغِ نیرنگیم تاب آتش دیگر کراست
دوزخ امروزِ ما اندیشۂ فردا بس است

یہ اندیشۂ فردا جو ہمیں آج لاحق ہے ہمارے جلنے کے لئے یہی آگ کافی ہے، اس کے علاوہ اگر کوئی اور نارِ جہنّم بھی ہو تو کون برداشت کر سکتا ہے۔

بیدل نے "نکات" اور "چہار عنصر" میں لکھا ہے کہ آدمی ہر حال میں اپنی آسائش کا آپ دشمن ہے۔ اگر سفر میں ہے تو وطن کا خیال اور اگر وطن میں ہے تو سفر کی خواہش اسے چین لینے نہیں دیتی۔

تلخ است عیش امروز از گفتگوئے فردا
درخانۂ کہ مائیم ہمسایہ شور دارد

اسی طرح :-

دُنیا الم غفلت و عقبیٰ غم اعمال
آسودگی از ما دو جہاں فاصلہ دارد

دنیا میں غفلت کا اور اسی دُنیا میں رہتے ہوئے عقبیٰ کا غم کھائے جاتا ہے اس لئے یہ سمجھنا چاہیئے کہ جسے آسودگی کہتے ہیں وہ ہم سے اتنی دور ہے جتنا دو جہان کا فاصلہ نہ دنیا میں چین ملا، اور نہ عقبیٰ میں آسودگی کی توقع ہے وہاں بھی اعمال کی سزا و جزا ایسی ہی ہے جیسی اس دُنیا میں۔

تا نمیری رمز ایں معنی نگردد روشنت
کاشنائی زندگی از عافیت بیگانہ است

جب تک تو مرکر اس زندگی کو خیرباد نہیں کہتا تب تک یہ راز تجھ پر منکشف نہ ہوگا کہ اس زندگی سے آشنائی عافیت سے بیگانگی ہے۔

فلسفہ "آزار" بھی بیدل اسی تخیل سے اخذ کرتا ہے کہ

چہ اوج سپہر و چہ زیر زمیں ۔۔۔ بہر جا تو ئی جائے آرام نیست

ذوق کہتا ہے کہ

خواہ پھرتا ہے فلک یا خواہ پھرتی ہے زمیں
پر ہمارے واسطے یاں منزلِ راحت نہیں

مطلبے گر بود از ہستی ہمیں آزار بود
ورنہ در کنجِ عدم آسودگی بسیار بود

"عدم" نام ہے بے شعوری کا، بے علمی کا، بے حسی کا، ورنہ جسے عدم حقیقی سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کا تصوّر ایسا ہی "محال" ہے جیسے خود "محال" کا یعنی انسانی ذہن میں عدم اور محال کا تصوّر پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے انسان عدم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ جو کچھ بھی انسان کے ذہن میں آئے خواہ وہ محض وہم ہی کیوں نہ ہو "ممکن" ہے اور اگر مناسب اسباب کا علم ہو تو خارج میں اس کا ظہور بھی ممکن ہے۔ پیدائش سے پیشتر ہمیں معلوم نہیں کہ ہم کیا تھے، اب ہمیں اس امر کا شعور و علم و احساس ہے کہ ہم ہیں۔ لیکن اس شعور ہستی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ جسے کامل آسودگی کہتے ہیں وہ اسی بے شعوری میں تھی شعور ہستی شعور آزادی ہے جو بالبداہت ثابت شدہ واقعہ ہے۔

راحت دریں قلمرو از آثار ہوش نیست
خوابیدہ است اگر کسے آرام داشتہ است

امروز و فردا اور دنیا و عقبیٰ اور بہشت و دوزخ ایسا موضوع ہے جس پر بیدل نے سیر حاصل بحث کی ہے چونکہ اس کا نظریہ یہ ہے کہ یہ صرف تغیّرات ہیں جن کو ہم دی و فردا سے موسوم کرتے ہیں ورنہ حال اصل شئے ہے، اور کائنات واقعہ واحدہ ہے۔ یہ تغیرات یا تجدد امثال ہے اور اسی میں ہم مسلسل ارتقاء مشاہدہ کر رہے ہیں جس کی انتہا نہیں، کائنات کھلونا نہیں کہ بچوں کا دل بہلانے کے لئے بنا اور جب چاہا توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ یہی کائنات بیشمار تغیرات کے بعد ہم موجودہ صورت میں مشاہدہ کر رہے ہیں اور یہی ارض و سمٰوات قانون تجدد امثال کے تحت "غیر السمٰوات والارض" بدل کر ہو جائیں گے۔ ایک رباعی میں کہتا ہے کہ آفاق میں نظر کر "ہر روز قیامت است و ہر شب مردن" اس لئے وہ اس عقیدہ کا مضحکہ اڑاتا ہے کہ لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ قیامت وہ وقت ہے جب کل

کائنات فنا ہو جائے گی اور ایک ذات حق تعالےٰ کے سوا جیسی کہ وہ ازلی ہے اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ یہ عقیدہ اللہ تعالےٰ کی حکمتِ بالغہ اور صنعت کاملہ سے بہت بعید ہے کہ ایک شے بنائے اور اسے پھر معدوم کردے، پھر ایسی شے "عبث" ہوگی "باطل" ہوگی لیکن "ربنا ما خلقت ھذا باطلاً"، "باطل از باطل بروید حق زحق" ذات باری تعالےٰ حق ہے وہ حق پیدا کرتا ہے اللہ تعالےٰ باطل پیدا نہیں فرماتا، ارشاد قرآن بھی یہی ہے کہ باطل نہ تو کچھ پیدا کرسکتا ہے اور نہ پیدا شدہ کو دہرا سکتا ہے" (ما یبدی الباطل و ما یعید ۲۲: ۱۲) اللہ تعالےٰ نے کائنات خلق فرمائی تو یہ باطل نہیں اور اگر باطل ہوتی تو اس کی پیدائش ایک دفعہ ہی پیدا ہو کر ختم ہو جاتی، لیکن مشاہدہ ہو رہا ہے کہ یہ پیدائش تجدد امثال کے تحت ہر آن نئی صورت میں رونما ہوتی ہے۔

اسی تجدد امثال میں "خلق جدید" اور "قیامت" کا راز مضمر ہے۔ ایک رباعی میں بیدل کہتا ہے کہ لوگوں کا بھی عجیب حال ہے کہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ حق ہے اور ما سوائے جو کچھ ہے باطل ہے۔

آئینہ خلق طرفہ جوہر دارد
صورت دگر است و عرض دیگر دارد
می گویند او حق است و ما باطل محض
از باطل حرف حق کہ باور دارد

جب ہم باطل ہیں تو ہمارا قول بھی باطل ہے۔ اس لئے ہمارا یہ دعوےٰ کہ حق تعالےٰ کی ذات حق ہے قول باطل ہے، حق ہی حق پر شاہد ہے۔

مجاز اندیشیت فہم حقیقت را نمی شاید
محال است این کہ حق از عالم باطل شود پیدا

مجاز کا تصور حقیقت شناسی کے مناسب نہیں ہے، یہ ناممکن ہے کہ عالم باطل سے حق کا ظہور ہو، حق کا ظہور حق سے ہی ہوگا۔

چہ امکاں است گرد غیر ازیں منزل شود پیدا
ہماں لیلی شود بے پردہ تا محمل شود پیدا

یہ تو ممکن ہی نہیں کہ اس منزل وحدت پر غیر ناقہ سوار ہو اور "غبار غیریت" اُڑ رہا ہو اگر محمل نظر آ رہا ہے تو یہ سمجھو کہ وہی لیلی بے پردہ ہے یعنی ذات ہی جلوہ صفات میں رونما ہو رہی ہے۔

برون لفظ محال است جلوہ معنی
ہماں ز کسوت اسما طلب مسمیٰ را

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم حقیقت مجردہ یا لیلی کو بے پردہ نہیں دیکھ سکتے، یہ حسن صفات یا اسماء ہے یا استعارہ میں "محمل" ہے اسی میں لیلی بھی نظر آ رہی ہے، جیسے الفاظ کی صورت میں معنی۔

ندارد حسن یکتائی ز جیب غیر جوشیدن
حق از حق جلوہ گر شد باطل از باطل بروں آمد

یہ تشریح ذہن نشین کرنے کے بعد ماضی و حال و مستقبل اور دنیا و عقبیٰ اور دوزخ و بہشت پر بیدل کا نظریہ ملاحظہ ہو۔

ہوس چوں نارسا شد نسیہ نقد حال می گردد
امل را رشتہ کوتہ ساز و عقبیٰ گیر دنیا را

محض ہوس، آرزو، تمنا سے تو مدعا حاصل نہیں ہوتا، اور کبھی نہیں ہوتا اس لئے جب ہماری آرزو نارسا رہی یعنی مقصد حاصل نہ ہوا تو یہ کہہ کر دل کو طفل تسلی دی کہ دنیا میں نہیں تو عقبیٰ میں حاصل ہوگا۔ نقد حال بھی ادھار بن گیا۔ اگر تم نقد حال سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو تو اسی دنیا کو عقبیٰ فرض کر لو۔ اور عاقبت کی اُمید پر ادھار رکھا کر نہ بیٹھو۔

خلق در خاک انتظار صبح محشر می کشند،
زندگی با مردگاں در گور باہم رفتہ است

خلق مر کر بھی قبر میں صبح محشر کا انتظار کر رہی ہے۔ یہ سمجھنا چاہیئے جو لوگ مر گئے وہ زندگی کو بھی اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔ انتظار کسی شے کا زندگی کے ساتھ ہوتا ہے، حالانکہ موت وحیات دو متضاد امور ہیں اور اجتماع اضداد محال ہے۔

در کفن با قیست احرام قیامت بستنت
گر تو بنشستی نخواہد فتنہ ات از پا نشست

کفن اور احرام میں مشابہت ہے، عرفات کے میدان میں حج کی تقریب پر ایک ہی چادر میں ہر ایک شخص ملبوس ہوتا ہے، اسی طرح کفن کی صورت ہے، مر کر انسان قبر میں آسودہ رہتا ہے، مگر آسودگی کہاں یہ کفن جس میں کہ تو پڑا ہوا ہے گویا احرام ہے حج قیامت کا، تو خواہ بجائے خود آرام سے بیٹھ گیا ہے مگر یہ فتنہ قیامت کہاں چین سے تجھے بیٹھنے دیگا

تا دریں محفل تامل بر بساط حال ریخت
ساغر ماضی بگردش رنگ استقبال ریخت
ورنہ ایں جا حال کو مستقبل و ماضی کدام
قلقل وہمی است کز مینائی قیل و قال ریخت

اس محفل ہستی میں تذکر و تفکر ہی کا کرشمہ ہے کہ حالات جو ہم پر گزر چکے ہیں یا مشاہدہ کر چکے ہیں وہ ماضی سے موسوم کرتے ہیں یہی حالات و واقعات ہیں جن کا نشہ ساغر ماضی میں ہے اسی پیمانہ ماضی کی گردش سے نشہ مستقبل پیدا ہوتا ہے، یعنی حال یا واقعہ ایک ہی ہے، نشہ بادہ ایک ہی ہے۔ مگر ایک دو گردش میں نام مختلف ہو جاتے ہیں۔ ورنہ اس بزم ہستی میں حال اور ماضی اور مستقبل کہاں ہیں، محض نسبتی امور ہیں مینائی

قیل وقال سے قلقل وہم کا شور بلند ہو رہا ہے۔ یعنی فہم و تفہیم اور کہنے سننے میں یہ باتیں آ رہی ہیں۔ ورنہ زمان ومکان سب موہوم باتیں ہیں۔

در عدم نارفتہ نتواں بسوی ہستی یافتن
فرصت آں جا رفت و ایں جا طرح ماہ و سال ریخت

غور کرنا چاہیئے کہ حال میں جو فرصت ہمیں میسر ہے وہ تو ماضی میں معدوم اور مستقبل میں موہوم ہو کر رہ گئی۔ اس لئے ہستی جو فرصت ہی کا دوسرا نام ہے عدم میں چلی گئی اسے تلاش کرنا ہو تو عدم ہی میں ملے گی، لیکن ہم اسے ماہ وسال میں ماپ رہے ہیں جو گذر گئے یا آئندہ آنے والے ہیں۔ اس شعر میں بیدل نے ایک اور بات بھی پیدا کی ہے کہ جسے وجود حقیقی کہتے ہیں وہ اس بزم ہستی میں نہیں، تو عدم باش و جود ایں جا نیست، اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں اور مزید تشریح مناسب مقام پر کی جائے گی۔

کلفت فردا ہماں دی شمر آزادہ باش
آنچہ بتفصیل آں منظرے مجملیست

اس شعر میں بھی یہی واضح کیا گیا ہے کہ جسے تو "فردا" سمجھ رہا ہے وہ دراصل "دی" ہی ہے یعنی کل جو آنے والا ہے یا گزر چکا ہے ایک ہی شئے ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ جو گذر چکا وہ تو مفصل مشاہدہ کر چکا ہے اسی کا اجمال "فردا" ہے جس کلفت کا تو مفصل تجزیہ کر چکا ہے اب اس غلط فہمی میں نہ اُلجھ کہ وہی پھر آئندہ رونما ہو گی اس لئے خوش رہنا چاہیئے، کہ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت، لیکن تجھے جو کل کا غم کھائے جاتا ہے یہ محض وہم ہے۔

پیش ازاں کز وہم دی آئینہ زنگاری کند
در نظر ہا روشن است امروز فردائیکہ نیست

اس سے پیشتر کہ گزرے ہوئے کل کا وہم تیرے آئینہ خاطر کو مکدر

کرے، اسی آئینہ دیدہ و دل میں آج وہ حالات تجھ پر روشن ہیں جو "دی" یعنی ماضی میں محو ہو رہے ہیں، اور جوں جوں تجھ پر حال میں منکشف ہو رہے ہیں یہ سمجھ کہ تجھ پر فردا روشن ہو رہا ہے جو ماضی میں محو ہو گیا۔ اس لئے قطع نظر "دی و فردا" تجھے تو صرف حال ہی کا شعور ہے، اور جو حالات تجھ پر وارد ہو رہے ہیں وہ "فردا" سے آکر "دی" میں گم ہو جاتے ہیں، اس لئے "فردا" یعنی کل جو آنے والا ہے یہ سمجھ کہ حال میں محو ہو گیا اور اب فردا نیست ہے، تواہد امروز شدن آنچہ بفکرت فرداست۔

ہر جلوہ کہ در پیش است گردش تقفا دریاب
فردائی ایں عالم بے دینہ نمی باشد

ہر ایک جلوہ جو تیرے روبرو ہے یا پیش آنے والا ہے یہ سمجھ کہ گردش کرتا ہؤا تیرے پیچھے چلا جائے گا یعنی فردا "دی" ہو جائے گا۔ اس عالم ہستی میں کوئی "فردا" بغیر "دی" نہیں بلکہ فردا ہی دی ہے۔

ہر کجا رفتم ترفتم نیم گام از خود بروں
صد قیامت رفت و امروز مرا فردا نکرد

زمان و مکان، ماضی و مستقبل، غرض جو کچھ بھی مشاہدہ ہو رہا ہے، ہماری "خودی" کے ساتھ ہی ہو رہا ہے، اور یہ خودی ( ) کہیں ایک آدھ قدم نہ گئی نہ آئی۔ فردا حال اور حال ماضی میں بدلتا رہا اور ہم ویسے کے ویسے اپنی جگہ پر رہے۔ یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہئے کہ جسے فردا کہتے ہیں اس کا تصوّر تو محال ہے، ہم "ماضی" پر اسے قیاس کرتے ہیں جو گزشتہ "حال" ہے، لیکن جسے فردا خیال کرتے ہیں وہ حال ہی میں رونما ہوتا ہے تو اس کا شعور ہوتا ہے۔ اس لئے "خواہد امروز شدن آنچہ بفکرت فرداست"

ہر چہ آنجاست چو آنجا رسی ایں جا گردد
چہ خیال است کہ امروز تو فردا گردد

امروز و فردا کا نظریہ بیدل واضح کر چکا ہے، چونکہ امروز ہمیشہ امروز ہی رہے گا، اس لئے عقبیٰ جب وہ سامنے ہو تو دنیا ہی ہو گی۔ اس لئے بیدل کہتا ہے کہ دنیا ہو یا عقبیٰ دونوں کا تصوّر ہمارے ہی ذہن سے وابستہ ہے ہم نہ ہوں تو یہ بھی نہیں۔

آنسوی خویشت چہ عقبیٰ و چہ دنیا ہیچ نیست
بگذر از خود تا نگہ پیش بیں پیدا شود

بے کشمکشی نیست چہ دُنیا و چہ عقبیٰ
آہ از دل آزاد کہ خود را بچہا بست

دُنیا ہو یا عقبیٰ دونوں سے وابستگی ایک اُلجھن ہی ہے، آزادی اس طرح حاصل نہیں ہو سکتی کہ ہم ان سے اُلجھے رہیں۔

چہ دام است دُنیا چہ نام است عقبیٰ
تو معماری ایں خانہائے گماں را

دنیا کے دھندوں میں تو ہم پھنسے ہوئے ہیں "اور عقبیٰ کے نام کی رٹ لگا رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ "از ماست کہ بر ماست" اس خانہ وہم و گماں کے معمار ہم ہی ہیں، یہ سب ہمارے ہی تصوّرات ہیں، مقام تحقیق بھی یہی دُنیا ہے۔

ہر چہ دارد محفل تحقیق امروز است و بس
خاک بر فرق دو عالم دی و فردا کردہ اند

ایں ساز فتنہ کہ تو محشر شنیدہ — زیر و بم تو گر نہ بود غلغلش نیست

یہ شور محشر جو تو ساز فتنہ سے سن رہا ہے اگر تیری ہی مدھم اور پنچم سریں نہ ہوں تو اس کا غل بھی خاموش ہو جائے گا۔ یہ امر کہ بہشت کی نعمتیں اسی دُنیا کی نعمتوں کے تصوّرات ہیں، ایسا ہی ہے جیسے ماضی کے تصورات مستقبل ہیں۔

انتظار صبح محشر عالمی را خاک کرد
عمرہا رفت و ہمیں امروز و فردا می رود

بہشت و کوثر از حرص و ہوس لبریز می باشد
بعقبیٰ ہم رسیدم جز ہمیں دنیا نشد پیدا

ہم نے عقبیٰ کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہی حرص و ہوس دنیوی ہے جس سے بہشت معمور ہے اور کوثر پر ہے۔

حرص ہر سوی برد بر سیم و زر دارد نظر
زاہد از فردوس ہم مطلوب جز دنیا نداشت

جہاں حرص و ہوس سرگرم عمل ہو وہاں سیم و زر پر ہی نظر ہو گی۔ زاہد جو ترک دنیا اس اُمید پہ کرتا ہے کہ بہشت میں حور و قصور ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ دُنیا ہی کا طالب ہے۔

در مقامیکہ بود ترک و طلب امکانے
رو بدنیاست ہماں گرچہ ز دنیا گردد

جہاں کسی شے کا ترک یا طلب کرنا ممکن ہو تو خواہ ہم دُنیا ترک کر کے بہشت طلب کریں ہمارے مدِّ نظر دنیا ہی ہے اگرچہ ہم اپنے زعم میں اسے ترک کر رہے ہیں، لیکن بہشت کے نام پر طلب کر رہے ہیں۔ یہ کائنات عالم امکانات ہے ترک و طلب دونوں امور امکانی ہیں اس لئے ہم اس عالم امکانات میں ممکنات ہی کا تصور کر سکتے ہیں خواہ اسے دُنیا یا عقبیٰ کے نام سے تعبیر کریں۔

آں را کہ تو عقبیٰ شمری عقبیٰ نیست
یعنی جائے تقرب مولےٰ نیست

وصف جنّت شنیدۂ عبرت گیر
ہر جا زر و گوہر یست جز دنیا نیست

جسے تو عقبیٰ سمجھ رہا ہے وہ عقبیٰ نہیں ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے تقرب کا مقام نہیں، تو جنّت کی نعمتوں کا بیان تو سُنتا ہے۔ عبرت حاصل کر جہاں زرد گو ہر ہو وہ دنیا کے سوا اور کوئی جگہ نہیں۔ اس رباعی میں لفظ "عبرت" کے معنی گذر جانا، عبور کرنا۔ جب حافظہ کی مدد سے ہم گذشتہ واقعات کو دیدۂ تصور کے سامنے لاتے ہیں تو اسے اصطلاح میں "تذکر" کہتے ہیں۔ یعنی کسی واقعہ گذشتہ کی یاد، جب اس سے گذر کر تفکر کی طرف آرہے ہوں، تو اسے "عبرت" سے موسوم کرتے ہیں۔ یعنی تذکر سے عبور کر کے تفکر کی طرف آنا رباعی میں دونوں معنی ہیں کہ اگر تو تقرب الٰہی چاہتا ہے تو عقبیٰ کا جو تصور تیرے ذہن میں ہے اس سے گذر جا اور یہ کہ غور کرنا چاہیئے کہ یہ تصورِ عقبیٰ دنیا کی نعمتیں ہی ہیں اس لئے دنیا طلبی ہی ہے۔

بیا تا دی کنیم امروز فردائے قیامت را

کہ چشم خیرہ بینان تنگ دید آغوش رحمت را

زمین تا آسمان ایثار عام، آنگاہ نومیدی

بردیم از در باز کرم ایں گرد تہمت را

تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ظہور میں آئی ہے۔ اور "الرحمٰن" کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ مخلوق کو وہ کچھ دے جو اس کی زندگی کے قیام کے مناسب اور ضروری ہے۔ اور یہ سب کچھ بلا عمل منجانب مخلوق دیا اور دے رہا ہے البتہ "الرحیم" اعمال کا معاوضہ بھی دیتا ہے۔ ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ یہ جو کہتے ہیں کہ کل بروز قیامت اللہ تعالیٰ ان اعمال کی جزا دے گا جو ہم دنیا میں کر چکے ہیں" میں غنی ہوتا تو کب وعدۂ فردا کرتا"، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی رحمت عامہ سے جو تمام کائنات پر وسیع اور محیط ہے مایوس ہو چکے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ آج نہیں کل معاوضہ ملے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسے یہ خود خیرہ سر تنگ چشم ہیں

انھوں نے اللہ کی رحمت کو بھی ایسا ہی سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ہم "فردائی قیامت" کو گذرے ہوئے کل میں محو کردیں۔ اور یہ تہمت جو اللہ کے کرم کے دروازہ کو غبار آلود کر رہی ہے اس پر جھاڑو پھیر دیں۔

نومیدیم ستم کش خلد و جحیم نیست
آسودہ ام بخواب عدم زیں فسانہ ہا

امرا کو عموماً نیند کی شکایت رہتی ہے اور کم خوابی کی وجہ بھی یہ ہے کہ وہ تن آسانی کے دلدادہ محنت و مشقت سے جی چراتے ہیں۔ آرام سے جس شخص کی گزرے وہ آخر بے آرام ہی ہوتا ہے، مزدور دن بھر کی محنت کے بعد میٹھی نیند سوتا ہے۔ اُمراء نے خواب آور تدبیر یہ نکالی کہ فسانہ سُنتے اور ان کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے "افسانہ گو" جماعت بھی پیدا ہو گئی۔ فسانہ سُنتے سُنتے امراء کو نیند آجاتی۔ اس لئے فارسی اور اُردو علم ادب میں فسانہ اور خواب کو ایک دوسرے سے نسبت دی گئی۔ مطلب شعر یہ ہے کہ میں بہشت اور دوزخ کے فسانے سُنتا سُنتا خواب عدم میں آسودہ ہوں۔

عالمے را سر گزشت رفتگاں از کار برد
ہر کجا افسانہ باشد ہیچ کس بیدار نیست

ایک دُنیا کو گذرے ہوئے لوگوں کے قصوں نے بیکار بنا رکھا ہے۔ بات یہ ہے جہاں کہیں افسانہ گوئی ہے وہاں کوئی شخص بیدار نہیں ہوتا۔ فسانہ ہے ہی خواب آور، شعر محولہ بالا میں یہ اشارہ ہے کہ بہشت اور دوزخ کی کہانیاں ہی ایسی خواب آور ہیں کہ میں فسانے سُنتے سنتے خواب عدم میں نہایت آسودہ ہوں۔ اس لئے میری نومیدی خلد و جحیم اور اُمید و بیم سے بے نیاز ہے۔ غالب کہتا ہے کہ

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

آنسوی خوف و رجا خلد یقین پیدا کنید
ورنہ ایمانیکہ مشہور است جز اعراف نیست

اُمید و بیم جہاں ہو وہ یقین کا بہشت نہیں، بہشت اطمینان قلب کا نام ہے، اس لئے یقین یا ایمان جو مشہور ہے وہ "اعراف" میں ہے یعنی اُمید و بیم کے درمیان، اور یہ خلد یقین ہے اعراف کے معنی معرفت کا مقام۔

طبعیکہ اُمیدش اثر آمادۂ بیم ست
گر خود ہمہ فردوس بود ننگ جحیم ست

"اُمید و بیم" دو متضاد ممکن امور ہیں۔ ایک کا تصوّر دوسرے کی تصدیق ہے۔ اس لئے جس دل میں اُمید ہے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ "بیم" کا اثر قبول کرنے پر آمادہ ہو۔ اس لئے تو وہ سراسر فردوس ہو ننگ دوزخ ہے۔

طالب ویرانہا غیر جنونت کہ کرد
آنچہ تو خواندی بہشت خانہ بے آدمی ست

اگر تجھے صحرانوردی کا شوق دامن گیر ہے تو ظاہر ہے کہ تیرے سر پر وحشت سوار ہے۔ جسے تو بہشت سے موسوم کر رہا ہے "خانہ بے آدمی ہے۔ اگر آدم کے رہنے کی جگہ مناسب ہوتی تو آج وہاں آدم ہوتا مگر روایت یہ ہے کہ وہاں سے نکل آیا اور اب یہ خانہ بے آدمی ویرانہ ہے اگر اب بھی تجھے اس کی طلب ہے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ "ظلوم و جہول" کا مخاطب تو ہی ہے۔

ہیچ دانا نزند تیشہ بپائے آرام
از بہشت آنکہ بروں آمدہ آدم نیست

یہ تو ظاہر ہے کہ بہشت "خانہ بے آدمی" ہے اور اگر یہ جائے آرام آسائش ہوتی تو یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ انسان اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارے اور آرام چھوڑ کر تکلیف برداشت کرے۔ اس لئے معلوم ہُوا کہ جس نے بہشت چھوڑا وہ آدمی نہ تھا۔ کیونکہ آدمی کی واحد امتیازی خوبی یہی عقل ہے وہ کوئی ظلوم و جہول ہی ہوگا جس کو بہشت ملی اور ترک کی۔

عافیت دور است از نقش بنای محرمی
خون بود رنگے کز و تصویر انساں می شود

در خیال آباد راحت آگہی نامحرم است
جلوہ نماید بہشت آنجا کہ جنس آدم است

یہی تخیل اس شعر میں بھی ہے کہ:۔

راحت دریں قلمرو از آثار ہوش نیست
خوابیدہ است اگر کسے آرام داشتہ است

یہ ظاہر ہے کہ ہوش و حواس کے ساتھ جسے راحت کہتے ہیں وہ میسر نہیں، جو سویا ہُوا ہے وہی آرام میں ہے۔ یعنی غفلت میں ہی راحت ہے۔ اہل عقل و ہوش کے لئے آرام و آسائش نہیں بہشت جائے راحت ہے اور یہ معلوم ہی ہے کہ اس قیام راحت میں آدم کا قیام نہیں۔ اس لئے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جہاں آرام ہے وہاں بہشت نہیں۔ آدم تو طبعاً مفسد اور خونریز واقع ہُوا ہے اس سے یہ کب توقع ہو سکتی ہے کہ راحت و آرام و آسائش سے روشناس ہو، شکست عافیت آہنگ گردید بہر جا ساز آدم آفریدند۔

اے فضول وہم عقبیٰ آدم از جنّت چہ دید
عبرتست آنجا کہ صاحب خانہ مہماں می شود

تجھے عالم اوہام میں عقبیٰ اور بہشت کے حور وقصور کے نظارے دکھائی دیتے ہیں۔ اتنا تو سمجھنا چاہئے کہ جد امجد آدم نے جنت میں کیا دیکھا اور کیا پایا؟ وہ بہشت سے بے آبرو ہوکر نکلے۔ ایسی جگہ جہاں صاحب خانہ خود مہمان کی حیثیت رکھتا ہو جائے عبرت ہے نہ جائے قیام۔

دلت بعشوہ عقبیٰ خوش است، ازیں غافل
کہ ہر کجا توئی آنجا بغیر دنیا نیست

دل کے خوش رکھنے کو یہ خیال اچھا تو ہے کہ عقبیٰ بھی ہے لیکن تو یہ حقیقت نہیں سمجھ سکتا کہ جہاں تو ہے وہاں دنیا کے سوا اور کوئی مقام نہیں۔

بیروں نتاختہ است ازیں عرصہ ہیچ کس
وامانہ نیست اینکہ تو گوئی فلاں گذشت

زیں خاکداں کہ دامن دلہا گرفتہ است
خلقی زخویش رفت و بجائے دگر نرفت

اس زمین نے ہمارے دلوں کو کچھ ایسا اُلجھا رکھا ہے کہ لوگ اپنے آپ سے گزر رہے ہیں یعنی مر رہے ہیں مگر کسی دوسری جگہ جانے کا نام نہیں لیتے۔ یعنی اس کرۂ ارض سے کوئی آج تک باہر نہیں گیا، جیسے ہم کہتے ہیں گزر گیا وہ کسی اور جگہ نہیں گیا، اسی جگہ پڑا جان ہے۔

در حقّے کہ وعدہ نعمت شنیدہ ئ   آدم کجاست اکثر سکانش احمق اند

وہ جنت جس کا وعدہ نعمت تو سن چکا ہے وہاں آدم کہاں ہے جو صاحب عقل وشعور ہے وہاں تو اکثر احمقوں کا ڈیرا ہے یہ اشارہ حدیث شریف "اکثر اھل الجنۃ بلھم" کی طرف ہے۔

گویند بہشت جائے نوبیست آنجا ہم اگر دماغ باشد

(۶) تجدد امثال کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ عالم ہر آن بدلتا ہے، چونکہ ہستی میں تکرار نہیں اور کسی شے کو ایک حالت پر قیام نہیں اس مشاہدہ کی "فرصت" بھی ہمیں میسر نہیں، جب ہم ایک شے کو دیکھتے ہیں تو آنکھ کی جھپک میں یہ شے ہزاروں رنگ بدل چکی ہے۔ اس لئے بیدل فرصت کا رونا روتا ہے کہ:

رمیدہ است چو نرگس درین تماشا گاہ
ہزار چشم ویکے را نصیب دیدن نیست

علامہ اقبال مرحوم نے بھی اس تخیل کو ان لفظوں میں ادا کیا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

لیکن بیدل کچھ اور بات کہتا ہے کہ نہیں با وجود تو بصیرت بصیرت اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ کسی شے کو آنکھ بھر کر دیکھ سکیں، اس لئے کہتا ہے کہ

من نمی گویم زیاں کن یا بفکر سود باش
اے زفرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

میں یہ نہیں کہتا کہ تو گھاٹے میں رہے یا فائدہ کی فکر میں وقت فرصت ضائع کرے جو کچھ تو نے کرنا ہے کر گذر، کیونکہ یہ وقت فرصت

جو تجھے میسر ہے پھر نہیں ملے گا۔

بزم تجدید است ایں جا فرصت تحقیق کو
من منی دارم کہ تا دا میرسم او می شود

اس بزم تجدد امثال میں فرصت تحقیق میسر نہیں، میں جانتا ہوں کہ "میں ہوں" جب "انانیت" (   ) کی تحقیق کے لئے اس کے قریب جاتا ہوں تو "انانیت" اتنے عرصہ میں "او می شود" میرا تصور "خودی" محو ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ کسی اور کا تصور جگہ لے لیتا ہے۔

زعرض شبہ تہی نیست نسخہ تحقیق
تو آنچہ کردۂ از خویش انتخاب شک است

کسی شے کی تحقیق تو اس وقت تک ہو سکتی ہے جب ہم اس شے کو جیسی کہ ہے مشاہدہ کریں مگر یہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلے تو تحقیق مشکل ہے۔ اس لئے جب ہم اس شے کو جیسی کہ ہے مشاہدہ کریں مگر جب یہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلے تو تحقیق مشکل ہے۔ اس لئے جسے ہم تحقیق کہتے ہیں وہ دراصل "شبہ" ہے۔ اس شعر میں لفظ "شبہ" نہایت موزوں واقع ہوا ہے "شبہ" اور "شبیہ" اور "مشابہت" دو اشیاء میں ہوتی ہے، چونکہ تجددِ امثال بدل رہی ہیں اس لئے ہر ایک مثل پہلی اور دوسری کی شبیہ ہے اور امثال میں مشابہت ہے۔ ہم ایک مثل کو دوسری مثل پر قیاس کرتے ہیں اور اسے تحقیق سے موسوم کرتے ہیں۔

تا تجدد جلوہ دارد شبہ معنی بجا ست
کس چہ فہمید زیں عبارتہا یکے مانوس نیست

تا دم زنی چو آئینہ گرداندہ است رنگ
این کارگاہ جلوہ چہ مقدار نازکست

آئینہ میں "تمثال" ہی مشاہدہ ہوتی ہے۔ ایک سانس کے وقفہ میں یہ تمثال بھی اپنا رنگ بدل چکتی ہے۔ اس شعر کی لطافت اس حقیقت میں ہے کہ اگر ہم آئینہ پر پھونکیں تو اس کی سطح پر ایک تہ بخارات کی جم جائیگی، جو ہمارے سانس کیساتھ پیدا ہوتے ہیں بلکہ سانس بھی بخارات ہیں۔ اس حالت میں آئینہ مکدر ہو جائے گا اور عکس بھی مدہم پڑ جائے گا۔ "دم زدن" محاورہ ہے۔ اُردو میں بھی ہم "دم مارنا" کہتے ہیں۔ جو دراصل فارسی ہی کا ترجمہ ہے۔ ہم محاورہ میں کہتے ہیں کہ "کس کو دم مارنے کی مجال ہے" یعنی کس کی جرأت ہے کہ بول سکے۔ اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ یہ "کارگاہ جلوہ" اتنا لطیف ہے کہ آئینہ کی طرح تجھے اس کے سامنے سانس لینے کی فرصت نہیں تو نے سانس لیا اور اس کا رنگ بدل گیا۔

نزاکت ہاست در آغوش میناخانہ حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشا را

نیز:-

چشمیکہ کشائی بہ تامل بکشا   تا از مژہ رنگ جلوہ پا نخورد

ذرا احتیاط کے ساتھ آنکھ کھول ایسا نہ ہو کہ رنگ جلوہ کو مژہ کی ٹھوکر لگے۔ کتنا نازک خیال ہے!

نگہ ہرسو رود، چو شبنم، ز شرم باید آب گردد
اگر بداند کہ بے محابا بجلوہ گاہ کہ می خرامد

نگاہ ہر طرف بے لگام پھر رہی ہے اگر اسے یہ معلوم ہو کہ کس کے

جلوہ گاہ میں بے ادب خرام کر رہی ہے تو شبنم کی طرح مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتی۔ ارشاد قرآن بھی یہی ہے کہ "کتنی آیات ہیں جن پر یہ غافل یونہی گزر جاتے ہیں۔

بستۂ احرام صد عقبیٰ امل اما چہ سود
فرصت نگذشتہ ات پیش گذشتن ہا گذشت

تو نے سینکڑوں عقبیٰ کی توقعات کا احرام باندھا ہوا ہے لیکن کیا فائدہ، تیری فرصت کے لمحات جو ابھی گزرنے باقی تھے ان دور از کار توقعات کی انجمن میں گذرنے سے پہلے ہی گزر گئے۔ "احرام" حج کی تقریب پر باندھا جاتا ہے، اور یہ ایک ہی چادر ہوتی ہے، اور کفن کی بھی ایک چادر ہوتی ہے، تو نے احرام کفن اس توقع پر باندھا کہ عقبیٰ کا حج نصیب ہو گا مگر وہ تو نہ ہوا اور حج عقبیٰ کے ایام گزر گئے تو نے فرصت کا وقت احرام باندھنے میں ضائع ہی کر دیا۔ یعنی تو عقبیٰ میں کبھی نہ پہنچے گا۔

بہر چہ وارسی از خود گذشتنی دارد
بہوش باش کہ امروز رفت فردا نیست

تو جس چیز کے پاس پہنچنا چاہتا ہے وہ تو خود گزر رہی ہے، اسیطرح فردا تو کبھی نہ دیکھے گا۔ البتہ اس توقع میں "امروز" کی فرصت بھی تو ہاتھ سے کھو دے گا۔ امروز تو گیا مگر فردا بھی اسی طرح امروز بن کر گذر جائیگا۔

انتباہ شاید بعض حضرات کے دل میں یہ وسوسہ ہو کہ بیدل بھی "دہریہ" ہے کہ عقبیٰ اور حشر و نشر و بہشت و دوزخ کا منکر ہے۔ بیدل منکر نہیں۔ لیکن ان اصطلاحات کی جو قرآن میں مذکور ہیں

اپنے فہم کے مطابق تاویل کرتا ہے، یہ ایک فقہی مسئلہ ہے کہ قرآن کی کسی ایک آیت کا منکر کافر ہے۔ لیکن جو تاویل کرتا ہے وہ منکر نہیں، البتہ اس کا مطلب وہ وہ سمجھتا ہے جو عام عقیدہ کے خلاف ہے۔ اس لئے بیدل صحیح کہتا ہے کہ ہر ایک محقق کی تحقیق اس کی اپنی حدِ نظر ہے، بات بھی یہی ہے کہ ہر کس و ناکس غزالی اور رازی، بوعلی سینا اور فارابی نہیں، ذہنی درجات بلند و پست ہوتے ہیں۔ قرآن "بلاغ" اور "بلیغ" کلام ہے جو ہر ایک زمانہ کے ذہن بلند و پست تک رسا ہے۔ بیدل کا جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں حیات بعد ممات پر ایمان ہے، وہ زندگی ایک "واقعہ واحدہ" یا ایک مسلسل واقعہ سمجھتا ہے۔ تجدد امثال کے تحت جو کچھ تغیر مشاہدہ ہو رہے ہیں یا ہونگے وہی دُنیا و عقبیٰ وغیرہ سے تعبیر ہوتے ہیں اس لئے یہ ایک لفظی بحث ہے، مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ نظریہ میں بہت اختلاف ہے جس کا اثر عقائد پر بھی پڑتا ہے، عقائد کا اختلاف صرف "فروع" میں ہے۔ اصول میں نہ اختلاف ہے اور نہ مسلمانوں کے کسی فرقہ میں ایسا اختلاف ہے۔ ہم بیدل کے مذہب پر بحث کر چکے ہیں، اس کے مطالعہ کے بعد کوئی شخص محض اختلاف عقائد کی وجہ سے بیدل کو خارج اسلام نہیں کہے گا۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر یہ بھی واضح کیا جائے کہ جسے ہم عقبیٰ سے موسوم کرتے ہیں اس کا صحیح تصوّر ہمارے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ صرف موجودہ حالات پر قیاس کر سکتے ہیں اور قرآن میں بھی ہمیں اسی طرح سمجھایا گیا ہے کہ فرض کرو وہاں دودھ ہوگا مگر اس کا رنگ اور ذائقہ نہیں بدلے گا۔ اس مثال سے ایک کیفیت تو ذہن میں آتی ہے کہ وہ عالم کیسا ہوگا۔ لیکن جو شے ہمارے محسوسات سے بالاتر یا باہر ہے اس کا

تصوّر ہم نہیں کر سکتے۔

اس میں کچھ قباحت نہیں کہ ہم بحوالہ آیات قرآن واضح کریں کہ یہ دنیوی زندگی بھی جنّت کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکتی ہے اگر ہم اسے اپنے اعمال سے جہنّم نہ بنائیں۔ اور یہ کہ جس جنّت کا وعدہ اصحاب رسول کریم اور اہلِ ایمان سے کیا گیا تھا اس کا ایک حصّہ دنیوی جنّت بھی تھی اور ہے، اگرچہ آخرت کی نعمت بدرجہا بہتر ہے۔ الفاظ جنّت اور فردوس اور عدن اور بحرین عموماً آیات قرآں میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے علماء نے کبھی ان الفاظ کا مفہوم سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ یہی سمجھے کہ ان سے مراد عقبیٰ کے مقامات ہیں جہاں ہر ایک قسم کی نعمت موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں جنّت کا مذکور ہے وہاں انہار جاری ہیں اور باغات ہیں اور مساکن طیبہ ہیں اس سے مراد ارضی جنّت ملک شام [illegible] اور یہی الفاظ توراۃ میں بھی استعمال ہوئے ہیں اور اسی ارضی جنّت کا وعدہ ذرّیت ابراہیم بنی اسرائیل و بنی اسماعیل سے کیا گیا تھا۔ بنی اسرائیل کو تو صرف ملک شام ہی ملا۔ بنی اسماعیل کو مصر کی فراوانی، عراق اور ایران کی دولت و ثروت بھی ملی۔" لفظ فردوس" عربی نہیں، پارسی ہے۔ اور پارسیوں کی مقدّس کتاب "ژنداوستا" کے حصّہ "وندیداد" میں یہ لفظ "پریزیدہ" استعمال ہُوا ہے۔ مراد شاہانِ فارس کے خیابان ہیں، جب یہ لفظ یونان میں گیا تو یونانی زبان میں "پیراڈائس" ہو گیا۔ عبرانی اور عربی میں "فردوس" ہُوا۔ "عدن" بھی عربی لفظ نہیں۔ یہ "سمری" زبان کا لفظ ہے اور سمری قوم عراق میں آباد تھی۔ اس لفظ کا مفہوم وہ سبزہ زار ہے جو دریا کے کناروں پہ ہوتا ہے۔ "بحرین" عرب کا انتہائی جنوب مشرقی کونہ ہے،

یہ ایک جزیرہ ہے۔ اس کا مذکور سورہ "رحمٰن" میں ہے، یہاں دو دریا یا بحر کا اجتماع اب بھی ہے، اوپر کی سطح پر آب شور ہے اور دو تین گز نیچے آبِ فرات یعنی آبِ شیریں ہے۔ جزیرہ کے لوگ غوطہ لگا کر میٹھے پانی سے مشکیزے بھر لیتے اور یہی پانی پینے کے کام آتا۔ جزیرہ میں جب سے "پٹرول" دریافت ہوا تو چاہات بھی احداث کئے گئے، اس سے پیشتر لوگ میٹھا پانی بحر ہی سے نکالتے، بعض اوقات میٹھا پانی سطح پر بھی آجاتا ہے۔ "مجمع البحرین" موتیوں کی برآمد کے لئے بھی مشہور ہے۔ یہاں کے موتی نہایت خوشنما آبدار ہوتے ہیں۔ قرآن میں ان الفاظ کا استعمال بطور پیش گوئی استعمال ہوا ہے کہ یہ مقامات جس کی زبانوں کے یہ الفاظ ہیں اہلِ ایمان کو عطا ہونگے۔ اور رہوئے۔ اور اب بھی مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں مگر بہشت میں رہتے ہوئے جہنمی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس تحقیق کی تائید میں آیات قرآن میں ارشاد ہے کہ

قلنا یا آدم اسکن انت و زوجك الجنة۔

ہم نے فرمایا کہ اے آدم تو اور تیری زوجہ اس جنّت میں رہو۔

ظاہر ہے کہ اس ارشاد الٰہی کا خطاب آدم خاکی اور اس کی زوجہ کو ہے۔ اس لئے یہ جنّت جہاں آدم اور اس کی زوجہ کی سکونت تھی۔ مادی جنّت ہی ہو سکتی ہے، اور مادی کائنات سے باہر متصوّر نہیں ہو سکتی، زمین کی پیداوار ہی کا مذکور قرآن میں ہے کہ وجعلنا فیھا جنت من نخیل واعناب وفجرنا فیھا من العیون لیاکلوا من ثمرہ۔ (۲۳ : ۲) توراۃ میں بھی انہی ارضی نعمتوں کا مذکور ہے جو بنی اسرائیل کو ارضِ شام میں ملیں (مثانی باب ۸) میں انہی چشموں اور ندیوں

اور وادیوں اور پہاڑوں اور گندم اور جو اور انگور اور انجیر اور انار اور زیتون اور شہد اور ان کی فراوانی کے ذکر کے بعد لکھا ہے کہ وہ تجھے کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہوگی۔ (فیہا ما یشاؤن)

جس قوم سے یہ ارضی جنت ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے چھین لی گئی ان کی نسبت ارشاد ہے کہ:۔

کم ترکوا من جنت وعیون وزروع ومقام کریم
ونعمۃ کانوا فکہین۔ (۱۴:۲۵)

کتنے باغات اور چشمے انھوں نے چھوڑے اور غلّہ کے کھیت اور نفیس مقام اور نعمتیں جن میں وہ خوش و خرم تھے، ایسا ہی ہُوا اور ہم نے یہی کچھ دوسری قوم کو میراث میں دیدیا۔

آدم کو اسی دنیا میں پیدا کیا گیا اور اسی دُنیا میں اس نے رہنا ہے اور رہنا ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ جس غرض کے لئے اسے یہاں رکھا گیا ہے وہ پوری ہو۔ کیا اچھا شیخ سعدی نے فرمایا ہے کہ

تو کارِ زمیں را نکو ساختی   کہ با آسماں نیز پرداختی

اللہ تعالےٰ نفس مطمئنہ کو مخاطب فرماتا ہے کہ

یایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ
فادخلی فی عبدی، وادخلی جنتی۔ (۱۲:۳۰)

اے اطمینان یافتہ نفس انسانی اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی، پس میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو۔

ظاہر ہے کہ مقام راحت اور امن اطمینان "قلب" ہی ہے۔ اگر یہ نہ

ہو تو سب نعمتیں بدمزہ ہیں۔ اہلِ جنّت وہ ہیں کہ "لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون" جنھیں نہ کسی بات کا خوف نہ دھڑکا اور نہ حزن و غم، غرض بالکل مطمئن ہیں۔ آسودگی پر جو کچھ بیدل نے لکھا ہے کہ حالت یہ ہے کہ دنیا الم غفلت و عقبیٰ غم اعمال آسودگی از دو جہاں فاصلہ دارد

خاطرت چو از جمع شد از ہر دو عالم فارغی
قطرہ دارے چوں گہر زیں بحرِ بے پایاں بر آ

جب تجھے "اطمینان قلب" حاصل ہو گیا تو دونوں جہانوں سے بے نیاز ہو گیا۔ بحر قطروں کا مجموعہ ہے یعنی یہ عالم کثرت ہے تو اسی حالت میں باہر آسکتا ہے جب گوہر کی طرح اپنے آپ میں جمع ہو کر یا جمعیت دل حاصل کر کے بحر سے باہر آسکتا ہے، بلکہ بحر میں رہتے ہوئے بھی اس سے جُدا ہے اور موج حوادث سے نہ تجھے کچھ خوف ہے نہ غم۔

لیکن بیدل کے نظریۂ "بہشت" میں کچھ اور بات بھی ہے۔ یہ کائنات خواہ "دردِ سر" ہو یا "دردِ جگر" بہشت کی بہت بڑی نعمت یہی "دردِ دل" ہے۔

گویند بہشت است ہماں راحت جاوید
جائیکہ بداغی نہ طپد دل چہ مقام است

کہتے ہیں کہ بہشت دائمی راحت کا مقام ہے ایسی جگہ جہاں داغ سے دل میں طپش پیدا نہ ہو وہ کیسا مقام ہو سکتا ہے۔ ایک مطلع ہے کہ

مدعا از ہستی ما بس ہمیں آزاد بود
ورنہ در کنج عدم آسودگی بسیار بود

دائمی راحت "عدم" کے مترادف ہے، زندگی تو جد و جہد میں

ہے جو اسی کرۂ ارض پر ہے۔

زمیں گیری برنگ سایہ باید مغتنم دیدن
چہ خواہی دید اگر در خانۂ خورشید خوانندت

اس لئے بہشت راحت جاوید ہے تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔

درد عشق و مژدہ راحت زہے فکر محال
ایں خبر یا رب کہ ایں بے خبر آوردہ است

درد عشق ہو اور عاشق کو راحت کی خوشخبری سنائی جائے یہ تو فکر محال ہے، وہ کون ہے جو یہ خبر لایا ہے۔

زہد و تقوی ہم خوش است اما تکلف برطرف
درد دل پروردہ ام درد سرے درکار نیست

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی
(غالب)

اس کائنات کو "مادی" کہو جیسے کہ مادہ پرست کہتے ہیں، یا خیالی صورتیں کہو جیسے کہ "ائیڈیلسٹ" کہتے ہیں، حقیقت پرست کے نزدیک یہ صرف لفظی بحث ہے اور محققین کی اپنی حد نظر ہے اور صداقت سے خالی نہیں تمثال یا عکس یا سایہ یا ظل ایک ہی معنی ہیں، چونکہ تمثال آئینہ میں رونما ہوتی ہے اس لئے "آئینہ" پر جو کچھ بیدل نے لکھا ہے وہ آج تک کسی شاعر نے اس شرح و بسط سے نہیں لکھا

خورشید ز ظلمت کدہ سایہ بروں است
تا کے ز حدوث آئینہ سازید قدم را

حادث وہ شے ہے جو پیدا شدہ ہو یہ کائنات حادث اور مخلوق ہے

اس میں اگر "قدیم" کی ظل یا سایہ بھی مشاہدہ ہو تو ظاہر ہے کہ آفتاب حقیقت جو قدیم ہے آئینہ کائنات میں پرتو فگن ہو تو یہ عکس تو آفتاب نہیں ہے آفتاب آئینہ اور عکس سے باہر اور جُدا ہے۔ یعنی حادث قدیم نہیں ہو سکتا۔

ہمہ بشوخی تمثال چشم باختہ ایم
وگرنہ حسن بروں از کنار آئینہ است

بغیر عکس ندانم دگر چہ خواہی دید
اگر در آئینہ بینی جمال یکتا را

میں نہیں جانتا کہ تو اگر آئینہ میں ذات یکتا کا حُسن مشاہدہ کرے تو عکس کے سوا اور کیا دیکھے گا، اور وہ عکس سے باہر اور جُدا ہے۔

درخلوت دل از تو تسلّی نتواں یافت
جزاینکہ در آئینہ تواں دید مثال است

"خلوت"، وہ یکسوئی ہے جہاں دوسرا نہ ہو۔ گوشہ دل میں بھی خلوت کا مقام نہیں کہ اطمینان سے ہم تجھے دیکھ سکیں یعنی آئینہ دل کو کثرت کے نقوش محو کرنے کے بعد بھی وہ خلوت حاصل نہ ہوئی کہ جلوہ وحدت رونما ہوتا۔ اس آئینہ میں اگر کچھ دیکھنا ممکن ہُوا تو وہ "مثال" تھی نہ کہ خود حقیقت۔

کس دل کو دعوےٰ ہے کہ حقیقت پرست ہے
آئینہ بھی اگر ہے تو صورت پرست ہے

تا کجے نازی بحسن عاریت ما و من آئینہ داری بیش نیست

تو کب تک ایسے حُسن پر ناز کرتا رہے گا جو عاریت ہے، ہم تم تو

صرف آئینہ دار ہیں جس میں عکس ایک حقیقت کا پڑتا ہے جو ہم سے باہر اور جُدا ہے۔ اس آئینہ میں ہم نے حسن کا عکس عاریت لیا ہوا ہے یا دیا گیا ہے۔

دلت مقابل و آنگاہ عرض یکتائی
ثبوت وحدت و آئینہ خانہ بوالعجبیت

(۷) تجدد امثال کا ایک اہم دور رس نتیجہ یہ ہے کہ ہم صرف "امثال" محسوس کر رہے ہیں، "حقیقت" کی طرف یہ امثال ضرور اشارہ کرتی ہیں اور ہم اتنا ہی سمجھ سکتے ہیں کہ "ہست"

پیش بینان بارگاہِ الست   پیش ازیں رہ نبردہ اند کہ ہست

(سعدیؒ)

"امثال" محض صورتیں ہیں اور ہر آن بدلتی ہیں۔ اس لئے اگر انھیں موہوم کہا جائے تو کچھ قباحت نہیں، "حقیقت واحدہ" ہے اور وہی تمام صورتوں میں رونما ہو رہی ہے۔ انسان بے کسوت عبارت معنی شناس نہیں ہو سکتا اور اسما کے پردہ ہی میں مسمی کی ہستی کا احساس ممکن ہے اگرچہ ہم اس کی "کنہ" کو نہیں پہنچ سکتے۔ بیدل ایک رباعی میں کہتا ہے کہ :-

آں جلوہ بے نشاں کہ نے رنگ و نہ بوست
پیدائی و پنہائی او حرف مگوست
پنہاں ز انسانکہ آنچہ اندیشی نیست
پیدا چندانکہ ہرچہ بینی ہمہ اوست

چونکہ حقیقت بذاتہ صورتوں سے معرا ہے اور ہم اسے کسی صورت سے مشخص و معین نہیں کر سکتے اس لئے لا تدرکہ الابصار و ھو یدرک

الابصار، وھو اللطیف الخبیر۔ (۱۰۳:۶) مولانا رومی بھی یہی کہتے ہیں کہ "آنچہ در اندیشہ ناید آن خدا ست" لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ "پیدا چنداں کہ ہر چہ بینی ہمہ اوست" جب وہی اول اور وہی آخر اور وہی ظاہر اور وہی باطن ہے، تو اول و آخر و ظاہر و باطن کے علاوہ اور کیا ہے جہاں اس کے غیر کی گنجائش ہو۔

سواد نسخہ تحقیق بیدل دقتے دارد
دو عالم جلوہ باید خواندن بے رنگ فہمیدن

دو عالم یعنی "دوئی" سے مراد عالم کثرت ہے اور کثرت اختلاف لازم و ملزوم ہیں۔ یہ کثرت اور اختلاف اور اس کی رنگینی غرض سب کچھ ایک جلوہ ذات احد ہے جو خود بیرنگ ہے۔

عالم ہمہ یک جلوۂ ذات احد است
ایں جا نہ ہیولیٰ نہ صورت بجسد است
کثرت آثار چشم واکردن است
ایں صفر چو محو شد ہماں یک عدد است

بیدل کے شاعرانہ تخیل نے ایک سادہ امر واقعہ میں بھی ایک لطف پیدا کر دیا ہے۔ آنکھ کی صورت بھی صفر کے مشابہ ہے، ایک پر صفر زیادہ کرتے جاؤ تو دس اور سو اور ہزار تا لاتعداد ہو جائیں گے۔ جب ہم آنکھ کھولتے ہیں تو چونکہ آنکھ خود صفر ہے۔ یہ صفر بھی ہم ہر طرف مشاہدہ کرتے ہیں اور یہی وحدت کو کثرت میں دکھا رہا ہے۔ اب آنکھ بند کر لو تو یہ صفر سب محو ہو جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ کثرت ہمارے حواس محسوس کر رہے ہیں۔

چشم بند و گوش بند و لب ببند
گر نہ بینی نورِ حق بر ما بخند

مدعا دل بود اگر نیرنگ امکاں ریختند
بہر ایں یک قطرہ خوں صد رنگ طوفاں ریختند

سیرِ دل

"بیدل" نے جو کچھ "تجدد امثال" پر لکھا ہے وہ بیانِ حقائق ہے اور تصویر کے دونوں رُخ اس نے پیش کر دیئے ہیں۔ ایک روشن ہے اور دوسرا تاریک، تصویر کے خط و خال نمایاں نہیں ہو سکتے اگر روشن طرف کے ساتھ سایہ نہ ہو۔ تصوف میں ایک فریق کی نظر اسی سایہ پر رہتی ہے، ان کے کلام میں فرسودگی اور مایوسی نمایاں ہے، بقول علامہ اقبال یہ فرسودگی غالب کے کلام میں بھی ہے، لیکن بیدل طبیعت میں ایک حرارت اور حرکت پیدا کرتا ہے، وہ فلسفہ آزار بیان کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ ہماری زندگی کا یہ منشا ہے اور "لیس للانسان الا ما سعیٰ" اور سعی اور آزار لازم و ملزوم ہیں۔

مدعا از ہستی ما بس ہمیں آزار بود
ورنہ در کنج عدم آسودگی بسیار بود

جب ہماری زندگی اسی شے کا تقاضہ کرتی ہے تو اس تقاضہ کو پورا کرنا چاہیئے، سکون و راحت تو عدم ہی کے مناسب ہے اس لئے اگر تم اس کے طالب ہو تو "موت کی تمنّا کرو"۔ بیدل تو اس بہشت کو بھی پسند نہیں کرتا جسے بے خبر لوگ مقامِ راحت کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ

گویند بہشت است ہماں راحت جاوید
جائیکہ بداغی نہ طپد دل چہ مقام است

اور اکثر اشعار میں اشارہ کرتا ہے کہ گر آدم کے مناسب راحت طلبی

ہوتی تو وہ بہشت کو چھوڑتا ہی کیوں؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جسے راحت کہتے ہیں وہ آدم کی فطرت کے نامناسب ہے "جلوہ نماید بہشت آنجا کہ جنس آدم است"۔ اور صاف صاف لفظوں میں تلخ حقیقت بیان کرتا ہے کہ:۔

عافیت دوراست از نقش بنائے محرمی
خوں بود رنگے کزو تصویر انساں می شود

اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ اگر ان تلخ حقائق کی تلخی محسوس کرتے ہوئے انسان مایوس ہو کر بیٹھ رہے تو بیدل اسے ملامت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقش آدمی
اے بہار نیستی از قدر خود ہوشیار باش

تمام کائنات کی متفقہ کوشش نے بے شمار دوروں میں سے گزر کر آخر کرۂ ارض پیدا کیا۔ اور اس خاکدان کے بے شمار طبقات کا آخری ارتقائی ظہور انسان بنا۔ اس اہتمام کے بعد انسان کی تخلیق بجائے خود ایک مقصد تھا، جیسے ایک نخل ثمر ور کا مقصد اس کا پھل ہوتا ہے۔ لیکن اس کی شاخیں اور پتے غرض ہر ایک شے کارآمد اور مفید بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ فطرت کوئی شے ناکارہ اور باطل پیدا نہیں کرتی یہ "انسان" پر جو کچھ بیدل نے لکھا ہم مناسب مقام پر بیان کریں گے۔ سردست یہ حقائق جو بیدل بیان کرتا ہے ہمارے سامنے ہیں کہ جسے "تحقیق" کہتے ہیں وہ بھی "شبہ" سے خالی نہیں۔

زعرض شبہ تہی نیست نسخہ تحقیق
تو آنچہ کردۂ از خویش انتخاب شک است

اور اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ "تا تجدد جلوہ دارد شبہ معنی

بجاست“ یہ تجدد امثال ہی کا کرشمہ ہے کہ ہمیں ”امثال“ یا شبہ کے بعد شبیہ نظر آتی ہے اور ایک دوسری کی غیر ہے۔ اس حالت میں کوئی شخص دعوےٰ نہیں کر سکتا کہ وہ محقق ہے، کسی شے کی نسبت صحیح حکم ہم اسی حالت میں لگا سکتے ہیں جب وہ شے ہمارے حواس کے سامنے موجود ہو لیکن اس شے کی تصویریں یکے بعد دیگرے ایک دوسری سے مختلف ہماری آنکھوں کے سامنے سرعت سے گزر رہی ہوں تو تحقیق کی کونسی صورت ہے۔

بزمِ تجدیداست ایں جا فرصتِ تحقیق کو
من منی دارم کہ تا وا میرسی او می شود

جب ہمیں تحقیق کی فرصت ہی نصیب نہ ہو تو تحقیق ممکن نہیں۔ لیکن بیدل کہتا ہے کہ تحقیق کی ایک صورت ہے اور وہ ” سیرِ دل“ ہے، اس کو اصطلاح میں ”سیر النفسی“ بھی کہتے ہیں۔

زیں کارگاہ تمثال یا دل قناعتے دوست
از ہر گلے کہ خواہی آئینہ رنگ دارد

اس عالم صورت یا تمثال میں مناسب یہی ہے کہ دل ہی پر قناعت کرو، امثال سرعت سے بدل رہی ہیں اور ان میں تکرار اور رجعت نہیں اس لئے ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جس پر ہمارا قبضہ تصرف ممکن ہو۔ لیکن جو کچھ آفاق میں ہے اس کا عکس ہو بہو ہمارے آئینہ دل پر پڑتا ہے اور اس میں محفوظ ہو جاتا ہے، باغ میں پھول کی رنگینی پر بھی تجدد امثال اثر انداز ہے اور یہ ہر لحظہ بدل رہی ہے۔ مگر دل میں ہر ایک رنگ اور رنگینی محفوظ ہے۔ اس لئے ہمیں گلگشت چمن چھوڑ کر سیرِ دل ہی پر قناعت کرنی چاہیئے۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ
تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بچمن درآ

کتنی ستم ظریفی ہے اگر تجھے ہوا و ہوس سیر گلشن کی ترغیب دے تو خود غنچہ سے کم شگفتہ نہیں ہے دل کا دروازہ کھول کر چمن میں داخل ہو جا، تیرا دل خود ایک گلستان جہاں ہے۔

پے نافہ ہائے رمیدہ بو مپسند زحمت جستجو
بخیال حلقۂ زلف او گرۂ خورو بختن درا

نافہ یا پھولوں کی خوشبو تو فضا میں پریشان ہو رہی ہے۔ تو اس کے پیچھے دوڑ دھوپ کب تک کرتا رہیگا، اور کہاں تک کرے گا۔ وہ تو ہاتھ آنے سے رہی، اسی مطلوب حقیقی کی زلف کے پیچ وخم کے تصوّر میں محو ہو جا اور ختن میں داخل ہو جا جس کی فضا نافوں کی خوشبو سے لبریز ہے یا جو ہرا یک خوشبو کا سرچشمہ ہے۔ اس شعر میں رعایت لفظی اور معنوی کی اعلیٰ مثال ہے۔ نافۂ غزالہ کو "رمیدہ"، کہنا لفظاً اور معناً صحیح ہے۔ کہ ہرن بھی "رم" کرتا ہے۔ اور نافہ کی خوشبو بھی پراگندہ اور منتشر ہوتی ہے۔ زلف میں بھی گرہیں، پیچ اور خم ہوتے ہیں اور تذکر و تفکّر میں سر زانو کی طرف جھکا ہُوا ہوتا ہے تو یہ بھی گرہ کی شکل ہے، مطلب یہ ہے تو سیر دل میں اتنا انہماک اور استغراق پیدا کر کہ بیرونی دنیا و مافیہا سے غافل ہو جا، بیرونی دنیا عالم کثرت ہے اور کثرت میں پریشانی ہے۔ عالم دل میں خلوت ہے اور سکون اور راحت ہے اور مطمئن ہو کر جستجو حقیقت کر وہ اسی دل میں ہے تجھ کو بیرونی دنیا میں نہیں ملے گی۔

زسروش محفل کبریا ہمہ وقت میرسد ایں ندا
کہ بخلوت ادب و وفا زدر بروں نشدن درا

الہام کدہ کبریائی سے تجھے ہر وقت یہ آواز آرہی ہے کہ خلوت دل

وہ مکان ہے کہ اس کے باہر تو تیری نگاہ بے محابا ادھر اُدھر دوڑتی رہیگی۔ تو اس مکان کے اندر ہی رہ اور اندر ہی اندر اس میں داخل ہو۔ داخلہ ہمیشہ کسی جگہ باہر سے ہوتا ہے اور مکان یا مقام ہی منزل گاہ ہے اس لئے تو مکان دل میں داخل ہو جا۔ اور پھر باہر نکلنے کا نام نہ لے۔ اگر تحقیق مطلوب ہے تو پہلے "خلوت" پیدا کرو۔

ہر سخن سنجے کہ خواہد صید معنیہا کند
چوں زباں می باید اوّل خلوتے پیدا کند

گفتگو تو زبان ہی سے ہوتی ہے۔ مگر زبان تو محض ایک آلہ حرف و صوت ہے۔ خیال اور الفاظ بیک وقت دل ہی میں پیدا ہوتے ہیں اور جو کچھ دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر آتا ہے اس لئے سخن گو اگر یہ چاہتا ہے کہ معانی کا شکار کرے تو جس طرح شکاری تنہا گھات میں بیٹھتے ہیں اور جس طرح زبان مُنہ میں خلوت نشین ہے پہلے خاموشی سے دل پر نظر کرے اور دیکھے کہ کیا کیا معانی اس پر الہام کردہ حرف و صوت سے منکشف ہوتے ہیں "چوں جمع شد معانی گوئے بیاں تواں زد" خلوت کے بغیر جمعیت دل حاصل نہیں ہوتی۔ اور جب تک یہ نہ ہو خیالات پریشاں اور پراگندہ ہی رہیں گے اس لئے

دل جمع کن از کشمکش دہر بروں آ
کیں بحر در آغوش گہر ریخت کراں را

بحر پانی کے قطروں کا ہی مجموعہ ہے۔ مگر جو تموّج اس میں پیدا ہوتا رہتا ہے وہ قطروں کو پراگندہ ہی رکھتا ہے۔ اس لئے کسی قطرہ کو جمعیت حاصل نہیں۔ موتی بھی قطرۂ آب ہی ہے مگر جمعیت حاصل ہے۔ اور خلوت بھی اور بحر بے پایاں اور طوفان موج افزا میں امن و راحت میں رہتا ہے، اس بحرِ عالم میں بھی کشمکش اضطراب امواج کی

طرح ہے۔ اگر تجھے گہر کی طرح جمعیت حاصل ہو تو اس بحر سے باہر نکل کر بھی جمعیت ہاتھ سے نہ دیگا۔ اور ہمیشہ کنارِ عافیت سے ہمکنار رہے گا۔

"بے نیاز از بحر گردد قطرہ چوں گوہر شود"

نیز :-

خاطرت گر جمع شد از ہر دو عالم فارغی
قطرہ وارے چوں گہر زیں بحرِ بے پایاں برآ

ز سیرِ عالمِ دل غافلیم ورنہ حباب
سرے اگر بگریباں فرو برد دریاست

حباب اور دل کی شکل و صورت بھی ملتی جلتی ہے۔ ہم بیرونی دنیا میں اسی طرح بھٹک رہے ہیں جس طرح پانی کا بلبلہ سطحِ بحر پر موجوں کے ساتھ بہ رہا ہو۔ اگر ہمارا دل، یہ حباب ذرا گریبان میں منہ ڈالے تو اسے فوراً معلوم ہو جائے گا کہ میں تو دریا ہوں۔ یہ دعوئے انا الموجود، اور یہ سربلندی، اور ہوائے غرور جو حباب کے سر میں سمائی ہوئی ہے اسی وقت تک ہے جب تک وہ اپنے گریبان میں جھانک کر نہیں دیکھتا اور جب دیکھے گا تو ہوا نکل جائے گی اور وہ دریا میں جو اس کی اصل ہے محو ہو جائے گا۔ حباب اگر سربلندی کے خیال میں محو نہ ہو اور ذرا جھک کر اپنے نیچے نظر کرے تو اس کو اپنی حقیقت جو دریا ہے معلوم ہو جائے گی، یہاں تو عجز درکار ہے اور بندگی سے سب کچھ ملتا ہے۔

ببارگاہ نیاز دارد فروتنی ناز سربلندی
بخاک روزے دو ریشہ گی کن دگر بیال و شجر برو آ

بروں دل نتواں یافت ہر چہ خواہی یافت
کدام گنج کہ در خانہ خراب تو نیست

یہ لاجواب شعر ہے۔ جو کچھ بھی تو چاہتا ہے وہ تجھے دل ہی میں ملے گا۔

دل سے باہر ہرگز نہیں مل سکتا۔ تجددِ امثال کے تحت ہم بیدل کے نظریۂ تحقیق پر بحث کر چکے ہیں نظریہ یہ ہے کہ جب ہم کائنات پر نظر کرتے ہیں تو اسے عالمِ صورت یا تمثال پاتے ہیں جس کو محسوسات کہتے ہیں اور ہم صورتوں کے سوا کچھ اور محسوس کر ہی نہیں سکتے، یہی عالمِ تمثال ہمارے آئینۂ دل میں بھی منعکس ہو رہا ہے۔ اس لئے اب اہلِ دل جو اہلِ ذکر و فکر محققین ہوتے ہیں بیرونی دنیا میں سرگرداں نہیں ہوتے۔ اسی دل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور استغراق کے بعد گوہرِ مقصود یعنی حقائقِ اشیاء معلوم کر لیتے ہیں، مشہور ہے کہ گنج خرابہ ہی میں مدفون ہوتا ہے، سعدیؒ کہتا ہے کہ :۔

کیمیا گر بہ غصہ مُردہ و رنج ابلہ اندر خرابہ یافتہ گنج

حُسن کا گنج گرانمایہ تجھے مل جاتا

تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل (اقبالؔ)

ویسے بھی تمام معدنیات اور قیمتی جواہرات زیرِ زمین ہی ہوتے ہیں، شعر کا مطلب یہ ہے کہ وہ کونسا خزانہ ہے جسے تو اپنے آپ سے باہر ڈھونڈھ رہا ہے وہ تو تیرے ہی دل خراب میں ہے۔ اور یہیں ملے گا۔ "تدبّر" کہتے ہیں کھودنے کو اسی کریدنے اسی تدبّر و تفکّر سے تجھے حقیقت کا علم ہو گا۔

"جمعیت دل" بیخودی، انہماک اور استغراق سے حاصل ہوتی ہے۔ یعنی جب ہم بیرونی دنیا سے غافل ہو کر اپنے دل کی گہرائیوں میں غوطہ لگائیں تو گوہرِ حقیقت پا لیتے ہیں۔

ہزار جلوہ در آغوشِ بیخودی محو است

جہاں شعور طلب می کند تو خواب طلب

یہاں خواب سے مراد انہماک و استغراق ہے جو توجہ کامل سے

حاصل ہوتا ہے جس سے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے اسی کا نام بیخودی ہے۔ انسان اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے، جو حضرات نفسیات سے واقف ہیں وہ شعور اور تحت الشعور اور لاشعور کی اصطلاحات سے واقف ہیں حقیقت عالم لاشعور میں ہے۔ لوگ تو شعور کے طالب ہیں جو بیداری کی حالت میں ہوتا ہے، اور وہاں پریشانی اور سرگردانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ تو "خواب طلب"، تو تحت الشعور بلکہ لاشعور طلب کر۔ ایک رباعی میں لکھتا ہے کہ:۔

اشیا عرض خیال دیدن بودست
اسما ہمہ افسانہ شنیدن بودست
ایں جملہ ز خود بروں دویدن بوداست
انسان گشتن بخود رسیدن بوداست

فلسفہ خودی اور بیخودی کو بیدل نے اس ایک رباعی میں بیان کر دیا ہے۔ اور ساتھ ہی خیال اور مادہ پرست فلسفیوں کا نظریہ بھی پیش کر دیا ہے کہ کائنات محسوسات میں سمع و بصر یعنی اشیاء کا دیکھنا اور ان کو اسماء سے تعبیر کرنا ہے، جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ تمثال ہی ہیں، بہرحال محسوسات جو کچھ بھی ہیں انسان سے خارج میں موجود ہیں، اور انہی میں دوڑ دھوپ اپنے آپ سے باہر ہے۔ اور جو کچھ خارج میں موجود ہے وہ انسان سے علاحدہ اشیا ہیں۔ "انسان گشتن بخود رسیدن بوداست" خودشناسی خداشناسی اور حقیقت رسی ہے۔

جمعیت حواس در آغوش بیخودیست
از ہوش بہرہ نیست کسے را کہ مست نیست

عام خیال تو یہ ہے کہ جو مست اور بیخود ہو وہ بے ہوش ہوتا ہے مگر بیدل نے شاعرانہ صنعت یہ پیدا کی ہے کہ اضداد کو جمع کر دیا ہے۔ کہتا ہے کہ بے ہوش وہ ہے جو مست نہیں کیونکہ بیخودی میں جمعیتہ حواس ممکن ہے۔

اور بیخودی اور مستی ایک ہی بات ہے۔

ان تمام محولہ بالا اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ بیرونی دنیا میں تجدد امثال سرگرم عمل ہے اور زمان و مکان کی قید بھی ہے۔ اور امثال کے بدلنے اور دیگر امور متعلقہ کی وجہ سے ہمیں فرصت تحقیق ہی نہیں ملتی تو تحقیق کی کونسی صورت ہے؟ یہ عالم دل ہے جہاں ہر ایک واقعہ جو بیرونی دنیا میں رفت گذشت ہو چکا ہے اب پھر واپس نہیں آسکتا اور گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں ویسا ہی من وعن موجود اور محفوظ ہے۔ حافظہ کی مدد سے ہم اسے پھر حال میں لا سکتے ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ جو کچھ مستقبل میں واقع ہونے والا ہے اسے بھی حال میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس لئے زمان و مکان صرف خارجی دنیا میں ہے دل میں یہ محو ہو جاتے ہیں۔ تذکر سے زمانہ ماضی اور تفکر سے مستقبل کو ہم حال میں مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

بظاہر حضرت انسان کو آب و گل سمجھتے ہیں
مگر اہلِ نظر ہستی کا اس کو دل سمجھتے ہیں

مُدعا دل بود اگر نیرنگ امکاں ریختند
بہر ایں یک قطرۂ خوں رنگ طوفاں ریختند
قیامت مے دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد (غالب)

عارف رومی کا بھی یہی ارشاد ہے کہ:۔

اے برادر تو ہمیں اندیشۂ
مابقی تو استخواں و ریشۂ

"زمان" کیا ہے؟ واقعات یا حالات کو یکے بعد دیگرے مشاہدہ کرنا، مکان کیا ہے؟ حالات کو کسی خاص مقام میں دیکھنا۔ چونکہ زمان و مکان بدلتے رہتے ہیں اس لئے ہم غلط فہمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ "حال" بدل رہا ہے جو مکان و زمان سے علاحدہ نہیں دیکھ سکتے۔ حالانکہ ہم ہر حال میں حال ہی مشاہدہ کرتے ہیں۔ ماضی معدوم اور مستقبل موہوم امور ہیں،

حال ہی معلوم ہے۔

"تجدد امثال"، پر ہم بیدل کے نقطہ نظر سے مختصر مگر فہم و تفہیم کے لئے کافی بحث کر چکے ہیں، اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ "دل" ہی ہے جس کی سیر ہماری تخلیق کا منشا ہے، بیدل اکثر اشعار میں اسی پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تجھ سے جو کچھ باہر ہے تو اس سے اور وہ تجھ سے بے تعلق نہ بھی ہو پھر بھی یہ سمجھ لے کہ تیرا دل یا قلب یا ذہن بیرونی دنیا سے افضل شے ہے۔ اس لئے تو مسجود ملائک ہے اور تمام کائنات تیرے ہی لئے مسخر ہو چکی ہے۔

انسان کہ فلک ہاست سر افگندۂ او
در حیرت او گم است دانندۂ او
دارد نا چیتے کہ در خارج و ذہن
ہر چیز کہ آفریدہ شد بندۂ او

تیرا راز پا نہ سکے ملک تیرا بار اُٹھا نہ سکے فلک
کوئی پہنچا تیری نہ گرد تک وہ ہیں دور تر تگ و تاز میں
یہ سماک سماک کا فاصلہ تیری اک نگاہ نے طے کیا
جسے تو سمجھتا ہے دور تر ہے قریب راہ دراز میں

خودی انسان کی بلندی مرتبہ پر بیدل نے جو کچھ لکھا ہے کوئی کیا لکھے گا اور اس کے ضمن میں خودی اور بیخودی پر جو حکیمانہ بحث کی ہے وہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے۔ سر دست ہمارا مقصد اتنا ہی ہے کہ قارئین کرام بیدل سے روشناس ہوں۔ اگر خدا نے توفیق عطا فرمائی تو تفصیلی بحث بھی کی جائے گی۔ خودی سے مراد خود شناسی ہے، انسان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کا صحیح مقام کائنات

میں کیا ہے، اور یہ کہ اس مقام کا تقاضہ اور مطالبہ کیا ہے؟ جب یہ راز اس پر منکشف ہوگیا تو وہ سمجھ جائے گا کہ تمام کائنات اس کے سامنے جھکتی ہے، وہ صحیح معنی میں "خلیفہ فی الارض" ہے۔

علامہ اقبال کا فلسفہ خودی و بیخودی ایک خاص مقصد کا حامل ہے۔ اور بلاشبہ قوم میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں، بیدل نے جو کچھ اس موضوع پر لکھا ہے علامہ اقبال کی نظر بھی اس پر ہے اور علامہ کے اکثر اشعار میں بیدل کا تخیل کارفرما ہے۔

بیدل کہتا ہے :-

بیدل بحصول رزق آمادہ بسر سگ چاکر سگ نگشت خر بندۂ خر
از مخترعات کارگاہِ امکاں ایں ننگ شعور نیست جز صنع بشر

طبقہ حیوانات میں حاکمی اور محکومی صرف عالم انسانی میں مشاہدہ ہوتی ہے۔ انسان تمام طبقہ میں باشعور حیوان ہے، امکانات میں سے جو امر ممکن ہے وہ اسی ننگِ شعور انسان کی اختراع "حکومت" ہے، کہ اپنے ہی ہم جنس انسانوں میں ادنیٰ اور اعلیٰ اور حاکم و محکوم کا امتیاز پیدا کر رکھا ہے۔ بیدل اس چاکری اور بندگی کے اسباب کی تشخیص بھی کرتا ہے، کہ یہ احتیاج رزق ہی ہے، اور کثرت رزق کی طلب اور اس کے لئے زر اندوزی کی ہوس، بیدل اس کی مذمت کرتا ہے۔

امروز قدر ہر کس مقدار مال و جاہ است
آدم نمی تواں گفت آں را کہ خر نباشد

یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ آج ہر ایک شخص کی قدر و منزلت مال و جاہ کی مناسبت کے ساتھ ہے، یہ بار دنیا جو اہل مال و دولت نے اپنی پشت پر اٹھایا ہوا ہے گاؤ و خر ہی کا کام ہے۔

فلکت تکلیف جاہت گرد بد فال حماقت زن
کہ غیر از گاؤ نتواند کشیدن بارِ دُنیا را

مشہور ہے کہ کرۂ ارض گائے کے سینگوں پر ہے۔ اس لئے اگر آسمان نے تجھے دنیوی جاہ کے لائق سمجھا ہے تو یہ سمجھ تجھے آدمی نہیں بلکہ پشو سمجھا کیونکہ گائے ہی دنیا کا بوجھ اُٹھا سکتی ہے۔

در ہمہ حال آدمی شخص ملک سیرت است
لیک بجاہ اندکے ناز خری می کند

آدمی تو فطرتاً نیک ہی ہے اور بہر حال فرشتہ سیرت ہے مگر مال و جاہ کے ساتھ دولتیاں بھی جھاڑتا ہے یہ خری مال وجاہ ہی کا کرشمہ ہے۔

کمال خواجگی در ایں صوف اطلس است اینجا
اگر ایں است عزت آدمی آں بہ کہ خر گردد

اگر صوف و اطلس اور دیبا و حریر سے آدمی کی عزت ہے تو بہتر ہے آدمی گدھا بن جائے، جس پر زرّیں پالان ہو۔

بے زری ممتحن جوہر انسانی نیست
آدم آنست کہ مال و حشمش خر نکند

اگر کوئی شخص بے زر ہو تو محض بے زری کوئی عیب نہیں، کیونکہ زر معیار شرافت انسانی نہیں ہے، عموماً اہل علم بے زر ہی ہوتے ہیں، لیکن یہ ممکن ہے کہ آدمی جاہ و حشمت کے ساتھ گدھا ہو اس لئے آدمی وہ ہے جسے جاہ و حشم گدھا نہ بنائے، گر بدولت برسی مست نگردی مردی بیدل اپنی نسبت کہتا ہے کہ

آخر ز فقر بر سر دنیا زدیم پا
خلقے بجاہ تکیہ زد و ما زدیم پا

میں نے فقر کے ساتھ دُنیا کو ٹھکرا دیا، لوگ تو جاہ و حشمت پر

تکیہ لگائے بیٹھے ہیں میں نے پاؤں سے ٹھکرادیا۔ اس لئے

ہمتے گرہست، پائے برسر دُنیا زنید
ہمچوں گردوں خیمہ در عالم بالا زنید

اگر کچھ ہمت ہے تو دُنیا کو ٹھکرادو
آسماں کی طرح عالم بالا میں خیمہ گاڑدو

کسی مقصد کے حصول کے لئے کچھ مناسب وسائل اور بالواسطہ لوازمات اور محرکات ہوتے ہیں اور ان سے بھی کام لینا پڑتا ہے "خودشناسی" ممکن نہیں جب تک "آزادی" نصیب نہ ہو، اور آزادی حاصل نہیں ہوتی جب تک پراگندہ روزی ہو، اور "رزق کریم" میسر نہیں ہوتا جبتک احتیاج اغیار کی دستگیری پر مجبور کررہا ہو، جو شخص اپنے ہی نفس میں زبوں ہو اور بوجہ احتیاج ذلت محسوس کررہا ہو وہ عارف حق نہیں ہوسکتا۔ اس موضوع پر مزید بحث ہم بیدل کی اخلاقی شاعری کے تحت کریں گے۔ سردست دیکھنا یہ ہے کہ دُنیا طلبی کس حد تک خودشناسی کی سدّ راہ ہے؟ جس کی مذمت بیدل کرتا ہے۔

قرآن حکیم میں بھی "حیواۃ الدنیا و زینتھا" کی مذمت کی گئی ہے۔ دنیا کیا ہے جو نزدیک تر ہو، "ادنیٰ"، شئے نزدیک تر ہوتی ہے اور عجلت اور سہولت سے ہاتھ آجاتی ہے۔ اس کے لئے زیادہ جد وجہد کی ضرورت نہیں ہوتی اور جو شے دور تر ہو اس کے لئے سعی بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ مگر طبائع انسانی عجلت اور سہولت پسند واقع ہوئی ہیں۔ ادنیٰ شے دنیوی مفاد ہے جو محسوس اور نزدیک ہے۔ اور یہ ادنیٰ حیوانی زندگی کے مناسب ہے۔ اور اس میں انسان بہائم سے بڑھ کر نہیں۔ یہی خورد و نوش اور پوشش اور آرام و آسائش انسان بھی چاہتا ہے، اور اس کے اسباب بھی نزدیک ہی موجود ہیں۔ جس سے دیگر حیوانات

بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اعلیٰ انسانی زندگی "حیوٰۃ الآخرہ" ہے، بیدل نے اسی ادنیٰ حیوانی زندگی کی مذمت کی ہے اور اہلِ دولت وثروت کو گاؤخر سے تشبیہ دی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی گاؤخر ہی بننا پسند کرے تو وہ انسان نہیں ہو سکتا۔ اور اس اعلیٰ مقام سے واقف نہ ہو گا جو حضرت انسان کا ہے۔

چونکہ اکثریت گاؤ وخر ہی ہے اور اہلِ علم و ہنر اقلیت میں ہیں۔ اس لئے جو لوگ خود شناس ہیں ان کو فقر و فاقہ ہی میں زندگی اس وقت تک بسر کرنی پڑتی ہے جب تک نظامِ معاشرت و معاشیات میں انقلاب پیدا نہ ہو اور ان کو پیدا کرنا چاہیئے۔ گاؤ وخر اس کی اجازت نہیں دیں گے مگر ان کی کوشش ضرور بارور ہو گی۔ اہلِ علم ہمیشہ عسرت ہی میں زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ خواجہ کی شکایت بجا ہے کہ

فلک بمردم سفلہ دہد زمام مراد
تو اہلِ دانش و فضلی ہمیں گناہت بس

اہلِ علم توکل پیشہ ہیں۔ لیکن توکل کا وہ مفہوم نہیں کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے، اور افسردہ دل ہو کر مایوسی کی تصویر بنے رہے۔ بیدل کہتا ہے کہ:-

فسردن گر ہمہ گوہر بود بے آبرو باشد
بکن جہد آنقدر کز خاک برداری توکل را

اگر افسردگی سرتاپا گوہر بھی ہو پھر بھی بے آبرو ہے تجھے اتنی کوشش ضرور کرنی چاہیئے کہ توکل کو خاک مذلت میں نہ ملنے دے۔

دل از خمار طلب خون کن و شراب طلب
جگر بتشنہ لبی واگذار و آب طلب
مباش ہمچو گہر مُردہ ریگ ایں دریا
نظر بلند کن و ہمت حباب طلب

زعافیت نتواں مژدہ کشایش یافت
بدل شکستے اگر ہست فتح یاب طلب
مترس از زخم ناسورائے جراحت دل
بزلف یار بزن دست ومشکتاب طلب

طلب کا احساس ایک فطری امر ہے۔ طالب ایسے مطلوب کو طلب کرتا ہے جو غائب ہو اگر مطلوب حاضر ہو تو طلب مفقود ہوتی ہے۔ پانی کی طلب پیاسا کرتا ہے جیسے پیاس ہی نہ ہو پانی طلب نہیں کرے گا جب پانی ہاتھ آئے اور پی لیا اور پیاس بجھ گئی تو طلب غائب اور مطلوب حاضر ہوگا۔ افسردگی اسی حالت میں ہوتی ہے جب جدوجہد کی طاقت نہ ہو ..... اور طاقت ہو اور عمل میں نہ آئے، اس لئے ادنیٰ حیوانی زندگی کے اسباب کی طلب جلدی ہی افسردگی پر ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ محدود ہے، لیکن اعلیٰ زندگی کی کوشش کا اجر غیر ممنون ہے۔ اس کے لئے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے۔ بیدل اس لئے بہشت کو بھی خاطر میں نہیں لاتا کہ وہ مقام عافیت ہے۔

گویند بہشت است ہماں راحت جاوید
جائیکہ بداغے نہ طپد دل چہ مقام است

بیدل کہتا ہے کہ انسان خودشناس ہو نہیں سکتا اگر افسردہ ہو۔

بوصول مقصد عافیت نہ دلیل جو نہ عصا طلب
تو زاشک آنہمہ کم نۂ قدمے ز آبلہ پا طلب
ز مراد عالم آب و گل، بدر جنوں زن و اگسل
اثر اجابت منفعل زشکست دست دعا طلب
طلب تو بس بود ایں قدر کہ ز معنی تو بسری اثر
بخودت اگر نرسد نظر بخیال ہیچ و خدا طلب

چہ خوش آنکہ ترک سبب کنی، بیقیں رسی وطرب کنی
زحقیقت آنچہ طلب کنی بطریق بیدل ما طلب

ان اشعار میں بیدل بلند ہمتی اس درجہ تک واضح کرتا ہے کہ اسباب کی تلاش تکمیل مقصد کے لئے کم ہمتی ہے۔

اگر از نام خضر آگاہ باشی — ہمہ گر منزلے در راہ باشی

خضر کا کام تو منزل کی طرف رہنمائی کرنا ہے اور خضر کی ضرورت اسی وقت تک ہے جب سالک منزل سے دور ابھی راستہ میں ہے۔ جب منزل پر پہنچ گیا تو خضر کی ضرورت یا طلب ختم ہو گئی۔ خضر ایک سبب ہے یا وسیلہ ہے اور مقصد منزل ہے، اگر تو منزل پر پہنچ کر بھی خضر کو یاد کر رہا ہے تو یہ سمجھنا چاہیئے تو ابھی راہ میں ہے۔ ان اشعار میں بیدل ترک اسباب کی تلقین نہیں کرتا۔ اسباب کی طلب تو بہرحال رہے گی مگر بیدل یہ کہتا ہے کہ اسباب کی تلاش اپنے وجود سے خارج میں نہ کر اگر تجھے عافیت مطلوب ہے یعنی جس منزل پر تو پہنچنا چاہتا ہے تو اس کے لئے نہ تو کسی رہنما کو تلاش کر اور نہ عصا کا سہارا لے۔ یہ سب خارجی اسباب ہیں اور ان کی احتیاج کا احساس تجھے آخر افسردہ بنا کر رکھ دیگا۔ البتہ آنسو تیرا ہے اور تیری ہی آنکھ سے ٹپکتا ہے اور مقصد میں کامیاب نہ ہوئے تو مارے رنج و غم کے آنکھوں سے گرتا ہے، رونا اسی بات کا ہے کہ جو مقصد تو حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے اسباب تیرے ہی وجود میں موجود ہیں بہرحال آنسو ایک قطرہ آب ہے، حقیر شے سہی، تو گیا اس سے بھی گیا گزرا ہے۔ منزل تک سفر طے کرنا قدم کے بغیر ممکن نہیں تیرا آنسو "آبلہ پا" ہے۔ "آبلہ پا" وہ شخصیت ہے جس کے پاؤں میں چھالے ہوں اور چھالے سفر سے ہی پڑتے ہیں، تیرا آنسو سراپا "آبلہ پا" ہے۔ تو قدم اسی سے طلب کر کہ بے دست و پا رواں ہے۔ یعنی خارج اسباب سے

قطع نظر کر، اسباب اور محرکات وغیرہ سب تیرے ہی وجود میں موجود ہیں۔ اس عالم آب و گل کو عالم اسباب کہتے ہیں تو اس سے قطع تعلق کر، جنون کا دروازہ کھٹکھٹا۔ دعائیں مانگنا تو ان کا کام ہے جو مایوس افسردہ خاطر ہوں۔ جب ان کی اپنی کوشش سے مقصد حاصل نہیں ہوتا تو غیر کے آگے دستِ سوال دراز کرتے ہیں "لیس للانسان الاما سعٰی" ہمتِ مردانہ کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان اپنی کوشش نہ چھوڑے۔ عالم اسباب انسان سے خارج ہے۔ اس کے آگے دست دعا دراز نہ کر، اگر تو چاہتا ہے کہ تیری دعا قبول ہو تو دستِ دعا کو توڑ دے اثر اجابت منفعل، وہ اثر جو قبولیت پر مؤثر ہے خودبخود حاصل ہو جائے گا۔ لوگوں نے ایام جاہلیت میں اسی عالم آب و گل کو اپنا حاجت روا سمجھ رکھا تھا اور جل دیوتا اور اگنی وغیرہ کے حضور پرارتھنا کرتے تھے، یہ سب ہماری ہی خدمت پر مامور ہیں۔ اس شعر میں بیدل نے لطیف بات یہ پیدا کی ہے کہ عالم اسباب میں سرگردانی اور مقصد کے لئے اسباب کی تلاش عقل کا کام ہے تو جنوں کا دروازہ کھٹکھٹا اور عقل حیلہ گر کے فریب میں آکر عالم اسباب میں پریشان نہ ہو۔ اس موضوع پر مزید بحث مناسب مقام پر کی جائے گی۔ تیری طلب کی انتہا تو اتنی ہے کہ عالم صورت میں حقیقت آشنا ہو اور یہ حقیقت تجھے سیر دل یا انفسی ہی میں مشاہدہ ہوگی۔ اگر تو خود شناس نہیں ہے تو پھر عالم خیال میں خدا کو طلب کر، اسی کے ہم معنی یہ شعر بھی ہے کہ۔

جیب ہر موج طربگاہ حضور دریاست
فکر خود کن گرت اندیشۂ رب باید کرد
گم گشتۂ تحقیق خود آوارہ وہم است
ما را بگذارید بدرد طلب ما

لوگوں نے اللہ تعالےٰ کی نسبت عجب ابلہ فریب باتیں اختراع کی ہیں۔ بعض تو یہ دعوائے کرتے ہیں کہ ہماری دُعائیں قبول ہوتی ہیں، ایسے مستجاب الدعوات مرجع جہلا ہیں۔ ان کی دُعا کیا ہے حکم ہے اور خدا کو ماننا پڑتا ہے، حضرت ابراہیم کی دُعا باپ کے حق میں قبول نہیں ہوئی۔ نوح کی بیٹے کے حق میں رد ہوئی ہے۔

آخری شعر میں بیدل کی تلقین یہ ہے کہ ترک سبب کُن، سبب کو مسبب الاسباب نہ سمجھ۔ تو یقین یعنی ایمان کے درجہ پر پہنچ جائے گا۔ اگر تو اس حقیقت سے آشنا ہونا چاہتا ہے تو طلب بھی اُسی طریق سے کر جس طرح بیدل کر رہا ہے۔ گذشتم از سر مطلب تمام شد مطلب، اس تشریح کے بعد اب اشعار محولہ بالا کا مطلب واضح ہو جائے گا۔

دل از خمار طلب خوں کن و شراب طلب الخ

یعنی پہلے احساس طلب ہونا چاہیئے، اور طلب کو مطلوب سے کچھ مناسبت بھی ہونی چاہیئے۔ پیاس پانی ہی سے بجھتی ہے رنج خمار شراب ہی سے رفع ہوتا ہے۔ طلب مثل خمار اور تشنہ لبی ہے۔ جب اس کا احساس ہو گا تو بقدر شدت خود بخود ایک تحریک حصول مطلوب کے لئے پیدا ہو جائے گی۔ لیکن احساس طلب باہر سے نہیں آتا، ہمارے ہی وجود میں ہے، اس کی تسکین بھی ہم ہی محسوس کرتے ہیں۔ گہر کی طرح قعر دریا کی ریت میں مُردہ کی طرح مدفون نہ ہو اپنی نظر بلند رکھ، حباب کی ہمت دیکھ کہ سطح دریا پر پھر رہا ہے، "فتح باب" درمراد کا کھلنا، اگر دروازہ کھلا ہو تو ہم مکان میں بے تکلف داخل ہو سکتے ہیں؛ عافیت یعنی آرام طلبی سے کشائش کار ممکن نہیں۔ اگر تیرا دل شکستہ ہے تو سمجھ دروازہ مُراد کھلا ہے، اگر بند ہوتا تو توڑنا ہی پڑتا۔ کہتے ہیں کہ زخموں کا علاج مومیائی سے ہوتا ہے اور یہ مشک سے تیار ہوتی ہے؛

مشک کو زیتون کے تیل میں ملا کر زخم پر لگاتے ہیں تو مندمل ہو جاتا ہے۔ جراحت دل یعنی دل کا زخم اگر ناسور کی صورت اختیار کرے تو گھبرانا نہ چاہیئے۔ یار کی زلف تک دست درازی کر اور وہاں سے مشک ناب طلب کر ان اشعار میں بھی بیدل افسردگی اور مایوسی کی مذمت کرتا ہے کہ ہمت مردانہ کے مناسب نہیں۔

ہمت بلند دار کز اسباب اعتبار
بے عزتیست آنچہ نیاید بکار مرد

"اسباب اعتبار" ہر ایک شے کسی اسم سے تعبیر ہوتی ہے اس لئے کائنات کی اشیاء "اعتبارات" ہیں، کوئی شے معتبر نہیں ہو سکتی جب تک ممیز اور کسی نام سے موسوم نہ ہو۔ کائنات میں ہر ایک شے کار آمد ہے مگر "بے عزتی" ایک ایسی شے ہے جو مردوں کے کسی مصرف کی چیز نہیں۔ یعنی ہمت مردانہ کبھی بے عزتی گوارا نہیں کرتی۔ بیدل کہتا ہے کہ۔

بہ کہ بروز حشر ناز کنی پیش کریم
ورنہ ز کم ہمتیست عذر گناہ خواستن

تو نے قیامت کے دن کریم کے حضور پیش ہونا ہے۔

بجناب کرم افسون ورع پیش مبر
بے گناہی گنہے نیست کہ آنجا بخشند

بخشش تو گناہ کی ہے۔ بے گناہی ایسی شے نہیں کہ کریم کے حضور پیش کی جائے۔

زساز معبد رحمت ہمیں نواست بلند
کہ اے عدم صفتاں کاش کے گناہ کنید

درگاہ رحمت سے یہ آواز بلند آہنگی سے آ رہی ہے کہ "لا تقنطوا من رحمت اللہ" انسان کیا ہے "لم یکن شی مذکورا" عدم تھا،

اور عدم میں محو ہو جائے گا۔ اگر اس سے گناہ بھی سرزد ہو تو غنیمت ہے بلکہ اعجاز ہے۔

ماجرا کم کن ز نیرنگ بد و نیکم مپرس
من عدم بودم عدم چیزیکہ بود آوردہ است

از چمن تا انجمن جوش بہار رحمت است
دیدہ ہر جا باز می گردد دو چار رحمت است

کو دماغ آنکہ ما از ناخدا منت کشیم
کشتی بیدست و پائیہا کنار رحمت است

احسان ناخدا کے اٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں (ذوق)

خواہ ظلمت کن تصور خواہ نور آگاہ باش
ہر چہ اندیشی نہاں و آشکار رحمت است

قدر دان غفلت خود گر نباشی جرم کیست
آنچہ عصیاں خواندۂ آئینہ دار رحمت است

وحشی دشت معاصی را دو روزے سر دہید
تاکجا خواہد رمید آخر شکار رحمت است

حقیقت بھی یہی ہے کہ واجب ہے انسان غلطی کرے اور گناہ اور غلطی ایک ہی بات ہے اگر غلطی نہ کرے گا تو بہائم سے بہتر ہو گا کیونکہ بہائم غلطی نہیں کرتے یا خدا بن جائے گا کیونکہ ذات باری ہر ایک عیب سے پاک ہے انسان تو خدا ہو نہیں سکتا۔

چہ ممکن است رود داغ بندگی ز جبیں
زمیں فلک شود و آدمی خدا نشود

البتہ بہائم سے بدتر ہو سکتا ہے، غلطی اس لئے واجب ہے کہ

انسانی ذہنی ارتقاء اسی میں ہے انسان کبھی کامل نہیں ہوسکتا وہ صرف ذات الٰہی ہے۔ آفرینش سے انسان غلطی کرتا رہا ہے اور ترقی بھی کرتا آرہا ہے، بہائم غلطی نہیں کرتے اور ایک ہی حالت میں آفرینش سے ہیں۔ بقول بیدل "بے مصلحت نیست ظہور شیطان" یہ ممکن ہے کہ انسان بہائم کی طرح غلطی نہ کرتا، گناہ نہ کرتا، مگر وہ انسان نہ ہوتا، گاؤخر ہوتا۔ لیکن غلطی ہو یا گناہ ارادتاً کرنا انسانیت کے شرف کو بٹہ لگاتا ہے۔ سہواً ہو تو اس کا ازالہ کرنا چاہیئے اور یہی ذہنی ترقی کا مطالبہ اور تقاضہ ہے۔ بہرحال غلطی انسانی امتیازی خوبی ہے۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بحث تھی جس کا تعلق بالواسطہ "خودی" سے ہے۔ عموماً اہلِ تصوف پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے اور کسی حد تک بجا بھی ہے کہ تصوف افسردگی سکھاتا ہے، ہم بیان کرچکے ہیں کہ بیدل بھی یہی کہتا ہے کہ تصوّف نتیجہ بیکاری ہے۔ اگر کوئی اور کام کرنے کا ہوتا تو اس طرف توجہ ہی کون کرتا۔ اور ناداری کا نتیجہ افسردگی ہے۔

در مزاج خلق بیکاری ہوس می پرورد
غافلاں نام فضولی را تصوف کردہ اند

لیکن ایک بات ہے جسے نظر انداز نہ کرنا چاہیئے اور اس ضمنی بحث میں ہم نے اسی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اہلِ علم کو مجبوراً فقر و فاقہ قبول کرنا پڑتا ہے۔ یا تو وہ علم سے کنارہ کش ہوں اور اہلِ دنیا کی طرح بہائم کی زندگی بسر کریں، ورنہ اس کے سوا جیسے کہ حالات ہیں چارہ نہیں کہ بُری بھلی زندگی جیسی بھی ہے بسر کریں، لیکن ان حالات میں خودداری یا وضعداری کو خوش اسلوبی سے نبھانا بہت مشکل ہے۔ اس لئے اکثر اہلِ علم نے اُمرا کی سرپرستی قبول کی۔ اس کی مذمت بیدل کرتا ہے۔ چہار عنصر کے تحت ہم بیدل کا نظریۂ مدح و ذم بیان کرچکے ہیں کہ حقیقت بھی

یہی ہے کہ جب حکومت اہل علم کی سرپرست ہو تو وہ اہلِ علم کی قوت فکریہ کو خرید لیتی ہے۔ تمام نامور شعرا بادشاہوں اور اُمرا کے مداح ہی گذرے ہیں۔ یہ دریوزہ گری خودداری کے منافی ہے۔

کاش مدح وذم سے ناواقف رہیں اہلِ سخن
آبرو کو بیچتے ہیں بے خبر گوہر فروش

آبرو کے بارہ میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

بے تامل میتواں طے کرد صد دریائے خوں
لیک نتواں از سر یک قطرہ آب رو گذشت

آنچہ نتواں داد جز در دست محبوباں دل است
وآنچہ نتواں ریخت جز در پائے خوباں آبرو است

جب لوگوں نے دیکھا کہ اکثر صوفیہ کرام گوشہ نشین فقر و فاقہ میں بسر کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ تصوف ناداری اور افسردگی سکھاتا ہے اور جب ان کے کلام میں مسئلۂ "فنا" مطالعہ کیا تو اکثر اہل علم نے بھی ٹھوکر کھائی، خود خانقاہ کے پیروں کے حالات بھی اس کی تائید میں تھے اور ہیں اس لئے لوگ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ صوفی اور ہندو سادھو اور مسیحی رہبان ایک ہی تھیلی کے بٹے ہیں۔ ترک دنیا صرف ایک ڈھونگ ہے، بقول "گبن" "ترک دنیا سے دنیا زیادہ ملتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں، صوفیہ کرام محققین ہیں اور تحقیق کا مطالبہ ہے کہ یکسوئی ہو تاکہ کامل توجہ مطلوب و مقصود میں مرکوز ہو۔ اس کے لئے ایک عمر چاہیئے، حافظ کہتا ہے۔

سحرگہ رہروے در سرزمینے ہمیں گفت ایں معمہ با قرینے
کہ اے صوفی شراب آنگہ بود صاف کہ در شیشہ بماند اربعینے

ایک سالک نے یہ بات استعارہ میں اپنے اصحاب سے کہی کہ شراب اس وقت صاف ہوتی جب اسمیں "درد" تا تلچھٹ کا شائبہ تک نہ ہو، جب وہ شیشہ میں چالیس سال رہتی ہے۔ چالیس سال عمر کا بہترین حصہ بلکہ منتہائے عروج ہے، آج کل تو جوانی پچیس حد تیس سال پر ختم ہو جاتی ہے مگر سلف صالحین اس کو لڑکپن کا زمانہ سمجھتے تھے، اور جوانی کی اشد قوت اور بلوغ چالیس قرار دیتے تھے، اس کے علاوہ یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ "ہر کسے را بہر کارے ساختند" اور جس کام کا کوئی اہل فطرتاً ہوتا ہے اس کام کی اُلفت اس کے دل میں ہوتی ہے، یہ کہنا چاہیئے کہ ہر ایک کام خواہ صنعت و حرفت ہو یا کچھ اور ایک فطری مناسبت ہر ایک طبیعت سے رکھتا ہے اور ہر ایک شخص پیدائشی اس کام کا اہل ہوتا ہے جو اس کی فطرت کا تقاضہ ہے۔ اگر وہ اس کام میں لگ جائے اور حالات بھی سازگار ہوں تو اس میں "اختراع" اور "ایجاد" بھی کرتا ہے اور مستند اُستاد مانا جاتا ہے، "سورہ نازعات" میں یہی بیان ہے، لیکن اگر حالات سازگار نہ ہوں تو بیدل کہتاہے کہ۔

اے بسا روشن دلے کز بے نیازیہائے شوق
چوں فروغ مہر برخاک سیاہ افتادہ است

اکثر اہلِ دل ایسے بھی ہیں کہ آسمانِ رفعت پر آفتاب کی طرح جلوہ افروز ہیں مگر ان کے فیض کی شعاعیں خاک سیاہ پر پڑ رہی ہیں، انھیں اس کی پرواہ نہیں کہ کوئی ان کی مدح کرتا ہے یا ذم، اور یہ کہ ان کے نور کا اکتساب نااہل کرتا ہے یا اہل۔

اے بسا آئینہ کز کسوت زنگاریش
یوسفستانے بخلوت گاہ چاہ افتادہ است

کئی آئینے ایسے ہیں کہ اپنے لباس کی رنگینی کی وجہ سے حسن یوسف کو

جلوہ دیتے ہیں مگر یہی سبب ان کے کنوئیں میں گرنے کا ہوتا ہے جہاں وہ تنہا ہوتے ہیں اور کوئی دیکھنے والا نہیں ملتا۔

معنی اقبال فقر از غافلاں پوشیدہ اند
ورنہ در ہر خاک چندیں دستگاہ افتادہ است

غافل لوگ کیا جانیں کہ خاک نشیں فقرا کی گودڑی میں کیا لال چھپے ہوئے ہیں۔

یہ امر کہ جوہر ذاتی اور وصف اضافی میں کیا فرق ہے؟ بیدل بتاتا ہے کہ۔

ہمچو شبنم از تامل دیدۂ گر وا کنی
برگ برگ ایں چمن جز لوح استعداد نیست

اگر تو شبنم کی طرح آنکھ کھول کر دیکھے تو تجھے صاف نظر آئے گا کہ اس باغ کا پتہ پتہ "لوح استعداد" ہے، شبنم ہر ایک پتہ پر پڑتی ہے اور اسے ہر ایک پتہ کا حال معلوم ہے کہ کس قابلیت کا مالک ہے۔

جوہر ذاتی است موزونی نہ کسب عارضی
گل بسعی پر فشانیہا چو سرو آزاد نیست

جسے موزونی کہتے ہیں اور یہی حسن و خوبی پیدا کرتی ہے، وہ جوہر ذاتی ہے، فطری قابلیت ہے، کسبی اور عارضی نہیں، یعنی کسب و اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی تو عارضی چند روزہ ہوتی ہے، گل اپنی وضع میں گل ہے مگر ناممکن ہے کہ خواہ کتنی سعی کرے سرو کی طرح بلند و بالا ہو، اور سرو گل نہیں بن سکتا۔

باغباں گر خوں خورد ابر آبرو بر خاک ریز
نیست گل غیر از گل و شمشاد جز شمشاد نیست

باغباں خواہ خون پسینہ ایک کر دے اور ابر اپنی آبرو مٹی میں ملا دے۔

یعنی دن رات برستا رہے، دونوں کی متفقہ انتہائی کوشش بھی پھول کو شمشاد اور شمشاد کو پھول نہیں بنا سکتی۔

ہم بقدر صافی است آئینہ تمثال آشنا
فہم ذاتی گر نباشد ہیچ کس استاد نیست

آئینہ جتنا صاف ہوگا اتنا ہی صاف اشیاء کا عکس اس میں ظاہر ہوگا۔ آئینہ میں فطری قابلیت ہے کہ تمثال نما ہو، خارجی تاثرات کی وجہ سے ممکن ہے کہ اس کی سطح مکدر ہو، اور اس کی فطری قابلیت کا اظہار نہ ہو۔ مگر جب بھی یہ کدورت رفع ہوئی وہ تمثال نما خود بخود ہوگا۔ اسی طرح جسے مجاہدہ اور ریاضت کہتے ہیں وہ عارضی کدورت کا آئینہ دل سے رفع کرنا ہے، مجاہدہ حاقہ اور ریاضت شاقہ آئینہ میں وہ قابلیت پیدا نہیں کر سکتی جو اس میں فطری جوہر ہے، اس لئے اگر فہم ذاتی نہ ہو تو کوئی شخص مستند مدبر اور اپنے فن کا استاد نہیں مانا جائے گا۔

موجہا یکسر بہ تیغ شوخی خود بسمل اند
دل طپش فرماست این جا حاجت ارشاد نیست

امواج دریا میں اضطراب ذاتی ہے اور شوخی میں ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ موج کی صورت اور شکل بھی تلوار سے ملتی جلتی ہے اور تلوار بھی آبدار ہوتی ہے۔ موجوں کی تلواریں ایک دوسرے کو گھائل طبعاً کر رہی ہیں، اسی طرح جہاں دل ہے وہاں طپش ہے اس کے لئے کسی بیرونی تحریک یا ارشاد کی ضرورت نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ فطری قابلیت مقدم ہے اس کے بعد مناسب اسباب جو اس قابلیت کو ظاہر کریں، اور ایک دانہ میں قابلیت تو ہے کہ وہ شجر بن جائے اور پھول اور پھل لائے مگر اس کے لئے قابل زمین اور آبیاری کی ضرورت ہے جو خورد و نوش کا سامان مہیا کرے۔ اگر مناسب

اسباب مہیا نہ ہوں تو فطری قابلیت اور استعداد کا ظہور نہ ہوگا۔" بکسلے
(   ) کہتا ہے کہ "انسان خود فطرت (   ) کی ایک
صنعت (   ) ہے، اس لئے انسانی فن یا آرٹ خود فطرت کی صنعت
ہے۔" انسان غلط فہمی سے یہ سمجھتا ہے کہ آرٹ کا موجد وہ خود ہے حالانکہ
فی الحقیقت فطرت ہے، بیدل بھی یہی کہتا ہے کہ "خود را بتو خود نمودن
ہنر اوست" یعنی یہ فطرت ہی ہے جو تجھ میں کارفرما ہے اور تجھ میں اپنی
صنعت کا مشاہدہ کر رہی ہے، اور یہ بھی اس کا ہنر ہے کہ تو سمجھتا ہے کہ
"میں ہوں"، ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہتا ہے کہ اگر تو خود شناس ہے
تو فی الحقیقت تو ہی ہے، تیرا غیر نہیں ہے، یہ وہم ہے کہ تو نے مؤثر اپنا غیر
سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے کہ تیری نظر کثرت پر ہے جو خارجی اسباب ہیں اور
تو اسی عالم اوہام میں سرگرداں ہے، حالانکہ اگر تو نہ ہو تو سب کچھ ہیچ ہے
اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ بیرونی کائنات بھی تیرے
قلب میں موجود ہے "ظاہر ایں جا باطن است و باطن ایں جا ظاہر است"
لیکن تیرے قلب میں ایک قابلیت ہے جو بیرونی دنیا میں نہیں۔ اس لئے
تیرے قلب کو خارجی کائنات پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے۔ اسباب خارجی
محدود ہیں اور تیرے قلب کی قوتوں کا عمل غیر محدود ہے اس لئے اگر تو بلندی
فہم وغیرہ چاہتا ہے تو اسی قلب کی سیر کر۔ جتنا کسی کا فہم بلند ہوگا اتنا ہی
اللہ کا جو اصل مقصد ہے قرب حاصل کرتا جائے گا۔ اور جتنا پست ہوگا
اتنا ہی اس کا خدا پست ہوگا۔ اصل مقصد ہمیشہ ہمارے فہم سے بالاتر
رہے گا۔ اگر ہم اس کی سطح پر پہنچ جائیں تو ارتقاء ختم ہو جائے گا۔ اور یہ
ناممکن ہے۔ یہ سلسلہ تجدد امثال اور ارتقاء ہمیشہ جاری رہے گا۔
اگر یہ نہ ہو تو نظام عالم بھی قائم نہ رہے گا۔ اور موت و حیات کا
تصور بھی محو ہو جائے گا۔

"خودی" پر بیدل نے سیر حاصل بحث کی ہے اس کا نظریہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات ہماری معرفت سے بے نیاز ہے۔ منشاءِ حق یہ ہے کہ انسان خود شناس ہو۔ مثنوی عرفان میں "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" کے تحت اس نے یہی بحث کی ہے، لیکن خودی کے اعلیٰ مقام پر انسان پہنچ نہیں سکتا جب تک پہلے شمشیر "لا الٰہ" سے تمام ماسویٰ کو فنا نہ کرے یعنی "وحدت" کا صحیح تصوّر اس کے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ کثرت خارجہ کے تصوّرات کا اس کے دل پر ہجوم نہ ہو۔ اس لئے اسے سب سے پہلے "از خود تہی" ہونا چاہئے۔ اس موضوع پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دردسر جہان درخور دانش است و بس
نیست بکسب عافیت غیر جنوں مفید ما

عقل اور عشق ایسا موضوع ہے جس پر حکماء نے اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے بحث کی ہے لیکن اس حقیقت پر سب کا اتفاق ہے کہ اعمال کی محرک عقل نہیں جذبات ہیں۔ اگرچہ بیدل عقل و عشق کے اصطلاحی فرق کو مدِّنظر رکھتے ہوئے دونوں کا دائرہ عمل و اثر بھی واضح کرتا ہے مگر یہ بھی کہتا ہے کہ عشق "عقل پختہ" کا دوسرا نام ہے۔

نیست تدبیر وداع دردسر کار کمی
بے تمیزاں عقل کامل را جنوں نامیدہ اند

یعنی عالم اسباب خارجی میں سرگردانی عقل دور اندیش کی وجہ سے ہے اور ہیں دردسر سے نجات کی صورت جنوں پیدا کرتا ہے۔ حقیقت میں تلاش مقصد میں جو کشمش درکار ہے اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہی "دردسر" اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب مقصد سے ہمیں دل بستگی نہ ہو۔ جب اس سے کامل اُلفت ہوگی تو یہ ذوق و شوق ہیں

بدل جائے گا۔یہی احساس ہے جس کی شدّت اصطلاح میں "جنون" سے موسوم ہے۔یہی وہ لو ہے جو دل کو لگی ہوئی ہوتی ہے، اور اسی دُھن میں انسان اس مقصد کے سوا دنیا و مافیہا بلکہ اپنے آپ سے غافل ہوتا ہے صرف مقصد ہی مرکز توجہ ہوتا ہے اس میں انہماک اور استغراق کا نام جنوں ہے اُٹھتے بیٹھتے پہلوؤں پر اسی کا ذکر اور اسی میں فکر، اسی کو جنوں کہتے ہیں۔ کفار مکہ آں حضرتؐ پر بھی یہی پھبتی جماتے کہ اس کو جنون ہے۔

"وادیٔ ایمن" میں حضرت موسٰی سے سوال ہؤا کہ اے موسٰی تیرے ہاتھ میں کیا؟ جواب دیا کہ "عصا" اس سے میرے ہزاروں کام نکلتے ہیں۔ راعی رعایا کو اسی لاٹھی سے ہانکتا ہے۔میری زندگی کا سہارا ہے، فرمایا کہ ہاتھ سے پھینک دے۔جب پھینک دیا تو دیکھا کہ یہ سانپ ہے، بھاگنے لگے تو ارشاد ہؤا کہ مت ڈر، اسے پکڑ لے یہ اپنی اصل سیرت میں تیرے ہاتھ میں کام کرے گا۔یہ آیات "متشابہات" قرآن میں صحف موسٰی کی ہیں، تاویل جو قرآنی محکمات میں کی گئی ہے یہ ہے کہ عصا و یدبیضا دو "برہان" تشبیہی و تنزیہی تھے جو موسٰی کو عطا ہوئے۔ عقل کا عمل "تشبیہ" میں ہے۔ید بیضا نورِ حق ہے۔یہ تنزیہ ہے۔آفتاب کو آفتاب کے نور سے دیکھنا ہے۔تشبیہ میں اشیاء کی معرفت مماثلت اور مشابہت سے دریافت کرنا ہے۔یہ عصائے کور ہے۔

چوں یقین منحرف افتاد دلائل بالید
راستی رفت کہ ممنون عصایم کردند

کور مادر زاد کو تشبیہ سے خواہ کتنا سمجھانے کی کوشش کرو کہ آفتاب ایسا اور ایسا ہے وہ ہرگز دیدہ بینا کی طرح آفتاب کا مشاہدہ نہیں کرسکتا۔ استدلال عقلیہ کی نسبت علامہ محمود شبستری گلشن راز میں کہتے ہیں کہ

رہ دور و دراز است ایں رہا کُن چو موسٰی اندریں ترک عصا کُن

عارف رومی کا ارشاد ہے کہ "این عصا چہ بود قیاسات و دلیل"۔ اور یہ کہ "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب" آفتاب کی روشنی بازغ ہے اس لئے از عصا و زعصا کش فارغ است۔"

حقیقت یہ ہے کہ "عقل" ایک آلہ کار ہے۔ اگر "نفس امارہ بالسوء" کے ہاتھ میں ہو تو خطرناک سانپ ہے، توراۃ (کتاب پیدائش) میں لکھا ہے کہ شیطان نے آدم و حوا کو سانپ کی شکل میں فریب دیا "جو مخلوقات میں سب سے زیادہ عقلمند ہے" اور اگر یدِ بیضا قبضۂ تصرف میں ہو تو سبحان اللہ، اس سے وہ کام نکلتے ہیں جن کے لئے اس کی تخلیق ہوئی ہے ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ اہلِ ہوا و ہوس اس سے کیا کام لیتے ہیں، اور علماء و صلحاء اس کی خوبیوں کو کس طرح جلوہ دیتے ہیں۔ غالباً خواجہ حافظ نے بیدل کی نسبت ہی ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

بیدلے در ہمہ احوال خدا با او باد
او نمیدیدش و از دور خدا را می کرد
دیدمش خرم و خنداں قدح بادہ بدست
و اندراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد
گفتم ایں جام جہاں بیں بتو کے داد حکیم
گفت آں روز کہ ایں گنبد مینا می کرد
آں ہمہ شعبدہ ہا عقل کہ می کرد آں جا
سامری پیش عصا و یدِ بیضا می کرد

یہ تمام اختراعات و ایجادات جو مادی دنیا میں ظاہر ہو رہی ہیں اہلِ علم و فضل عقل ہی سے کر رہے ہیں، اور اہلِ ہوا و ہوس ان سے وہ کام لے رہے ہیں جو محض شیطنت ہے۔ بیدل عقل کی نفی نہیں کرتا وہ کہتا ہے کہ

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

اس شعر پر علامہ اقبال مرحوم نے تضمین کی ہے جو تبرکاً درج ذیل کی جاتی ہے، یہ اس شعر کی شرح بھی ہے۔

تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ
ناداں ہیں جن کو ہستی غائب کی ہے تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا
ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم تراش
"محسوس" پر بنا ہے علوم جدید کی
اس دَور میں ہے شیشہ عقاید کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام
ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش
کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور
مجھ پہ کیا ہے مرشد کامل نے راز فاش
با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

علامہ اقبال مرحوم کے اشعار کا یہ مطلب ہے، فلسفہ مغرب (یورپ اور امریکہ) ایسی ہستی کا منکر ہے جو محسوس نہ ہو، اس لئے وہ ہستی جسے مذاہب واجب الوجود تسلیم کرتے ہیں اور جو برتر از قیاس و گمان و وہم ہے مغربی فلسفیوں کے نزدیک محض توہم ہے، ایک بُت ہے جو اہلِ مذاہب نے تراشا ہے اور اس کی نادیدہ پوجا کرتے ہیں حقیقت میں یہ موجود نہیں، اگر ہے تو ان لوگوں کے وہم میں ہے۔ علوم جدیدہ کی بُنیاد محسوسات پر ہے۔ اہلِ مذاہب کے وہ عقاید جو مابعد الطبیعۃ پر مبنی ہیں وہ اب علوم جدیدہ

نے غلط قرار دیئے ہیں، مگر فلسفۂ زندگی کا نظریہ کچھ اور ہے اور یہ راز ہستی مجھے مرشد کامل بیدل نے بتایا ہے کہ محض عقل سے ہستی کی گتھی نہیں سُلجھ سکتی۔ اسے سلجھانے والا وہ ہے جسے اصطلاح میں عشق یا "جنون" کہتے ہیں جو عقل کی ضد ہے۔ بیدل تو عشق کو عقل کامل کہتا ہے، یہ عقل خام ہے جو قیاسات وغیرہ ہیں۔

بیدل کو اس سے انکار نہیں کہ جو کچھ مادہ پرست فلسفی کہتے ہیں وہاں کی اپنی حد نظر ہے جسے وہ تحقیق سے موسوم کرتے ہیں، "مثنوی عرفان" میں وہ کہتا ہے کہ مادہ پرست آخر کسی ہستی کے قائل تو ہیں خواہ یہ مادہ ہی ہو، مگر وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ محسوسات ہیچ ہیں۔

بیدل یہ کہتا ہے کہ کائنات کو جس نظر سے دیکھو گے تمھیں وہی کچھ محسوس ہوگی، اگر یہ کہو گے کہ مادہ کے سوا اور کچھ نہیں جیسا پیر فلسفہ مغربی کہہ رہا ہے تو یہ ان کا اپنا قصور ہے، اس میں تھوڑی سی غلطی یہ ہے کہ وہ ایک ایسی ہستی کا انکار کرتے ہیں جو انھیں حواس ظاہری سے محسوس نہیں ہوتی اس لئے کہتے ہیں کہ ہے ہی نہیں اس کی موجودگی کا علم نہیں، عدم علم علم عدم نہیں ہے۔ امکانات اکثر پوشیدہ ہیں وہ اسی وقت محسوس اور معقول کہے جا سکتے ہیں جب منکشف ہوں ایک شخص کو ان کی موجودگی کا علم نہیں تو یہ کوئی وقیع دلیل اس دعویٰ کی نہیں کہ یہ فی الحقیقت موجود ہی نہیں۔ ایک شے جو محسوس ہو ضرور نہیں کہ خارج میں موجود ہو، ہمارے توہمات کا عکس بھی ہو سکتی ہے۔ تمام ذہنی امور خارج میں موجود نہیں ہوتے، اس لئے کسی شے کی صداقت کا معیار ہمارے پاس عقل ہے۔ محسوسات اگر معقول نہیں تو وہ توہمات ہیں۔ بقول امام غزالی محسوسات کی غلطی عقل ہی دفع کرتی ہے، مگر وہ خود بھی غلطی سے پاک نہیں۔ اگر ایسی صورت ہوتی تو ذہنی ارتقاء ہی نہ ہوتا۔ جیسے بہائم کی حالت ہے انسان کی بھی ہوتی وہ غلطی نہیں کرتے مگر ترقی بھی نہیں کرتے۔

کسی شے کی موجودگی کا احساس یا انکشاف کئی طریق سے ہوتا ہے، حسیات اور عقلیات کا منکر تو پیرِ فلسفہ مغربی بھی نہیں، لیکن یہ کافی نہیں۔ ہمارا دل کبھی کسی زمانہ میں اس سے مطمئن نہ تھا اور نہ ہوگا، ہر ایک زمانہ میں حکماء کو ایک ایسے وجود کی جستجو رہی ہے جسے واجب الوجود یا حقیقۃ الحقائق کہتے ہیں، اور اس پریشان کن "کثرت" میں "وحدت" کی تلاش کرتے رہے ہیں، اور یہ مسلّم ہے جسے "علم" کہتے ہیں وہ کثرت کو وحدت میں مشاہدہ کرتا ہے، جزو کو کل میں دیکھتا ہے، فروع کی اصل دریافت کرتا ہے، یہ حواس اور بقول علامہ اقبال "عقل خام سے ممکن نہیں، بقول بیدل "عقل کامل" سے ہستی کی گتھی سلجھ سکتی ہے جسے وہ "جنوں" سے تعبیر کرتا ہے۔

غلط فہمی پیدا نہ کرنی چاہئے، ارشاد قرآن ہے کہ جب اہلِ ذکر و فکر کائنات میں نظر کرتے ہیں تو اس صحیح نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ "ربنا ما خلقت هٰذا باطلا" اے ہمارے پروردگار تو نے یہ کائنات باطل، عبث، بے نتیجہ پیدا نہیں کی، بیدل کہتا ہے کہ

گر عین و گر اقتباس دریافتہ، در انجمن حواس دریافتہ
بر دامن جسم پاک تحقیر مدوز حق را بہمیں لباس دریافتہ

حسیات ہوں یا عقلیات یا وجدانیات اسی کسوت مادی میں ان کا انکشاف ہو رہا ہے، اس لئے بیدل کو مادہ پرست کہو یا کچھ اور اس کا سب سے اتفاق ہے بشرطیکہ وہ اس انجمن حواس صحیحہ سے باہر نہ جائیں۔ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں محض صورتیں ہیں جن کو علامہ اقبال "پیکر" سے تعبیر کرتا ہے، ان پر جو حقائق منکشف ہوتے ہیں وہ عقلاً ہوتے ہیں لیکن یہ نظام حسیات و عقلیات اجزاء فردہ میں تحلیل ہو کر رہ جاتا ہے اگر اسے "حق" نہ تسلیم کیا جائے اور تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک

اس کا مشاہدہ نہ ہو، اور یہ چشم عقل کامل یا "جنون" ہی سے ممکن ہے، مگر اس مقام پر استدلال عقلیہ بیکار ہے جیسا کہ انکشاف حقائق اشیاء میں حواس ظاہری معطل ہیں۔

بات یہ ہے کہ مادی دنیا میں عقل خوب کام کی چیز ہے۔ لیکن اس سے کام خوش اسلوبی سے لینا اہلِ دل کا کام ہے، لیکن ایسے امور بھی ہیں جن کو "مابعدالطبعیہ" کہتے ہیں۔ وہاں عقل ناکارہ ہے۔ وہاں یقین اور ایمان اور وجدان کام آتا ہے یعنی "تشبیہات" میں عقل اور "تنزیہات" میں عشق کارفرما ہے۔ حضرت موسیٰ نے فرعون کو استدلال عقلیہ سے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی، جب دیکھا کہ اس سے کام نہ چلا تو فرمایا:۔

هل لك الیٰ ان تزکیٰ واهدیک الیٰ ربك فتخشیٰ

(۳۰:۳)

کیا تجھے اس کی خواہش ہے کہ تیرا تزکیہ نفس ہو اور میں تجھے تیرے پروردگار کی طرف راستہ بتاؤں اور تو اس سے ڈرے۔

فرعون نے انکار کیا اور ہدایت سے محروم رہا۔ بیدل یقین کی نسبت لکھتا ہے کہ خواہ "ہوس" ہی ہو مگر کسب یقین سے عشق کا درجہ حاصل ہوسکتا ہے۔

دل مائل تحقیق نگردید وگرنہ
از کسب یقیں عشق تواں کرد ہوس را

یعنی تحقیق یقین کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ جہاں یہ نہ ہو وہاں استدلال عقلیہ ہی سے کام لیا جاتا ہے چشم بینا نہ ہو تو عصا ہی سہی، بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ "یقینے خفتہ در ہر پردہ ظن"۔ تمام اوہام اور ظنیات کی تہ میں یقین ہی موجود ہے جو اصل حقیقت ہے۔ "ڈیکارٹ" نے جب ہر ایک شے کو

جو خارج میں ہے شک و شبہ کی نظر سے دیکھا تو دیکھنے والے پر شبہ نہ کر سکا جو صاحب یقین ہے۔

از نقش تو دارد خلل آئینۂ تحقیق
هر جا اثر وہم و گماں رفت یقین ماند

آئینہ تو بذاتہ بے صورت اور بیرنگ ہے۔ جب ہم اس میں نظر کرینگے تو ہمارا نقش اس میں ظاہر ہو گا۔ اسی طرح آئینۂ تحقیق میں ہم اپنے اوہام و ظنیات کا اثر یا نقش دیکھتے ہیں اگر یہ نقش محو ہو تو آئینہ تحقیق جیسا کہ ہے ویسا ہی ہے۔ ہم کسی شے کو چشم یقیں کے ساتھ نہیں دیکھتے اپنے ہی توہمات و قیاسات و ظنیات کا مشاہدہ کرتے ہیں یقین اس شے کو اس کی اصلی صورت پر مشاہدہ کرنا ہے۔

تغافل زن بہ ہستی صیقل فطرت ہمنیت بس
صفائی آئینہ گر مدعا باشد مبیں خود را
ہمچو عکسے کہ برد سادگی از آئینہ ہا
ہر کہ در طبع تو جا کرد تو رفتی او ماند

یہ تو حقیقت ہے کہ آئینہ جو سادہ ہے جب کسی شے کا عکس قبول کریگا تو اس کی سادگی نہ رہے گی۔ آئینہ نہیں بلکہ وہی عکس نظر آئے گا۔ اسی طرح آئینہ دل پہ اگر نقش غیر ہو گا۔ تو یہ سمجھنا چاہئے کہ "تو رفتی و او ماند" تیری "فردیت" تیری "خودی" مفقود ہو گئی۔ بیدل پہلے شعر میں اس سے بھی بلند فکر کا اظہار کرتا ہے کہ تو بھی آئینہ فطرت میں اپنے آپ کو نہ دیکھ، تو ہستی سے اتنا غافل ہو جا کہ تیرا نقش بھی اس آئینہ فطرت میں نظر نہ آئے۔ فطرت جو اصل شے ہے باقی رہ جائے گی۔

نفسیات کے اس مسئلہ سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ کسی غلط تصوّر کو اگر ہم حقیقت ثابتہ یقین کریں تو اس کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے، وہ

بھی اسے "حق" ہی یقین کریں گے۔ اس موضوع پر فاضل "لیبان" نے روح اجتماع کے تحت محققانہ بحث کی ہے۔ اگر ہم "سراب" کو عالم آب یقین کریں تو ضرور اس کے پیچھے دوڑیں گے اور دوسرے بھی ہمارا اتباع کریں گے۔ یہ مفہوم ہے بیدل کے شعر محولہ بالا کا کہ "از کسب یقیں عشق تواں کرد ہوس را" دوسرا مفہوم یہ ہے کہ :-

متاب از عشق رو گرچہ مجازیست
کہ ایں بہر حقیقت کارسازیست (جامی)

اس شعر میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ عشق کی نوعیت تو ایک ہی ہے۔ البتہ معشوق مجازی و حقیقی ہو سکتا ہے، اور کسی وقت مجاز سے حقیقت کی طرف بھی متوجہ ہو سکتا ہے بہر حال عشق کی موجودگی مقدم ہے۔ جب احساس طلب ہی نہ ہو تو طالب اور مطلوب بھی نہ ہوں گے۔

علامہ اقبال مرحوم بیدل کا فلسفہ خودی اور بیخودی مجھ سے بہتر سمجھتا تھا۔ اس نے اس سے عملی فائدہ اٹھانا چاہا اور حالاتِ حاضرہ پر اس کا اطلاق کیا۔ ہمارے زمانہ میں برطانوی امپیریلزم سے ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کی غلامانہ ذہنیت مسلط ہو چکی تھی۔ علامہ نے پہلے تو ہندوستانیوں کو وطن کا واسطہ دلایا اور وطن کا راگ الاپتے ہوئے کہا کہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا" لیکن جب دو قوموں کا نظریہ ذہن میں صاف صاف ممیز منکشف ہوا اور یہ بھی واقعات نے سمجھنے پر مجبور کیا کہ کفر و ایمان میں ربط ناممکن ہے تو وطن کو خیر باد کہا۔ اس وقت اسلام کی ہمہ گیری اور عالمگیری کا صحیح تصوّر بھی مشاہدہ ہو رہا تھا کہ اسلام وطن اور قومیت سے بالاتر ہے جو نسلی امتیازات اور اختلاف الوان و لسان کی پیداوار تھیں۔ اس لئے کہنا پڑا کہ :-

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا

علامہ اقبال اس سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے تھے، محدود وطن سے نکل کر وسیع تر وطن کرۂ ارض کو وطن قرار دیا، مگر وطن کا تصوّر ذہن سے محو نہ ہُوا۔ وہ اب "ملّت" کے شیدائی تھے، شعورِ خودی ملّت ہی سے وابستہ تھا کہ یہ دیگر ملل میں جذب نہ ہو اور شعورِ بیخودی یہ تھا کہ ہر ایک فردِ ملّت ملّت سے وابستہ رہ کر ہی اور ملّت میں اپنی انفرادی خودی کو محو کر کے اپنا شعورِ ملّت یا خودی برقرار رکھ سکتا ہے۔

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

بیدل کا نظریہ خودی و بیخودی اس سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ علامہ اقبال پر ماحول کا اثر پڑا۔ لیکن بیدل کا ماحول ایک اسلامی حکومت تھی۔ بیدل مذہب و ملّت سے بھی آزاد ہے۔

در مشرب زن از قیدِ مذاہب بگریز
عافیت نیست دراں بزم کہ سازش جنگ است

مے کشی کردیم و آسودیم از تشویش وہم
گردچندیں مذہب از یک جرعہ مشرب شست

موج ایں دریا تکلف پرورِ گرداب نیست
طینت آزاد بیرون تاز وہم مذہب است

حسد تا کے، تعصّب چند، اگر دردے داری
نیاز زاہداں بے خبر کن درد دینی را

ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ مشرب آزادگاں یہ ہے کہ مذاہب

کی قید سے آزاد ہیں۔ مذاہب کیا ہیں؟ جنگ و جدل کا ساز و سامان۔
علامہ اقبال نے کیا اچھا کہا ہے کہ

سچ کہدوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدہ کے بُت ہو گئے پُرانے
آپس میں بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خُدا نے

خدا پرستی اور بشری شخصیت پرستی میں فرق یہ ہے کہ خدا پرستوں میں کبھی جنگ و جدل نہیں ہوتا۔ آں حضرتؐ کی صحیح حدیث ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں تم کو ایک بات بتاؤں کہ تم ایک دوسرے سے برسرپیکار نہ رہو، وہ ہے یاد خدا، جب ہم یہ سمجھ لیں گے۔ ہم سب کا خدا ایک ہے اور ہم سب اس کے بندے ہیں اور اللہ فساد اور مفسدین کو پسند نہیں فرماتا اور یہ کہ حسب ارشاد قرآن اللہ کی طرف رجوع کریں تو ہمارے سب اختلافات مٹ جائیں گے۔ یہ اصل مذہب، اصل دین، اصل ملّت ہے۔ شخصیت پرستی بُت پرستی ہے جب ان کو "اربابًا من دون اللہ" بنایا جائے تو ان خداؤں کی کثرت ایک دوسرے سے دست و گریبان رہے گی، اور تاریخ مذاہب میں یہ امر واقعہ ثابت شدہ ہے۔

جنگ ہفتاد و دو ملّت ہمہ را عذر بنہ
چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند (حافظ)

مذاہب سب کم و بیش انسانی اختراع ہیں لیکن اسلام دین اللہ ہے، "لہ اسلم من فی السمٰوات والارض" یہ کل کائنات کا دین الفطرت ہے۔ کائنات میں عالم انسانیت بھی شامل ہے۔

مشرب آزادگان اس قید مذاہب سے باہر نکلنا ہے بدین اللہ میں کوئی الجھن نہیں، بھول بھلیاں نہیں، یہ وہ دریا ہے جس میں بھنور

نہیں کہ خطرہ ہو، اہل دیں "لاخوف علیھم ولاھم یحزنون" ملیت آزاد بیروں تاز و ہم مذہب است" مذاہب اوہام کا گرداب ہیں۔ اس کے چکر میں جو آیا بمشکل اس سے باہر نکل سکتا ہے، مذاہب کے نام پر اہل مذاہب میں تعصب اور حسد اور کینہ، ایک دوسرے کا انکار اور اختلاف اور تفرقہ اور جنگ و جدل غرض ہر ایک بیہودگی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ برخود غلط یہ سمجھتے ہیں کہ یہ فتنہ وفساد جو مذہب کے نام پر برپا کر رہے ہیں در دینی کا تقاضہ ہے۔ اور کار ثواب ہے۔ یہ سب کچھ شخصیت پرستی کا نتیجہ ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ میرا مذہب عشق ہے۔

بغیر عشق ندانیم ہیچ آئینی گزیدہ ایم چو پروانہ سوختن مذہب

اور یہ کہ:۔

از تعصب جاہلاں دین ہدیٰ را دشمن اند

عاقبت در جنگ ایں کوراں عصا خواہد شکست

جہاں مذاہب ہیں وہاں دینی ( ) حکومت ہے اور ارباب حکومت پادری، پنڈت اور ملاں ہیں اور یہی دراصل دنیوی ( ) حکومت ہے، بہرحال ایک بیکار جماعت برسر اقتدار حاکم اور عوام محکوم، آزادی فکر ختم، اس کے ساتھ ذہنی ارتقا مفقود، نتیجہ ظاہر ہے۔ اپنی خودساختہ حکومت کے قیام کے لئے جنگ وجدل۔ اسلام نے ہر ایک حکومت خواہ دینی ہو یا دنیوی جس کے نام پر چالاک آدمی اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں مٹا دی۔ اگر ہم مسلمان ہیں، تو سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ کا بندہ غیراللہ کا بندہ نہیں ہو سکتا۔ غیراللہ کا بندہ مشرک ہے اور شرک کا تقاضہ فتنہ وفساد ملک۔ خدا اور بندگانِ خدا میں پیدا کرنا ہے۔

غرض اسلام مشرب آزادگان ہے وطن اور قومیت اور مذہب

اور ہر ایک قید رسوم مذموم جو اہل غرض کی اختراع ہے اور مایہ تشویش ریش اور جبّہ و دستار اور سبحہ و زنار جو مذہبی تقدّس کے آثار ہیں بیدل کے نزدیک مردود ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ریش بیدل نے شہنشاہ دین پناہ اورنگ زیب عالمگیر کا عہد شروع سے آخر تک پایا "اکبر" جس کو عالمگیر "خدا کفر کہتا تھا تراش ریش پسند فرماتا تھا، عالمگیر نے اسے بھی ایک اہم شرعی مسئلہ قیاس کیا جس کی خلاف ورزی ہو رہی تھی اس لئے داڑھی بڑھانے کا امر فرمایا۔ بیدل کہتا ہے کہ

امروز شہے دگر در منع کشود — دی بادشہے تراش ریش خوش بود
جز پشم نبود کہ کاہید و فزود — در دیدہ اعتبار از حکم دو شاہ

ایک غزل ریش پر ہے۔

غیر تشویش چہ معنی دارد — ایں قدر ریش چہ معنی دارد

اتنی لمبی داڑھی کی غرض غیر تشویش اور کیا ہو سکتی ہے

مرد حق میش چہ معنی دارد — آدمی خرس چہ ظلم است آخر

اتنے لمبے بال خرس اور گوسپند ہی کے ہوتے ہیں، آدمی کے چہرہ پر زیب نہیں دیتے مرد حق بکری بن جائے تو نہ معلوم اس کا کیا فائدہ ہے۔

ایں کم و بیش چہ معنی دارد — یک نخود کلہ و دہ من دستار

خوبصورتی موزونی کا نام ہے، چنا بھر تو سر ہو اور اس پر پورا کپڑے کا تھان پگڑی ہو تو توازن قائم نہیں رہتا اور یہ کمی بیشی موزونیت کے خلاف ہے۔

ملت و کیش چہ معنی دارد — بیدل ایں جا ہمہ ریش است و فش است

مقطع میں بادشاہ پر چوٹ کر گیا ہے کہ ملت و کیش تو صرف ریش و فش میں محو ہو کر رہ گیا۔

چند اشعار بغرض تفنن اور ملاحظہ ہوں :-

بیدل از افسوں گریت خرس و بز آدم نشود
چنگ بر ریش مزن از ہوس شانہ برآ

اگر ریچھ اور بکرے کو جادو کے زور سے آدمی بنانا مقصود ہو تو ناممکن ہے۔ ہر وقت داڑھی پر ہاتھ پھیرنا اور شانہ کرنا تاکہ اس میں موزونی اور صفائی پیدا ہو جو آدمیت کا تقاضہ ہے، بے فائدہ ہے جب اصل شے ہی انسانیت سے بعید ہے۔

از چہ پروانہ بزرگی نفروشد زاہد
ریش بر تافتہ کم نیست بز اخفش را

اخفش مشہور نحوی عربی زبان کا ہے۔ اس نے ایک بکری پال رکھی تھی۔ اسے اپنے سامنے باندھ کر صرف و نحو کے درس میں مشغول رہتا، اور کسی پیچیدہ مسئلہ پر بحث کرتا ہوا پوچھتا کہ کیا یہ بحث صحیح ہے؟ بکری عادتاً سر ہلاتی۔ اگر مسئلہ مزید غور کے بعد غلط ثابت ہوتا تو بکری کی خیر نہ تھی، خوب پیٹتا۔ اس شعر میں تلمیح یہی ہے کہ لوگوں میں مشہور ہو گیا تھا کہ اخفش تو خیر جو کچھ ہے سو ہے اس کی بکری بھی کسی نحوی سے بزرگی میں کم نہیں، بیدل زاہد پر چوٹ کرتا ہے کہ زاہد کی بزرگی میں کیا کلام ہو سکتا ہے ریش و فش بز اخفش سے کم نہیں۔

زاہد ز عیش رنداں پر غافلست بیدل
فردوس در ہمیں جاست گر ریش و فش نہ باشد

اس شعر میں بھی تلمیح ہے کہ بہشت میں سب عالم شباب میں ہونگے اور کسی کی داڑھی نہ ہوگی۔ اگر زاہد سمجھے تو فردوس یہی دنیا ہے۔

بہشت ایں جا بہار ایں جا نشاط ایں جا نگار ایں جا
تو کز خود غافلی صرف عدم کن دور بینی را

اور اس راز کو داڑھی منڈے رند ہی خوب سمجھتے ہیں جس سے زاہد مطلق بے خبر ہے۔

جز خارق معکوس مداں ریش وفش شیخ
آدم خری کرد و دم و یال بر آورد

اسے شیخ کی کرامت ہی سمجھنی چاہئے اگرچہ یہ اُلٹی کرامت ہے کہ آدم تنزل کر کے گدھا بن گیا اور دم اور یال ریش وفش سے پیدا ہوئے۔

سبحہ و زنار

بیدل سرایں رشتہ بہ تحقیق نہ پیوست
در سبحہ و زنار جہانے دل و دیں داشت

بظاہر اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ بیدل ہمیں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک دُنیا سبحہ و زنار کی دلدادہ ہے اور اسی کو دین سمجھتی ہے تحقیق کو اس سے کیا نسبت ہے۔ یا سبحہ و زنار کے گرفتار تحقیق یا تقاضہ دل و دین کو نہیں سمجھ سکتے۔ اُنھوں نے سبحہ و زنار سے رشتہ جوڑا ہُوا ہے اور حق سے توڑ رکھا ہے۔

تاب وتب سبحہ بہل، رشتہ زنار گسل
قطرہ می جوش زن و بر خط پیمانہ بر آ

سبحہ کے لئے "تاب وتب" نہایت موزوں الفاظ ہیں۔ اور قطرہ مے سے تشبیہ بھی لاجواب ہے۔ یعنی مشرب آزادگان تو یہ ہے کہ بادہ آزادی جوش پر ہو اور پیمانہ فکر لب تک لبریز ہو "خط پیمانہ" اور زنار میں مشابہت لطیف ہے۔ خط پیمانہ بھی پیمانہ کے گرد لپٹا ہُوا ہوتا ہے جیسے زنار۔ جو رسم اور مذہب پرست ہیں وہ سبحہ و زنار کی قید میں گرفتار ہیں تو یہ زنجیریں توڑ پھوڑ کر رکھ دے اور نشۂ آزادی میں سرشار رہ۔

چوں سبحہ دریں معبد عبرت چہ جنوں است
ذکر حق و برہم زدن و سر شکنیہا

پیداست شغل زاہد وقت دگر چہ باشد
سرہا بیک دگر کوفت ہرگہ کہ یاد حق کرد

زمین ایک مسجد ایسی ہی ہے جیسے سموات، جہاں ہر ایک شے ذات باری کے حضور سجدہ کر رہی ہے۔ اس معبد میں تو عبادت الٰہی میں مشغول رہنا چاہئے۔ لیکن ان زاہدوں اور تپسویوں کے سر پر کیا وحشت سوار ہے کہ تسبیح اور مالا کے دانوں کی طرح خدا کی یاد کرتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو بحث و مباحثہ میں نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے ہوئے اور ایک دوسرے کا سر پھوڑ رہا ہے۔

ازبسکہ تنگ بود گذر گاہ اتفاق
چوں سبحہ خلق جز بسر یک دگر نرفت

بیدل نے سبحہ و زنار پر بہت شعر لکھے ہیں بغرضِ تفنن یہ بھی ملاحظہ ہوں۔

سختی دل نامہ را سنگ راہ آزادگیست
رشتہ تا صاحب گرہ باشد رہش ہموار نیست

جمعیت دل است مدارائی کفر ھم
چوں سبحہ کوچہ داد بزنار دین ما

گر ہمہ کفر است نتواں سر ز ہمواری کشید
سبحہ را دیدم طواف حلقۂ زنار داشت

نقطہ دل گرد خود گشت و خط پرکار شد
گردش این سبحہ تا ہموار شد زنار شد

ان اشعار میں جو تخیل کارفرما ہے وہ غالب کے اس شعر میں بھی ہے۔

زنار ہیں، سبحہ صد دانہ توڑ ڈال
چلتا ہے راہرو رہ ہموار دیکھ کر

صراط مستقیم یا راہ ہموار ہی منزل تک جاتی ہے۔ بیدل نے رشتہ سبحہ کو کوچہ اور سیدھے راستہ سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خواہ یہ کفر ہی ہے مگر "ہمواری" بہرحال پسندیدہ ہے۔ سبحہ کے دانے بھی حلقہ زنار کے گرد طواف کرتے ہیں، اور اگر دانہ سبحہ (منکا) کو دل تصوّر کیا جائے تو وہ بھی اپنے ہی گرد طواف کر رہا ہے، اور خطِ پرکار کی طرح جس نقطہ سے شروع ہُوا اسی پر آکر ختم ہوتا ہے۔ اس کی گردش جب تک ہموار ہے زنار کی صورت ہے، مطلب یہ ہے کہ جادۂ تحقیق پر انسان خواہ کتنی تگ و دو کرے اس کا مقصود اپنی ہی "خودی" ہوتی ہے۔

"ایں آئینہ سخت خود پرستی دارد"

درِ وادیٔ عشق اگر دیدن باشد ۔ بر جادۂ غیر خط کشیدن باشد
ما و سفرے کہ ہمچو خط پرکار ہر جا برسی بخود رسیدن باشد

رسم و عادت

زندگی در بند و قید رسم و عادت مردن است
دست دست تست بشکن ایں طلسم ننگ را

اہلِ مذاہب ہمیشہ اپنے آباد اجداد کی روش پر چلتے ہیں اور یہ رسم و رواج کی پابندی ہے۔ اصطلاح میں اس کورانہ تقلید کو "تعامل" کہتے ہیں۔ یعنی جو عمل صدیوں سے بزرگ کرتے چلے آئے اسی پر کاربند رہتے ہیں، یہ رجعت پسند وہی پرانی لکیر پیٹتے چلے آتے ہیں جو کسی وقت کسی بزرگ نے خارجی حالات کے مناسب اختیار کی تھی، اس کی مذمت قرآن حکیم نے فرمائی ہے۔ ان پر ذہنی جمود چھایا ہوا ہوتا ہے اور ترقی یافتہ زمانہ کا

ساتھ نہیں دے سکتے یہ کہنا چاہیئے کہ زندگی کا جو کچھ تقاضہ ہے یہ بے حس اس سے بالکل غافل ہوتے ہیں، قومیں اسی جمود اور بے حسی کی وجہ سے مٹتی رہیں۔ اور ہلاک ہوگئیں۔ بیدل کہتا ہے کہ اس رسم و عادت کی قید و بند میں قومیں زندہ نہیں رہ سکتیں، اللہ نے تجھے دست و بازو دیئے ہوئے ہیں ان اغلال اور سلاسل کو جو تیرے گلے کا ہار ہو رہے ہیں توڑ پھوڑ کر آزاد ہو جا، یہ "طلسم ننگ و نام" ہے، لوگ اس سے اتنے مسحور ہیں کہ کوئی جرأت نہیں کرتا کہ اسے توڑے، بدنامی سے ڈرتے ہیں اور بدنام کرنے والے جاہل رسم پرست رشتہ مؤدت بھی توڑ دیتے ہیں مگر رسم و عادت کے خلاف کوئی بات سُننا بھی گوارا نہیں کرتے۔

گرفتار رسوم اندیشہ آرام کم دارد
عقاید آنچہ دارد خدمت دیر و حرم دارد

جو لوگ رسموں کے سختی سے پابند ہیں وہ تو ہمیشہ شُبھ گھڑی شُبھ لگن مہورت دریافت کرتے رہتے ہیں، دیر کی یاترا اور حرم کا حج خواہ استطاعت نہ بھی ہو ضرور کرتے ہیں۔ دل میں پکڑ دھکڑ رہتی ہے کہ یہ رسم ادا نہیں ہوئی اور وہ کمی رہ گئی۔ غرض اپنی آسائش کے آپ دشمن ہیں۔ اپنی خدمت کرتے تو آرام و آسائش کے طالب ہوتے دیر و حرم کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اس لئے آرام حرام کر رکھا ہے۔ گرفتار رسوم آزادی کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں۔

بیدل تو جنوں کن وزیں ورطہ بدر زن
عالم ہمہ زندانی تقلید و رسوم است

آزادی پر بیدل نے دادِ تحقیق دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادیٔ فکر محال ہے اگر انسان کے دل و دماغ پر عقاید اور رسم و عادت مسلّط ہوں ان سے کنارہ کش ہو کر ہی آزادی ممکن ہے، اور حکومت خواہ اس کی

صورت کچھ بھی ہو سدِّ راہ آزادی ہے۔ ضمیر کی آواز بلند کرنا جرم ہے۔ صداقت اور حقانیت کا انکشاف نا ممکن ہے اگر آزادی نہ ہو۔ انبیاء نے ہر ممکن تکلیف کفار کے ہاتھوں سے برداشت کی، ابتلا میں ثابت قدم رہے اور لوگوں پر حقانیت واضح کی، جویائے حق مرد دلیر شیر دل ہوتا ہے۔

"شیر مرداں را نباید بر طریق میش رفت"

بیدل کہتا ہے کہ

گر عروج آہنگی از زندانگہ گردوں برآ
مے سراپا نشہ شد تا دامن مینا گذاشت

لفظ "مینا" میں کیا لطافت پیدا کی ہے۔ آسمان مینا رنگ ہے اور شراب بھی مینا (صراحی) میں ہوتی ہے، شراب مینا سے باہر آ کر ہی نشہ بنتی ہے۔ اسی طرح اگر تو عروج کی خواہش کرتا ہے تو گردوں سے بالا تر پرواز کر، نشہ بھی دماغ کو عروج کی طرف لے جاتا ہے۔

زندگی زیں انجمن یک گام آزادی نخواست
ہر کرا دیدیم زیں جا بعد مردن رفتہ است

جسے آزادی کہتے ہیں اور جس کا تصور بیدل کے ذہن میں ہے وہ خود کہتا ہے کہ نا ممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور ہے۔ زندگی خود ایک قید ہے۔

محو زنجیر نفس بودن دلیل ہوش نیست
ہر کہ می بینی بقید زندگی دیوانہ است

اور اس قید میں جب تک ہے ایک قدم آزادی کی طرف اٹھ نہیں سکتا۔ البتہ جس کسی کو میں نے دیکھا مر کر ہی زندگی سے آزاد ہوا۔ اگرچہ کامل آزادی اس دنیوی زندگی میں ممکن نہیں مگر اتنا تو ہو کہ رسم و رواج کے اغلال و سلاسل کا بوجھ جہاں تک ممکن ہو ہلکا ہو۔

بیدل کا نظریہ مذاہب یہ ہے کہ ہر ایک ملّت اصل کی فرع ہے لیکن اہل ملّت اصل کو جو غیر مرئی ہے اور محسوس نہیں ہوتی بھول جاتے ہیں اور فروع کو جو محسوس ہوتی ہے پیش نظر رکھتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔

شیشہ و سنگ آتش و آبند دور از کوہسار
عالمے با ہم، جُدا از اصل، دشمن می شود

پتھر میں آگ ہے اور شیشہ میں آب، اور آگ اور پانی کا آپس میں بیر ہے۔ پتھر اور شیشہ کی ایک ہی اصل پہاڑ ہے لیکن اصل سے جُدا ہو کر دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ یہ تو شاعرانہ تخیل ہے اور لطیف ہے، امر واقعہ بھی یہی ہے کہ عالم انسانی کی اصل انسانیت ہے اور سب مرد و زن "نفس واحدہ" میں جو اصل ہے متحد ہیں، لیکن یہ کثرت جو عالم انسانی میں مشاہدہ ہو رہی ہے اور یہ اختلاف الوان ولسان نفس واحدہ کی فرعیں ہیں اور باہم دست و گریباں ہیں۔ اگر انسانیت کا صحیح تصوّر ان کے ذہن میں ہوتا تو اصل سے ذہنی پیوستگی آشتی پرلے آتی۔ اصل سے جُدا ہو کر فروع ہو کر ایک دوسرے کو اپنا "غیر" تصوّر کر رہے ہیں، حالانکہ اگر اصل پر نظر ہو تو ایک دوسرے کا "عین" ہے۔

از اصل دور ماند جہانے بذوقِ فرع ماہم یک آبگینہ بخارا زدیم پا

نومید اصل رفت جہانے بذوقِ فرع تا وضعِ قطرہ داشت ز دریا گہر نرفت

جب تک گہر کی وضع قطرہ آب کی تھی دریا سے پیوستہ رہا جو اس کی اصل ہے۔ لیکن "ذوقِ فرع" میں اصل سے جُدا ہو گیا۔ اب تو اس میں اب بھی ہے مگر دریا تر دامن ہے نہ خشک۔

اخلاقیات

"خلق" اور "خلق" دونوں ایک ہی لفظ ہیں حرکات کی تبدیلی سے مفہوم میں یہ فرق ہے کہ "خلق" ظاہری صورت کی بناوٹ ہے جو محسوس ہوتی ہے اور "خلق" ذہنی ہیئت ہے، اور "عادت" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسی سے کسی شخص کی ذہنی حالت کا پتہ ملتا ہے، اخلاق پر بیدل نے بہت کچھ لکھا ہے، اسی کی ذیل میں وہ سب باتیں آجاتی ہیں جن سے اخلاق کی درستی ہوتی ہے، مثلاً پند و نصائح، اوصاف حمیدہ اور خصائل ذمیمہ، نیک و بد کا بیان، بیدل کا نظریہ خلق یہ ہے کہ خلق معرفت سے افضل ہے اور کریم عارف سے اکمل ہے، خلق و کرم جوہر ذاتی ہے اور علم کسبی، حق تعالیٰ نے آنحضرتؐ کی ستائش خلق عظیم کی ہے (انک لعلیٰ خلق عظیم) صفت عارف و عالم ایسی بات نہ تھی کہ قابلِ ذکر ہو۔

بیدل ایسی نصیحت مذموم سمجھتا ہے جو فضیحت ہو اور جو ناصح کا خود عمل نہ ہو۔ بقول عارف رومی:-

ہر کسے ناصح برائے دیگراں　　ناصح خود یافتم کم در جہاں

حافظ بھی کہتا ہے کہ

واعظاں کیں جلوہ بر محراب منبر می کنند
چوں بجلوت می روند آں کار دیگر می کنند
مشکلے دارم ز دانش مند شہر ایں باز پرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

اور یہ کہ وعظ بے عملاں واجب است نشنیدن"۔ بیدل چہار عنصر میں لکھتا ہے کہ دنیا میں ہر ایک شخص اپنے اپنے حال میں مست ہے تو خود ناداں ہے کہ دانا ناصح مشفق بن کر لوگوں کے اوقات میں خلل انداز ہوتا ہے، ہر ایک سر میں کسی نہ کسی امر کی دُھن ہے، تکلف آمیز باتیں بنانا کیا ضرور ہے، تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو، اگر تیرے دم میں کچھ اثر ہے تو اپنے آپ پر صرف ارشاد کر تا کہ لوگ تجھے ہرزہ گو نہ سمجھیں، اور اگر تیرا ناخن رسا ہے تو اپنی ہی گرہ کھول، دوسروں کے دل کو زخمی کیوں کرتا ہے۔ بہر حال پند و نصیحت "فرخندہ بخت آنکہ بسمع رضا شنید" لیکن

بر دل کس نخوری از دم سرد   وعظ بے جا ہمہ جا مردود است

سب سے بہتر عملی نمونہ "اسوۂ حسنہ" ہے، زبانی وعظ ہمیشہ بے اثر ہی ہوتا ہے۔

پند ناصح پر منغص کرد وقت مے کشاں
از کجا آورد ایں خر نغمہ جانکاہ را

بیدل کہتا ہے کہ

من و ما ہر چہ دارد رغبتے و نفرتے دارد
جہاں وعظ است لیکن گوش کو باید نصیحت را

لوگوں میں نفسانیت کی وجہ سے خود غرضی، خود ستائی، خود نمائی مشاہدہ ہوتی ہے، اور دو حال سے خالی کوئی دل نہیں اور یہ رغبت اور نفرت ہے، اگر لوگوں کے حالات مشاہدہ کیے جائیں تو یہ بجائے خود

دفتر وعظ و پند و نصیحت ہے مگر گوشِ ہوش کہاں، سنتا کون ہے یہی رغبت اور نفرت ہر ایک جگہ کارفرما ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص طالب نصیحت ہو تو اسے جو کچھ دنیا میں واقع ہو رہا ہے لوگوں کے حالات میں دیدۂ عبرت سے مشاہدہ کرنا چاہیئے، لقمان سے کسی نے پوچھا کہ دانائی کا سبق کس اُستاد سے سیکھا، جواب دیا نادانوں سے، جو کچھ وہ کرتے ہیں میں نہیں کرتا۔

حقیقت میں پند و نصیحت بھی تحت الشعور "محاسبہ" ہی ہوتا ہے، اور یہ "فضیحت" بن کر رہ جاتی ہے جب مخاطب کو تحت الشعور اس کا احساس ہو کہ ناصح مشفق اس کے اعمال کا جائزہ بلا اختیار و حکومت لے رہا ہے، اور اس طرح اپنا تفوق ( ) جتا رہا ہے۔ اس لئے وعظ کا موضوع عیب و ہنر ہی ہوتا ہے، اور عیب جو یا تو خود مدعی فضل و ہنر ہوتا ہے یا اپنے عیوب چھپانا چاہتا ہے۔

کسے کہ نیک و بد ہوشیار و مست بپوشد
خدا عیب وے از چشم ہر کہ ہست بپوشد

جو شخص کسی کے خواہ وہ ہوشیار ہو یا مست نیک و بد سے سروکار نہیں رکھتا امید ہے کہ خدا اس کے عیب ہر ایک شخص کی آنکھ سے پوشیدہ رکھے گا۔

رنج خفت مکش ز خلق باظہار کمال
نزد ایں طایفہ "بے عیب نبودن" ہنر است

اظہار کمال کا مفہوم یہ ہے کہ نقائص پوشیدہ ہوں، اگر تو اپنے کمال کا اظہار کر رہا ہے تو لوگوں کے ذہن نشین یہ کرنا چاہتا ہے کہ تجھ میں کوئی نقص نہیں۔ حالانکہ اہلِ کمال کا نظریہ یہ ہے کہ "بے عیب نہ ہونا" ہی ہنر ہے، اس لئے اگر تو یہ ظاہر کر رہا ہے کہ تو بے عیب ہے تو اہلِ کمال نہیں کہتے ہیں کہ "عیب کرنے کو ہنر چاہیئے"، ہو سکتا ہے کہ تو اپنے عیوب ہی

کو بطور ہنر پیش کر رہا ہو ، بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ واجب ہے کہ انسان میں عیب ہو، اگر نہ ہو تو وہ انسان نہ ہوگا حیوان مطلق ہوگا۔ عیوب کا رفع کرنا ہی طلب کمال ہے، عیوب ہونگے تو کمال کا حصول ممکن ہے لیکن انسان کبھی کامل نہیں ہو سکتا ورنہ ارتقاء رُک جائے گا۔

دعوئ فضل و ہنر خوار لیست در انبائے دہر
آبرو خواہی گر ایں جا اندکے ناداں برآ

اگر کوئی شخص صاحب فضل و ہنر ہو اور اسے اس کا دعوے ہو تو وہ لاف زنی سمجھی جاتی ہے اور موجب خواری و رسوائی ہے، آبرو اسی میں ہے کہ دانا ہوتے اپنے آپ کو تھوڑا سا نادان ظاہر کرو۔

دانا نشود از ہنر خویش برومند
از میوۂ خود بہرہ محال است شجر را

از دوتا گشتن ندارد چارہ نخل میوہ را
قامت ہر کس بزیر بار می آید خم است

درخت اپنا پھل آپ نہیں کھاتا۔ دوسروں کو کھلاتا ہے ، اسی طرح جو دانا ہیں وہ اپنے ہنر کا پھل دوسروں پر ارزاں کرتے ہیں (ممارزقنٰھم ینفقون) اسی کو تواضع کہتے ہیں، بیدل نے لفظ "بار" میں لطف پیدا کیا ہے۔ بار کے معنی پھل بھی ہیں اور بوجھ بھی، بوجھ سے بھی قامت جھک جاتا ہے اور درخت میوہ دار بھی جھکتا ہے جو تواضع کی صورت ہے۔

اگر علم و فنے داری نیاز طاق نسیاں کن
کہ رنگ آمیزیت نقاش می سازد خجالت را

اگر تو صاحب علم و فن ہے تو بھول جا کہ تو ایسا ویسا ڈبل پیسہ ہے، یہ علم و فن طاقِ نسیان پر صرف کر، اسی طاق کو ضرورت آرائش و زیبائش

کی ہے، اسی پر بیل بوٹے بنا اور ان میں رنگ بھر، علم و فن نقاشی اسی پر ختم کر، چونکہ

"دعوئ فضل و ہنر خواریست در ابنائے دھر
آبرو خواہی گر ایں جا اندکے ناداں بر آ"

دعوئے علم و فن خواری و خجالت ہے۔ اس لئے دانائی یہ ہے کہ لوگوں میں خوار و خجل نہ ہو اسی خواری و خجالت کو نقاش اور طاق نسیاں کا گلدستہ و فن بنا، غالب نے بہت دیر کے بعد ہوش سنبھالی۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

بر عیب خلق خوردہ نگیرند محرماں
اے بے خبر من و تو خدا نیست بندہ است

جو نیک و بد کی حقیقت سے واقف ہیں اور محرم کمال ہیں وہ لوگوں کے عیب کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے اور جو دیکھتے ہیں وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ میں اور تو خدا تو نہیں جس کی ذات ہر ایک عیب سے پاک ہے، بندہ ہیں اور خطا و نسیاں خاصہ انسانی اور بندگی ہے

یا تغافل از عالم یا ز خود نظر بستن
زیں دو پردہ بیروں نیست ساز عیب پوشیہا

عیب پوشی کا ساز یہی تغافل ہے یا چشم پوشی ہے ان دو پردوں سے باہر ساز و سامان عیب پوشی نہیں۔

تغافل از بد و نیک اعتبار اہل حیاست کہ سرخ روئی چشم آورد غنودنہا

اہل حیا کا اعتبار یا عزت و وقار تغافل میں ہے چشم پوشی میں ہے۔ جب نیند کا غلبہ ہو تو آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ اور خود بخود بند ہوتی ہیں۔ اس شعر میں "سرخ روئی" ایک امر واقعہ بھی ہے اور مفہوم اعتبار اور عزت

دوقار بھی ہے۔

عاقبت بینی نظر پوشیدن است از عیب خلق
آنچہ در انجام خواہی بستن از آغاز بند

عاقبت بینی، دوراندیشی دانائی کے ہم معنی ہے۔ انجام کار ہر ایک شخص کی آنکھیں بند ہو جائیں گی، مناسب ہے کہ آغاز ہی سے چشم پوشی سے کام لے اور لوگوں کے عیب نہ دیکھے۔

مژہ بر بند و فارغ شو ز مکروہات ایں محفل
تغافل عالمے دارد کہ عیب ایں جا ہنر گردد

جب آنکھیں کھُلی ہوں تو عیب و ہُنر اور ہموار و پست سب کچھ نظر آئے گا۔

چشم پوشیدیم یکساں شد بلند و پست دہر
عالمے را شوخیِ نظارہ ناہموار داشت

محفلِ دنیا کے مکروہات سے چشم پوشی کی جائے تو ان سے فراغت بھی حاصل ہو جائے گی، تغافل یا چشم پوشی ایک ہُنر ہے بلکہ ہر ایک قسم کے مکروہات کو جو عیب ہی ہیں ہُنر بنا دیتا ہے۔

خود نمائی بھی ایک عیب ہے اس موضوع پہ بیدل نے بہت کچھ کہا ہے "خودی" کا مذموم پہلو خود بینی و خود رائی و خود ستائی و خودنمائی ہے، لوگ اس حقیقت سے بہت کم واقف ہیں کہ حُسن و خوبی کا تقاضہ ہے اور فطری تقاضہ ہے کہ "خود نما" ہو اور عیوب و مکروہات جتنے پوشیدہ رہیں اتنا ہی اچھا ہے۔ فطرت کا منشاء ہے کہ حُسن و خوبی کا اظہار ہو، لیکن اس کا احساس عیب کی موجودگی کا بھی طالب ہے۔ بے مصلحت نیست ظہورِ شیطاں، لیکن حُسن و خوبی خود بخود جاذبِ نظر ہوتی ہے اس کی ستائش کرنے والے اہلِ نظر ہوتے ہیں وہ خود ستائی نہیں کرتی۔ خودستائی

لاف زنی کے ہم معنی ہے جو معیوب ہے۔

گر محرمی علم نفرازی بحرف پوچ

ایں پنبہ پرچمیست کہ بردار بستن است

اگر تو محرم حقیقت حسن وخوبی ہے تو اپنے نام کو ہرزہ گوئی یا دعوائے خودستائی سے مت اُچھال "حرف پوچ" بیہودہ گوئی ایسے حرف سے اپنا جھنڈا بلند نہ کر جو پوچ اور فضول ہو، حرف پوچ روئی کی طرح ہے جس کا پھریرا اس لائق ہے کہ دار یعنی صلیب پر آویزاں کیا جائے۔ اس شعر میں اشارہ حسین منصور حلاج کی طرف ہے، شعر کی لطافت الفاظ علم اور پنبہ اور پرچم اور دار میں ہے۔ منصور کا پیشہ حلاجی تھا یعنی دھنیا تھا۔ مانا کہ اس کا دعوائے "انا الحق" صحیح تھا جب کائنات کی نسبت اہلِ ذکر و فکر کا فتویٰ ہے کہ ربنا ما خلقت ھٰذا باطلاً تو جو کچھ اللہ نے پیدا کیا حق ہے، منصور کو کیا امتیازی خصوصیت حاصل ہے؟ یہی نا کہ وہ اس راز سے محرم تھا اور عوام نہیں ہیں۔ لیکن اس کا دعوےٰ حرف پوچ ہی تھا، اور اسی لائق تھا کہ اسے صلیب دی گئی، وہ اپنے لئے ایک خصوصیت پیدا کر رہا تھا جو غلط دعوےٰ ہے۔

خود نمائی حرف پوچ نخواہی بودن ۔ بردر آئینہ زیں بیش سکندر زدہ است

مشہور ہے کہ آئینہ سکندر کی ایجاد ہے۔ اس میں عکس یا تمثال خود نمائی ہے، سکندر نے بھی یہ دروازہ کھٹکھٹایا، نہ سکندر رہا اور نہ اس کی تمثال۔

اوج دولت سفلہ طبعاں را دو روزی بیش نیست

خاک اگر امروز بر چرخ است فردا زیر پاست

خاک پست اور پستی کے ہم معنی ہے۔ اگر طوفان باد یا انقلاب کی وجہ سے عالیہا سافلہا ہوں اور خاک اڑ اڑ کر بلند ہو تو کب تک، فطری پستی اسے پھر پستی کی طرف لے آئے گی۔ آج اگر خاک دھول لوگوں کی آنکھوں میں

پڑتی ہے اور لوگ اسے سر اور آنکھوں پر بٹھاتے ہیں تو کل پاؤں کے نیچے پامال ہوگی۔

مجو تمکین عالی فطرت از دوں ہمتاں بیدل
ثبات رنگ انجم نیست گلہائے زمینی را

جو تمکین یا استقلال مزاج عالی فطرت لوگوں میں ہوتا ہے وہ پست فطرت، پست ہمت لوگوں میں ڈھونڈھنے سے نہ ملے گا زمین پست ہے اور آسمان بلند۔ زمین سے جو پھول پیدا ہوتے ہیں ان میں وہ ثبات نہیں جو تاروں کو حاصل ہے۔

حرص خلقے را دریں محفل بخموری گداخت
غیر چشم سیر جام ہیچ کس سرشار نیست

آنکھ کو جام سے تشبیہ دی گئی ہے۔ سیر چشم ہی سرشار ہے لیکن اس بزم ہستی میں لوگ حرص کے نشہ میں چور ہیں، سیر چشم اہلِ قناعت ہیں، قناعت کا نشہ حرص کی مخموری سے بہتر ہے۔

معبد حرص، آستان سجدۂ بے عزتیست
عالمے ایں جا بآب رو تیمم کردہ است

حرص کی مسجد بے عزتی کے سجدہ کا آستانہ ہے۔ ایک دُنیا جو اس کی پُجاری ہے آبرو سے تیمم کر رہی ہے، پانی سے وضو کیا جاتا ہے اور پانی دستیاب نہ ہو تو مٹی سے تیمم کرتے ہیں۔ "آب رو" کو حرص خاک میں ملا دیتی ہے۔

از مائدہ بے نمک حرص میرسید
چیزیکہ بجز غصہ تواں خورد محال است

بے نمک کھانا پھیکا بے مزہ ہوتا ہے، دسترخوان حرص پر کچھ اور تو مزیدار چیز کھانے کو نہیں ملتی البتہ غصہ ہے جتنا چاہو کھاؤ۔

حرص مشکل کرد رہ فہم قناعت سپرد   آب آئینہ پلے داشت سکندر نگذشت

"رہ فہم قناعت" وہ راستہ یا طریق جس پر چل کر قناعت کی سمجھ بوجھ پیدا ہو کہ "حرص" کا راستہ ترک کر کے قناعت اختیار کرنی چاہیئے۔ لیکن حرص اس راستہ پر آنے نہیں دیتی اگر یہ ممکن ہوتا تو سکندر بھی یہ راستہ اختیار کرتا۔ آب سے عبور پل کے ذریعہ کیا جاتا ہے، سکندر تو خود آئینہ کا موجد ہے اور آئینہ میں آب ہے اگر وہ اس آب آئینہ میں غور کرتا تو آئینہ اس کے لئے پل کا کام دیتا اور اسے فہم قناعت ہوتا، مگر وہ گزر نہ سکا، تمام کرۂ ارض کی تسخیر ایک حرص ہی تھی، ہاتھ کیا آیا، خالی ہاتھ دنیا سے گیا۔

چوں سکۂ دولت بکسے نیست مسلم
پیداست کہ ہر نقش نگیں نقش بر آب است

بادشاہی در طلسم سیر چشمے بستہ اند
کاسہ چشم گدا گر پر شود جام جم است

جمشید ایران کا بادشاہ تھا۔ اس کے پاس ایک جام تھا جس میں تمام ممالک کرۂ ارض کے حالات مشاہدہ ہوتے تھے سیر چشمی یعنی قناعت میں بادشاہی کا طلسم باندھا گیا ہے گدا جو حریص ہی ہوتا ہے اگر اس کا کاسہ چشم اسی قناعت سے پُر ہو تو وہ جام جم ہے یعنی بادشاہ وقت ہے۔

اوج و حضیض قلزم امکاں شگافتیم
از آبرو مگو ہمہ جا ایں گہر گم است

زمانہ کی بلندی و پستی میں جستجو کی، بحر امکاں کی سطح اور قعر میں غوطے لگائے مگر "آبرو" کی کیا پوچھتے ہو کسی جگہ اس کا نشان نہ پایا۔

در شکست آرزو تعمیر چندیں آبروست
شبنم ایجاد است اگر موج ہوا خواہد شکست

"ہوا" کے معنی حرص و ہوس بھی ہیں اور عنصر بھی جس سے ہم زندگی کا سانس لیتے ہیں، اگر کرہ ہوا کی موج ٹوٹے تو شبنم پیدا ہوتی ہے،

شبنم آب ہے، اس لئے اگر آرزو، خواہشاتِ نفس کو توڑا جائے تو آبرو کی تعمیر ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ خواہشات احتیاج کی تسکین چاہتی ہیں، اور اس کے لئے ہمیں دستِ سوال دراز کرنا پڑتا ہے اور یہ آبرو کھونا ہے۔

از بسکہ بہ تحصیل غنا حرص تو جاں کند
قراست نگینے کہ بنام تو تواں کند

مال و دولت کی طمع میں اتنی کاوش کہ جان کنی تک نوبت آجائے اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ قبر کے پتھر پر تیرا نام کندہ کیا جائے اور بس، مفلس کی قبر پر تو کوئی کتبہ بھی نہیں ہوتا، مگر امراء کے سنگِ مزار پر ان کا نام کندہ ہوتا ہے جو اس واقعہ کی یادگار رہے کہ اس شخص نے تمام عمر جان کنی میں بسر کی دولت کمائی جو تعمیر مقبرہ کے کام آئی "جان کندن" انتہائی کوشش کرنا ہے۔

رحم بر قاروں سرشتاں کن کہ از افسون حرص
ایں خراں زیر زمیں ہم بار دنیا می کشند

قارون حضرت موسیٰ کی قوم کا ایک فرد تھا، حکومت مصر کا منظور نظر تھا۔ بہت مالدار تھا مگر اتنا بخیل اور خسیس تھا کہ خدا کی راہ میں ایک کوڑی بھی خرچ نہ کرتا۔ حضرت موسیٰ نے اسے کہا کہ خدا نے تجھے اتنا دیا ہوا ہے اگر اس میں سے کچھ قوم کی مدد کے لئے خرچ کرے تو کارِ ثواب ہے، قوم محکوم اور مفلس مدد کی محتاج ہے۔ مگر قارون نے پرواہ نہ کی، آخر جب اس کے کاروبار میں تزلزل واقع ہوا اور حکومت کی نظروں سے گر گیا تو سب شان و شوکت جس کا اظہار فخریہ کیا کرتا خاک میں مل گئی۔ روایت ہے کہ وہ اور اس کا خزانہ زمین میں دھنس گیا۔ اس شعر میں تلمیح کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ قاروں سرشت بخیل ہوتے ہیں ان کی حالت قابلِ رحم ہے کہ مر کر بھی یہ گدھے دنیا کا بوجھ پشت پر لادے رہے ہیں۔ اگر امراء کے مقبروں کو دیکھا جائے تو وہ بھی

دنیوی جاہ وحشمت کی شہادت دیتے ہیں جوان گدھوں کے سر پر کھڑے ہیں

ہلاک شد جم وخمیازہ ہائے جام بجاست

بمرگ نیز ندارد خمار جاہ شکست

جمشید تو مرگیا مگر جام پیچھے چھوڑ گیا جو انگڑائیاں لے رہا ہے۔ نشہ جب اُتر جائے تو شرابی انگڑائیاں لیتے ہیں جسے خمار کہتے ہیں۔ جاہ وحشمت جمشید سے بطور ضرب المثل منسوب ہے، اور نشہ دولت تو جمشید کے ساتھ ہی جاتا رہا مگر خمار جاہ موت کے بعد بھی نہ ٹوٹا کیونکہ قبر میں خمیازہ بھگت رہا ہے۔

برغنا زد احتیاج خست ابنائے دہر

تنگ دستی در عزیزاں ماند لیک از ما گذشت

اہلِ دنیا کی خست اور بخل انتہائی احساس احتیاج کی وجہ سے ہے۔ وہ ہاتھ اس لئے بند رکھتے ہیں کہ دولت ان کے ہاتھ سے نہ جائے اور وہ محتاج ہوکر نہ رہ جائیں، اس لئے وہ تنگ دل، تنگ دست ہی رہے اور تنگ دستی یعنی احتیاج اہلِ قناعت میں نہیں، آنانکہ غنی تر اند محتاج تر اند (سعدی)

بگذر ز غنا تا نشوی دشمن احباب   اوّل سبق حاصل زر ترک سلام است

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی کم ظرف پست فطرت کو دولت ملے، تو اپنے ابتدائی دوستوں سے ملنا بھی عار سمجھتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ زر جو پہلا سبق سکھاتا ہے وہ ترک سلام ہے۔ رفتہ رفتہ وہ بیگانہ آشنا ہوتا جاتا ہے اور بسا اوقات اپنے رویّے سے دوستوں کو بھی دشمن بنا لیتا ہے۔

چہ خوش است اگر بود آنقدر ہوس بلندی منظرت

کہ براں مکاں چو قدم نہی خم گردشے نخورت سرت

زیادہ بلندی پر چڑھو تو سر چکرانے لگتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہے کہ بلندی

کی ہوس اتنی حد تک ہو کہ جب تو وہاں قدم رکھے تو تیرا سر نہ پھرے ہم نے بہت سر پھرے دیکھے ہیں۔ بہر حال یہ عارضی شے ہے، اس پر اترانا کم ہمتی ہے۔ بیدل اپنی نسبت کہتا ہے کہ "خلقے بجاہ تکیہ زد و ناز دیم پا" لوگ تو جاہ و حشمت کا سہارا لیتے ہیں میں نے اسے پاؤں سے ٹھکرا دیا۔

دریں زمانہ زبس طبع دوں رواج گرفت

عنان کسب کمالات سوئے ناں گردید

صرف بیدل کے زمانہ میں ہی نہیں بلکہ ہمارے زمانے میں بھی یہ حالت ہے کہ پست فطرت اتنی عام ہے کہ کمال اسی میں سمجھ رہے ہیں کہ روٹی ہو اور بس۔ ہر ایک کسب کا مقصد اور غرض و غایت صرف روٹی ہے۔ اور جتنی روٹیاں زیادہ ہوں اتنا ہی وہ کسب میں کامل ہو گا بلکہ کمالات کا کسب کرنا روٹی ہے۔ ہر ایک کی عنان توجہ اسی نان کی طرف ہے۔

جز بہم چیدن کسے را با تصرف کار نیست

گندم انبار است ہر سو لیک قحط آدمیست

اگرچہ گندم کی فراوانی ہے مگر قحط الرجال بھی ہے۔ آدمیّت انسانیت تو مفقود ہے گاؤ و خر چارہ کی فکر میں ہیں۔

از ترحم تا مروت وز مدارا تا وفا

ہر چہ را کردم طلب دیدم ز عالم رفتہ است

ترحم اور مروت اور مدارا اور وفا اعلیٰ اخلاقی امور ہیں، میں نے انکی تلاش کی تو دیکھا کہ اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں۔

نور دل خواہی غبار طبع منظلو ماں مباش

یاد بدت آئینہ جائے برد کانجا آہ نیست

دل آئینہ کی مثال ہے، صاف اور کینہ و بغض و حسد سے پاک ہونا چاہیئے اس کی صفائی گرد و غبار مکدر کرتا ہے اگر آئینہ پر آہ کریں تو اس کی

سطح مکدر ہو جائے گی۔ اس لئے اگر تو یہ چاہتا ہے کہ تیرا آئینہ دل نورانی رہے تو مظلوموں کے دل پر غبار نہ آنے دے۔ مناسب یہی ہے کہ آئینہ کو ایسی جگہ رکھا جائے کہ اس پر آہ کا اثر نہ ہو مظلوم کے دل پر کسی کی طرف سے غبار آجائے تو وہ آہ ہی بھرے گا۔

درکفِ اخلاق تست رشتہ تسخیر خلق

غافل از احساں مباش ہیچ کست بندہ نیست

تیرے اخلاق کے ہاتھ میں خلق کی تسخیر کا رشتہ ہے اور یہ "احسان" ہے، جس کسی پر احسان کرے گا اس کا دل مسخر کرے گا لیکن اتنا یاد رکھ کہ مخلوق تو خدا کی ہے، اور سب اللہ کے بندے ہیں تیرا بندہ نہیں جس پر تو احسان کر رہا ہے۔ جو شخص کسی پر احسان کر کے جتاتا ہے اور جو اس نیت سے احسان کرتا ہے کہ بندہ خدا میرا حلقہ بگوش ہو جائے اور عموماً اہلِ دنیا ایسا ہی کرتے ہیں وہ احسان نہیں کرتے وہ سرمایہ دار لوگوں کے جان و مال کو خرید کرتے ہیں اور غرض روپیہ قرض دے کر اصل معہ سود وصول کرنا ہوتا ہے۔

ز تازہ روئی اخلاق نگذری بیدل بہار تا اثر رنگ و بوست پیدا شد

جب تک گلشن میں رنگینی ہے اور پھولوں کی مہک سے فضا بھری ہوئی تب تک بہار کی موجودگی محسوس ہوتی ہے، اس لئے اخلاق کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے کہ زندگی کی ترو تازگی اسی سے ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ اگر انسان یہ سمجھ لے کہ دستِ سوال دراز کرنا انتہائی ذلت ہے تو کبھی تا قیامت سوال نہ کرے۔

دل از شکایت افلاس بہ کہ جمع نمائی

زباں بکام تو بس گر جہاں بکام تو نیست

بہتر یہی ہے کہ فقر و فاقہ قبول کرو اور افلاس کی شکایت اس لئے نہ

کرو کہ کوئی مخیّر تم پر احسان کرے۔

از رفتن آبروخبر گیر ہر جا اظہار مطلب آمد

زبان تیرے منہ میں ہے اس پر قابو تیرا ہے یا پا سکتا ہے، جہاں اگر تیرے کام نہیں آتا تو اس پر تیرا زور نہیں چل سکتا البتہ زبان تیری ہے اسے آلودۂ شکوہ و شکایت نہ کر۔ اس شعر میں یہ "کام" دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

غنا مسلّم آں کس کہ در قلمرو حاجت

غبار گردد و در راہ آشنا نہ نشیند

استغنا اس شخص کا قابل تسلیم ہے کہ باوجود احتیاج خواہ پس جائے اور پس کر غبار بن جائے مگر کسی دوست کے راستہ میں نہ پڑے۔ گرد و غبار اُڑ کر آنکھوں میں پڑتا ہے، خاطر آلودہ ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ انسان کو اتنا بے نیاز ہونا چاہئے کہ کسی کا احسان قبول نہ کرے خواہ احتیاج اسے خاک میں ملا دے دامن سوال کسی دوست کے آگے بھی نہ پھیلائے۔ اسی کے ہم معنی دوسرا شعر ہے کہ

غبار غیرت آں مطلبم کہ گاہ تمنا

رود بباد و بروئے کف دعا نہ نشیند

غیرت کا تقاضہ ہے کہ غیر سے مطلب برآری کی خواہش نہ کی جائے دستور ہے کہ دُعا کے بعد کھلے ہاتھ چہرہ پر ملتے ہیں۔ اور دُعا کسی حاجت برآری کے لئے ہی مانگتے ہیں، کسی مطلب کے لئے ہی ہوتی ہے۔ اگر اس پہ غبار عزت ہو تو مُنہ کو خاک آلودہ کریگا۔ بہتر ہے کہ یہ غبار ہوا میں تنکے کی طرح اُڑے مگر کف دُعا کو آلودہ نہ کرے۔ مطلب تو صرف اتنا ہے کہ تمنائے تنکے ہوا میں اُڑیں مگر دست دُعا پہ آ کر نہ ٹھہریں اگرچہ یہ غیرت کا تقاضہ ہے مگر میں اس غیرت پر بھی خاک

ڈالتا ہوں کہ آخر یہ بھی ایک مطلب ہے میں طلب سے بھی بے نیاز ہوں۔

ہجوم شکوہ ہر کس زدرد مفلسی باشد
نخیزد نالہ از نے تا بود مغز استخوانش را

جب تک بانسری کی ہڈی میں مغز ہے یعنی گودا ہے اور وہ اندر سے خالی نہیں ہوتی اس سے نالہ جانسوز پیدا نہیں ہوتا اسی طرح مفلس جب ہاتھ خالی ہوتا ہے تو مفلسی کا رونا روتا ہے، اگر کسی کے پاس مال ہو تو شکوہ مفلسی نہیں کرتا۔

شود کم ظرف در نعمت ز شکر ایزدی غافل
کہ سیری مہر خاموشیست چوں ساغر دہانش را

کاسہ بھرا ہوا ہو تو گویا اس کے منہ پر مہر خاموشی لگی ہوئی ہوتی ہے اسی طرح کم ظرف جب سیر ہو تو اللہ کی نعمت کا شکر نہیں کرتا۔ ساغر بھی کم ظرف ہے۔ ایک چھوٹی سی چیز خم کے مقابلہ میں ہے۔

دونوں باتیں ہیں مفلس شکوہ سے زبان آلودہ کرتا ہے اور اپنی احتیاج کا اظہار کر رہا ہے اور خیرات بھی قبول کرتا ہے اور کوئی کم ظرف ہے تو شکر نعمت نہیں کرتا ممنون شکر گذار بندہ ہونا چاہئے۔

تا نگردی پائمال منت امداد خلق
بے عرق کامے دو پیش از خجلت احساں برآ

مناسب یہ ہے تو لوگوں کی امداد کے بار احسان کے نیچے دب کر نہ رہ جائے تو اس ذلت اور شرمندگی سے جو کسی کے احسان سے گوارا کرنی پڑتی ہے باہر ہے۔ محاورہ ہے کہ مارے شرم کے پانی پانی ہوگیا۔ خجلت اور ذلت سے آبرو جاتی رہتی ہے اگر تو کسی کا احسان قبول نہ کرے تو شرمندۂ احسان بھی نہ ہوگا۔

کم ز یوسف نیستی اے قدر داں عافیت چاہ و زنداں مغتنم گیر از صفا خواں برآ

حضرت یوسف کو بھائیوں کے حسد کی وجہ سے چاہ اور زنداں میں جانا پڑا۔ اگر بھائی چاہ میں نہ ڈالتے تو آخر الامر زنداں میں بھی نہ جاتے اور جو واقعات وہاں رونما ہوئے پیش نہ آتے ان مصائب کا اصل سبب بھائی ہی تھے اس لئے اگر تو عافیت کا قدرداں ہے تو چاہ و زنداں کو غنیمت سمجھ آخر یہ ٹھکانہ ہی تو ہے مگر بھائیوں کے زمرہ میں شامل نہ ہو۔

زقطع اُلفت دلہا حسود آسودہ نہ نشیند
شود خمیازہ مقراض افزوں در بریدنہا

مقراض جب انگڑائی کی صورت اختیار کرتی ہے یعنی جب اس کے دونوں پھل کھلے ہوتے ہیں تو کاٹ میں تیز ہوتی ہے خمیازہ مقراض نئی ترکیب ہے۔ اسی طرح حاسد تو دلوں کو جو بوجہ اُلفت جڑتے ہیں قطع کرتا رہتا ہے۔

تہمت اعمال زشت ننگ حقیقت مباد
آدمی ابلیس نیست لیک حسد لعنت است

آدمی کی فطرت تو پاک ہے۔ لیکن بداعمالی حقیقت انسانی پر بدنما دھبہ ہے، آدمی شیطان تو نہیں مگر حسد کی وجہ سے موردِ لعنت بن جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ شیطنت حسد ہی ہے شیطان نے بوجہ حسد آدم پاک سرشت کا انکار کیا اس لئے اگر انسان بھی حاسد ہو تو گو اسے شیطان نہیں کہیں گے مگر جس طرح شیطان ملعون ہوا یہ بھی لعنت کی زد میں آجائے گا۔ نہایت نرم اور لطیف پیرایہ میں حاسد آدمی کو شیطان ہی کہا گیا ہے۔

کجا روم کہ شوم ایمن از لب غماز   بعالم آدمیاں ہم فرشتہ اندمرا

کہتے ہیں کہ فرشتے (کرام کاتبین) ہمارے اعمال کو لکھتے رہتے ہیں۔ ہمارے اعمال اکثر بُرے ہوتے ہیں یہ تحریر یا ہمارا نامہ اعمال بروز حشر کھولا جائے گا گویا فرشتے غمازی کریں گے اس دنیا میں بھی لوگ غمازی کی وجہ سے

یہی کام میرے لئے فرشتوں کا کر رہے ہیں اب جائیں تو کہاں جائیں نہ دنیا میں غماز سے چھٹکارا نہ حشر میں نجات، دنیوی زندگی تعلقات ہی ہے اور انہی تعلقات میں ہر ایک انسان جکڑا ہوا ہے۔ اور ان کا اثر اخلاق پر پڑتا ہے۔

سرمایہ نشاط تو رفع تعلق است　　　　از ترک برگ نے بمقام نوا رسید

لفظ "مقام" راگنی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے بانسری کے پتے علیحدہ ہوئے تو نغمات بھی الاپنے لگی۔ ظاہر ہے کہ نغمہ نشاط آور ہے۔ اس لئے رفع تعلق سے انسان نشاط کا سرمایہ فراہم کرتا ہے۔

در خور رفع تعلق عیش خرمن کن چو شمع

خار پا چندانکہ می آرد بروں گل می شود

"خار" کے معنی کانٹا بھی ہے اور وہ دھاگہ یا بتی ہے جو شمع میں جلتی ہے "گل" کے معنی پھول اور گل شمع، ظاہر ہے کہ پھول سامان عیش و نشاط ہیں خار شمع یعنی بتی جلتی بھی باہر نکلے گی اتنے ہی گل شمع پیدا ہوں گے کانٹا اگر پاؤں کے اندر رہے تو تکلیف دہ ہے نکالا جائے تو راحت محسوس ہو گی۔ اس لئے خار تعلق جو خلش پیدا کرتا ہے عیش کے منافی ہے راحت اسی میں ہے کہ یہ کانٹے جو ہمارے راستہ میں بچھے ہوئے ہیں پاؤں میں نہ چبھیں۔

اگر مردی در تخفیف اسباب تعلق زن

کز انگشت دگر انگشت نر یک بند کم دارد

اگر تو مرد آدمی ہے تو اسباب تعلق کو کم کر، انگشت نر یعنی انگوٹھا کا ایک بند یا جوڑ یا پور دوسری انگلیوں سے کم ہوتا ہے۔ لفظ "نر" سے مردی اور مردانگی کا خیال پیدا کیا گیا ہے۔ تعلقات بندھن ہے اس گرہ کو کھولتے جاؤ یہی ہمت مردانہ کا کام ہے۔ "التوحید اسقاط الاضافات" کثرت جو امور اضافی ہیں ان کو محو کرتے جاؤ تو وحدت رہ

جائے گی۔

سبب قیدِ علایق زخرد پرسیدم　　گفت در چاہ ہمیں فطرت کورم افگند

میں نے عقل سے پوچھا کہ تو جو علائق کی قید میں جکڑی ہوئی ہے اس کا سبب کیا ہے، جواب دیا یہی میری اندھی فطرت ہے جس نے مجھے کنوئیں میں گرایا۔ یہ شعر نہایت لطیف ہے، عقل کی فطرت کا تقاضا ضہ ہے کہ وہ علائق کی طالب ہے۔ اندھا نشیب و فراز دیکھ نہیں سکتا راستہ میں گڑھا آیا تو اس میں آرہے گا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ عقل ہی ہے جس نے ہمیں علایق کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے، اور اندھے کنوئیں میں گرایا۔ عقل حریص کثرت کی طالب ہے۔

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب معاش

آنچہ مادرکار داریم اکثرے درکار نیست

حریص قانع نہیں ہوتا ورنہ جتنے بھی اسباب معاش ہیں ہم کام میں تھوڑے ہی لا رہے ہیں باقی بیکار پڑے ہیں یعنی اسباب معاش میں سے تھوڑے ہی کام کے ہیں۔ لیکن عقل کثرت پسند انھیں جمع کر رہی ہے اور دور اندیشی یہ ہے کہ ممکن ہے کہ بوقتِ ضرورت اسباب کی کمی ہو اس لئے ذخیرہ رکھنا چاہیئے تاکہ بوقتِ حاجت کام آئے۔

بیدل اسباب تعلق بود رنگ آگہی

آئینہ صیقل زدند آنہا کہ پشت پا زدند

لفظ "آگہی" بیدل نے اکثر اشعار میں باندھا ہے۔ غالب نے بھی اکثر اشعار میں استعمال کیا ہے۔ معرفت اشیاء جو عقلاً حاصل ہوتی ہے دراصل آئینہ پر زنگ ہے۔ جن لوگوں نے ان اسباب تعلق کو ٹھکرا دیا وہی آئینہ دل کو صیقل کرتے ہیں جس سے زنگ کدورت دور ہوتا ہے۔

آگہی طوفان غفلت ریخت بیدل بر جہاں
عالمے بیدار بود ایں فتنہ ناخوابیدہ بود

ظاہر ہے کہ انسان جتنا بھی آگاہ ہوگا اتنا ہی باشعور ہوگا جو عین بیداری کا تقاضا ہے، بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ آگاہی معرفت اشیاء اور کثرت اشیاء اسباب تعلق کا شعور ہے۔ چونکہ عقل اسی کی طالب ہے۔ اس لئے ہر ایک شخص زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور عالم انسانی میں فتنہ جاگ اٹھا، جب تک یہ فتنہ سویا ہوا تھا یہ سمجھو کہ ہم بیدار تھے، یہ فتنہ جاگا تو ہم سو گئے یعنی آنکھوں پر پردہ غفلت پڑ گیا، جب ہر ایک شخص اسباب معاش زیادہ سے زیادہ جمع کرے گا تو ظاہر ہے کہ جو زبردست ہیں وہ کمزور کو اس کے حق زندگی سے محروم کر دیں گے، زبردست وہی ہے جس کو ذہنی تفوق حاصل ہے اور یہ قوت عقلیہ ہے جس کے بل بوتے پر یہ فتنہ برپا ہے۔

وضع دنیا ہیچ بر دیوانہ تاثیری نکرد
بیشتر ایں برق عبرت خرمن فرزانہ سوخت

دنیا اور دنیاداری کا طور طریق دیوانہ پر اثر انداز نہیں ہوتا، اکثر "اھل الجنۃ بلھم" سادہ لوح آدمی مزے میں رہتے ہیں یہ بجلی اگر گرتی ہے تو اکثر و بیشتر اہل عقل پر ہی گرتی ہے۔ کچھ عبرت حاصل کرنی چاہئے۔

تا توانی گاہ گاہے بے تکلف زیستن
زیں تعلقہا کہ داری اندکے وارستن است

ذوق مرحوم کہتا ہے کہ:

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام میں وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے

جہاں تک ہو سکے کبھی کبھی بے تکلف زندگی بسر کرنی چاہئے تکلف کے اسباب بھی تعلقات ہیں ان سے تھوڑا سا کبھی علاحدہ ہونا چاہئے۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ہیچ کس از بے تکلّف زیستن آگاہ نیست
آدمی بودن خلل در عیش مردم می کند

سامانِ تعیش تکلّفات کا ساز ہی ہے، اور لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ "آدمیت" یہی ہے کہ یہ تکلفات زیادہ سے زیادہ ہوں، بے تکلّف زندگی بسر کرنا انسانیت کے مناسب خیال نہیں کیا جاتا، یہ نظریۂ انسانیت غلط ہے۔ یہ تکلّفات خورد و نوش و پوشش میں ختم ہو جاتے ہیں ان سے بہرہ ور تو بہائم بھی ہیں۔ انسان ان میں تکلّفات پیدا ضرور کرتا ہے، لیکن خودشناسی کا تقاضہ یہ ہے کہ بندہ بخود نمی رسد تا بخدا نمیرسد۔

گاؤ خر از آگہی انسان نگشتہ است و لیک
آدمی گر اندکے غافل شود خر می شود

شعور و آگاہی انسان کی امتیازی خوبی ہے۔ اگر محض خورد و نوش و پوشش کے تکلّفات پر صرف ہو تو آدمیّت سے بعید تر ہے، اگر انسان خودشناسی سے ذرا غافل ہو تو گدھا بن کر رہ جاتا ہے۔

آگاہی وافسردگی دل چہ خیال است
تا دانہ بخود چشم کشود است نہال است

دانہ جب آنکھ کھولتا ہے یعنی پھوٹتا ہے تو درخت بن جاتا ہے، جب تک آنکھ بند ہے افسردہ دل خودشناس نہیں ہوتا، خود آگاہ اپنے مقام انسانیت سے واقف ہوتا ہے۔

غبار غفلت و روشن دلی نگردد جمع
کجاست دیدۂ آئینہ راغنودنہا

روشن دل غافل نہیں ہوتا، آئینہ کبھی نہیں اونگھتا اور نہ سوتا ہے

اور ہمیشہ بیدار ہے۔ اس لئے غفلت کی کدورت اور روشن دلی کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتی۔

ہیچ کس در بارگاہ آگہی مردود نیست
صافی آئینہ با گبر و مسلماں آشناست

آئینہ کے سامنے جو بھی صورت نظر آئے ہوبہو نظر آئیگی۔ آئینہ کو اس سے غرض نہیں کہ کوئی نیک ہے یا بد، کوئی گبر یا مسلمان، آئینہ کا کام اتنا ہے کہ بتادے کہ تم کیا ہو، اور صحیح صورت بلاکم و کاست پیش کردے گا، آئینہ سب کا شناسا ہے اور کسی کو مردود قرار نہیں دیتا، خود شناس کبھی مردود نہیں ہوسکتا۔ اس شعر کی شرح حسب ذیل شعر ہے:۔

شامل است اخلاق حق یا طور خوب و زشت خلق
شخص دیں را بیدل از گبر و مسلماں چارہ نیست

دین حقیقت واحدہ ہے اور اصل تمام مذاہب کی ہے (وھدینہ السبیل اما شاکراً و اما کفوراً) مذاہب تمام فروع ہیں۔ فطرتاً ہر ایک کو دین کا احساس ہے کوئی کفر کرے یا شکر یہ اختیار اسے دیا گیا ہے (لا اکراہ فی الدین) لوگوں کے طور اچھے ہوں یا بُرے اس کا اثر دین پر نہیں پڑتا، لیکن دین ان کے احساسات و جذبات پر ضرور مؤثر ہوتا ہے۔

در افتادن بروئے یک دگر دور است از آگاہی
ز مژگاں ہم اگر ایں اتفاق اُفتد بخواب اُفتد

ایک دوسرے کا لڑنا، دست و گریباں ہونا آگاہی سے بعید ہے۔ "دو عاقل را نباشد کیں و پیکار"۔ آگاہی اور بیداری ہم معنی ہیں، بیداری میں مژگاں ایک دوسرے سے جُدا ہوتی ہیں، ان میں آویزش نہیں ہوتی، خواب یا غفلت آگاہی کی ضد ہے، اگر مژگاں ایک دوسرے پر گرتی ہیں تو خواب ہیں ویسا اتفاق ہوتا ہے۔

تا دل الم نہ چیند از کینہ محترز باش گر تلخی از حلاوت گل کردہ میوہ داغیست

پھل میٹھا اگر داغی ہو تو اس میں کڑواہٹ پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح دل اگر کینہ سے داغدار ہو تو اس میں تلخی پیدا ہو جائے گی۔

کلفت زدائی کینہ دلہا تواضع است زین تیشہ می تواں گرہ سنگ باز کرد

کینہ سے دل پر گرہ پڑ جاتی ہے اور دل سخت اور کلفت زدہ ہو جاتا ہے۔ تواضع سے یہ خرابی اسی طرح دور ہو سکتی ہے جس طرح کلہاڑا سے پتھر توڑا جا سکتا ہے۔

از چرخ نہ ہر ابلہ و ناداں گلہ دارد جائی گلہ این است کہ انساں گلہ دارد

اگر گردش ایام کی شکایت ہر ایک ناداں اور احمق کرتا ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ تو بے وقوف ہیں اس لئے ان کی شکایت بے معنی ہے، لیکن جب انسان ہی شکوہ و شکایت کرے تو جائے شکایت ہے، یعنی انسانیت اور آگاہی اور علم و فضل ہم معنی الفاظ ہیں ان سے تو کبھی کوئی شکایت گردش روزگار کی نہ ہونی چاہیئے، جو ان کی زندگی کو تلخ بنا دے۔ لیکن جب یہ شکایت کریں تو پھر گلہ صحیح ہے۔ اس شعر کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان جو حقیقت سے آگاہ ہے اگر روزگار کا گلہ کرے تو انسانیت کی شان سے بعید ہے۔

اے بے خبر از کم خرداں شکوہ چہ لازم آدم نہ بود آنکہ ز حیواں گلہ دارد

آدمی اگر بہائم کی شکایت کرے تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ بھی "پشو" ہے۔ کم عقل بہائم ہی ہیں اگر ان سے کوئی حرکت ناشائستہ سرزد ہو جائے تو جائے شکوہ و شکایت نہیں آدمیت سے بعید ہے کہ ان کا گلہ کرے۔

بر بزرگاں از طواف خاکساراں ننگ نیست

چرخ با آں سرکشی گرد زمیں گردیدہ است

اگر بزرگ خورد سے تعظیم کے ساتھ پیش آئے تو ان کی بزرگی کو بٹہ نہیں لگتا، آسمان باوجود رفعت و بلندی زمین کے گرد گردش کر رہا ہے۔ یعنی "تواضع زگردن فرازاں نکوست"

قطعات

اصناف شعر میں سے کوئی صنف ایسی نہیں جس کو بیدل نے نظر انداز کر دیا ہو۔ کوئی بحر نہیں جس سے وہ آشنا نہیں، زمین شعر کا گوشہ گوشہ اس کا دیکھا ہوا ہے۔ ان میں سے ہر ایک مستقل موضوع ہے۔ ہم نے قصائد اور قطعات و تاریخ اور ترجیعات و مخمس وغیرہ کو چھوڑ دیا ہے۔ چند قطعات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں تاکہ کم از کم ایک ہی موضوع تشنۂ تکمیل نہ رہے۔

بحر بیتاب کہ آں گوہر نایاب کجاست
چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہاں تاب کجاست

بحر میں تموج اور اضطراب تلاش گوہر میں ہے۔ وہ نایاب ہے حالانکہ وہ بحر کی تہ میں صدف کے آغوش میں ہے، دوسرے مصرع میں آیہ "اللہ نور السمٰوات والارض" کی طرف اشارہ ہے، یہ نور تمام کائنات کو روشن کر رہا ہے۔ مگر کائنات تو مشاہدہ ہو رہی ہے اور یہ نور بوجہ انتہائی لطافت نظر نہیں آتا۔ ایک تاریک مکان میں شمع روشن کی جائے تو مکان اور مکان کی ہر ایک شے نظر آئے گی۔ نور شمع پر جو اشیاء پر پڑتا ہے نظر سب سے اوّل پڑتی ہے مگر ہمیں اس کا شعور نہیں۔ اسی طرح کل کائنات اللہ کے نور سے روشن ہے مگر ہم اس نور کو نہیں دیکھتے اور غلط فہمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ کائنات بذاتہٖ

روشن ہے، اس کو سطحی یا حسی مشاہدہ کہتے ہیں، لیکن تفکرؔ و تدبّر سے جو عقلاً ہوتا ہے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے جس کا مذکور ہم سطور بالا میں کر چکے ہیں۔

دیر از یں غصّہ در آتش کہ چہ رنگ ست صنم
کعبہ زیں درد سیہ پوش کہ محراب کجاست

دیر میں گبر آتش ہر وقت روشن رکھتے ہیں اور کبھی بجھنے نہیں دیتے وہ اگنی کی پوجا کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ نار مظہر نور یزداں ہے۔ "صنم" تو پتھر کی مورتی ہے اور آگ بھی ایک مادی شے ایسی ہی ہے جیسا آب و باد و خاک دیرا سی غصّہ میں جل بھن رہا ہے کہ صنم نظر نہیں آتا، کعبہ کا غلاف سیہ ہے اور کعبہ میں محراب نہیں جو سجدہ کی جگہ ہے، کعبہ اس بات کا ماتم کر رہا ہے کہ محراب یعنی جہاں اور جس کی بندگی کے لئے یہ تعمیر ہوا یعنی رب کعبہ وہ کہاں ہے، ظاہر ہے کہ دیر و کعبہ بھی سنگ و خشت کی عمارت ہے، جس کی بندگی اور عبادت کے لئے مخصوص ہیں وہ تو وہاں نہیں اور اگر وہاں ہے تو دیر و کعبہ کی کیا خصوصیت ہے ہر ایک زمان و مکان میں ہے، سوال تو اس ذات کے بارہ میں ہے جو مرجع کل ہے۔

اے سمندر بہوس داغ فروش، آتش کو
ماہیاں تشنہ بمیرند دم آب کجاست

کہتے ہیں کہ آتش کدہ چونکہ ہزار ہا سال سے جل رہا ہے اس میں بھی زندگی پیدا ہو جاتی ہے اس میں ایک جانور یا کیڑا پیدا ہو جاتا ہے جس کو "سمندر" کہتے ہیں، سمندر ہندی میں بحر کو کہتے ہیں، آگ کی ضد پانی ہے، اور یہ تو اہلِ علم جانتے ہی ہیں کہ پانی مایہ حیات ہے، بحر میں مچھلیاں ہیں، سمندر کے دل پر اس خواہش کا داغ ہے کہ اسے معلوم نہیں کہ آگ کہاں ہے حالانکہ آگ ہی سے اس کی زندگی ہے، مچھلیوں کو پیاس اسی شے کی

ہے کہ سرچشمہ آب معلوم کریں حالانکہ پانی ہی میں ان کی زندگی ہے، ان سوالات کا جواب ذیل کے قطعہ میں دیا گیا ہے۔

بیدل آں گوہر نایاب سُراغ — بحیطے است کہ پرسیدن نیست

وہ گوہر وہ حقیقت جس کا سراغ ہی نایاب ہے ایسا محیط یا بحر ہے کہ چند وچہ وچوں لاکھ سوال پوچھو اس کا پتہ نہ کسی کو ملا اور نہ کوئی بتا سکتا ہے۔

عکس افتادہ در آئینہ ہوش — گل تواں گفت ولے چیدن نیست

آئینہ شعور میں اتنا تو نظر آرہا ہے کہ کچھ تو ہے۔

پیش بیناں بارگاہ الست — پیش ازیں رہ نبردہ اند کہ "ہست"

(سعدیؒ)

لیکن آئینہ تو صرف عکس ہی عکس ہے

فرض کرو کہ یہ ایک پھول کا عکس ہے اس پھول کو آپ توڑ نہیں سکتے اصل پھول جو آئینہ اور آپ کی نظر سے باہر ہے دسترس سے بھی بالاتر ہے عکس ہی سہی مگر یہ بھی ہاتھ نہیں آتا۔

عجز ادراک اگر فہمیدی — معنی این است کہ فہمیدن نیست

جو امر ہمارے قیاس وگمان ووہم سے بالاتر ہو اور جہاں عقل وفکر کی رسائی نہ ہو اس کا ادراک ہم کر نہیں سکتے، اس لئے جب ہم نے یہ سمجھ لیا کہ یہ حقیقت ہمارے ادراک سے باہر ہے اور اس کے فہم سے ہم عاجز ہیں تو وہ حقیقت بلا ریب معنی تو ہے مگر فہم سے بالاتر۔

نسخہ ہا در بغل وفہم محال — جلوہ ہا در نظر و دیدن نیست

کائنات کا ذرہ ذرہ پتہ پتہ دفتر امکانات ہیں اور ہمارے تمام علوم کا ماخذ یہی کتاب کائنات ہے یہ سب کچھ ہے مگر یہ درس علم معرفت کون دے رہا ہے، اس کا فہم نہیں دو عالم میں ہر طرف اسی حسن ازلی کا جلوہ مشاہدہ ہو رہا ہے مگر حقیقت میں وجہہ ذوالجلال والاکرام نظر نہیں آتا۔

سواد نسخۂ تحقیق بیدل وقتے دارد
دو عالم جلوہ باید خواندن و بیرنگ فہمیدن

سخن طرفہ شنیدن دارد کہ کم از معنی نشنیدن نیست

یہ عجیب بات بھی سُننے کے لائق ہے کہ نہ سُننا بھی معنی سے کم نہیں جو فہم سے بالاتر ہے۔ اس حد تک تو بیدل لاادریت کا ترانہ سنج ہے۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ:۔

احوال دیگراں زچہ بر خود فسردۂ
بیدل زخود بگو کہ تو ہم کم نبودۂ

ہمارے تمام علوم معرفت غیر پر ختم ہو جاتے ہیں ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے گرد و پیش کیا ہے اور تمام طبقات کی خاک چھانتے ہیں۔ اپنی خودی، اپنے نفس سے ہم بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ حالانکہ

رازِ حیات خضر سے بے فائدہ نہ پوچھ
زندہ ہے اپنے دم سے مسیحا کہیں جسے

جو کچھ بھی ہماری ذات سے وابستہ ہے، اس کا شعور ہمیں ہے۔ اگر ہم نہ ہوں تو عدم ہے اس لئے سب سے مقدم تو معرفت نفس خود کی ضرورت ہے۔ جگ بیتی تو وہ ہے جو ہم مشاہدہ کر رہے ہیں اور ہمارے ہی تصوّرات ہیں لیکن "آپ بیتی" ثابت شدہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔

گر ریشہ زتخم تو آید بروئے کار بند نقاب خرمن امکاں کشودۂ

ایک بیج میں ایک درخت کی حقیقت پوشیدہ ہے جب یہ بیج ریشہ کی صورت اختیار کرتا ہے تو اس کے امکانات جو پہلے پوشیدہ تھے ظاہر ہو جاتے ہیں حقیقت انسانی وہ ہے جسے اصطلاح میں لفظ "من" یا "انا" ( ) کہتے ہیں اور ہر ایک شخص اپنی حقیقت سے جیسا واقف ہو سکتا ہے اس کا غیر نہیں ہو سکتا۔ اور اس حقیقت کا نشو و نما جو کچھ اس پر

منکشف ہے وہ غیر پر نہیں ہو سکتا۔ یہ اصل اصول تحقیق ہے اگر اس کا فہم ہو گیا عالم امکان پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اور تمام امکانات کی حقیقت بھی منکشف ہو گی۔

برگ گلت ہزار چمن عرض رنگ و بوست
آئینہ "خودی" وجہانے نمودۂ

تو ایک پھول ہے اور اس پھول کی ہر ایک پنکھڑی میں ہزار چمن کی رنگینی اور خوشبو بسی ہوئی ہے۔ تیری "خودی" ایک آئینہ ہے جس میں ایک جہان منعکس ہو رہا ہے، یعنی تو خود ایک جہاں ہے، نہاں در ہر کف خاکے جہانیست، جہاں تو تیرے قلب میں سمایا ہوا ہے، اس لئے تیری خودی ہی اس حقیقت کی آئینہ دار ہے جس کا جلوہ دو عالم ہے۔

مژگاں شکست بست و کشاد طلسم دہر
اے چشم آگہی بچہ غفلت غنودۂ

یہ تو ظاہر ہے کہ اگر ہم مژگاں اٹھا کر دیکھیں تو ایک جہاں کا نظارہ پیش نظر ہے اور اگر بند کر دیں تو سب کچھ بمنزلہ عدم ہے، یہ طلسم دہر اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تیری پلکوں کے کھلنے اور بند ہونے پر موقوف ہے۔ تیری آنکھ بصر و بصیرت ہے کس غفلت میں سویا ہوا ہے۔

عالم تمام عرض پیام خود است و بس
اے شوق نالہ کن چہ از خود ستودۂ

تمام عالم اپنی ہی خودی کا پیام دے رہا ہے اسے غیر کا عشق نہیں، نور ظلمت سے اور ظلمت نور کے حال سے بے خبر ہے، ہستی میں ہر ایک امکان ظہور کا طالب ہے۔ ہم اسے حسن و خوبی سے موسوم کریں یا بُرے ناموں سے یاد کریں، مدح کریں یا ذم یہ ہمارا اپنا تصور کسی شے کی نسبت ہے۔ وہ شے ہماری مدح و ذم سے بے نیاز ہے، اور اپنے حال میں مست ہے۔

ہستی میں ہر ایک شے پیامِ حق لے کر آتی ہے، یعنی جو خوبیاں اس میں فطرتاً ودیعت ہیں اس کا اظہار کرتی ہے اور یہ باطل نہیں، ہوائیں مبشرات ہیں، بارش کی خبر دیتی ہیں، مینہ برستا ہے تو مُردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے، آگ کا خاصہ جلانا ہے اور علیٰ ہذا القیاس، ہر ایک شے اپنے ہی خواص اور حقائق کا اظہار کرتی ہے یعنی اپنی ہی "خودی" سے واقف بھی ہے اور اس کا مظاہرہ بھی کرتی ہے اسے غیر اور اس کے حُسن و قبح سے کوئی غرض نہیں۔

فہم اگر نبود شنیدن ہم غنیمت گیر و بس
نغمہ ہا بسیار دارد تارِ موہومِ نفس

اگر کوئی شخص عقل سے کام لینا جانتا ہے اور جو کچھ اسے فہم حاصل ہے بیان کر سکتا ہے تو ایسے شخص کا کلام اس شخص کو گوشِ ہوش سے سُننا چاہیئے جو خود فہم سے بے بہرہ ہے۔ اگر مُنہ سے بول نہیں سکتے تو خاموشی سے دوسروں کی سنو، اگر کان شنوا ہیں تو گو ایک شخص گنگ ہو اس شنوائی سے بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتا ہے، لیکن اگر سمع سے بے بہرہ ہو تو زبان اسے کچھ فائدہ نہ دیگی، وہ بول نہیں سکتا، اس لئے ثابت ہُوا کہ سماعت حصولِ فہم کے لئے مقدم ہے، تارِ نفس موہوم ہے، ہر ایک سانس دم بھر میں فنا ہوتا رہتا ہے، اس تارِ نفس سے بے شمار نغمات نکلتے ہیں اور ان کا تعلق "سمع" سے ہے۔

از طلسمِ ما و من بیگانہ نتواں زیستن
شوق مفت زندگیہا عشق اگر نبود ہوس

یہ جہانِ من و تُو بھی ایک طلسمی کارخانہ ہے، اس سے الگ ہو کر ہم زندہ نہیں رہ سکتے، اور ظاہر ہے کہ جو مر گیا وہ الگ ہو گیا، اگر ہوا و ہوس عشق کا درجہ حاصل نہ بھی کرے پھر بھی شوق سے تو خالی نہیں اور زندگی اور لطفِ زندگی اسی ہنگامہ آرائی میں ہے خواہ یہ ہوس ہو یا عشق۔

ایکہ از فہم حقائق دم زنی خاموش باش
عمرہا باید کہ دریابی زبان خویش را

سطور بالا میں "نطق" کا مذکور ہو چکا ہے۔ علم منطق صحیح خیالات کی ترکیب و ترتیب سے واقف ہونا ہے، خیالات ممکنات خارجہ کے ذہنی تصورات ہیں۔ ان تصورات ذہنی اور اشیاء خارجہ کی صورتوں میں عین مطابقت کا نام علم الاشیاء ہے، ان صورتوں میں حقائق اشیاء رونما ہوتے ہیں۔ یہ علم حقائق ہے، ان کا فہم بہت مشکل ہے، اور فہم کے بعد ایسے موزوں اور مناسب الفاظ میں اس کا اظہار کہ متکلم مخاطب کے دل میں اپنا ما فی الضمیر فہم من وعن ڈال دے۔ علم "بلاغت" سے موسوم ہوتا ہے، ہمارا ما فی الضمیر کیا ہے؟ وہی خارجی کائنات کا تصوّر، یا یوں کہو کہ یہ کائنات کے تصویری حروف ہیں۔ اور تمام کائنات چلتی پھرتی، جیتی جاگتی تصویریں ہی تو ہیں یہ تصویری حروف اپنے معانی یا حقائق ہم پر واضح کر رہے ہیں، یہ تصویری حروف کائنات کی زبان ہے۔ یہ حروف کتاب کائنات کے ہیں اور یہی ہمارے آئینہ دل پر منعکس ہوتے ہیں ان کے معانی کی ترجمانی ہمارا قلب اپنی مادری زبان میں کرتا ہے۔ یہ ہے "زبان خویش"، جس کی حقیقت وہی کائنات کے تصویری حروف اور معانی ہیں۔ اگر ہمیں اس حقیقت کا فہم ہے اور اس فہم کی صحیح ترجمانی کر رہے ہیں تو ہمیں علم حقائق حاصل ہے مگر عموماً اس میں ہمارے توہمات اور تمنائیں دخل دیتی ہیں اس حالت میں یہ "ظنیات" سے تعبیر ہوتا ہے اور "حق" سے دور تر ہے، بیدل کہتا ہے کہ حقائق کا فہم بلا آمیزش ظنیات بہت مشکل ہے، "حق" کا مشاہدہ یا کائنات کو اسی صورت میں دیکھنا جیسی کہ وہ ہے تزکیہ نفس و تصفیہ قلب کے ساتھ ہی ممکن ہے اور اس کے لئے ایک عمر چاہئے۔

روزگارے در قفائی وہم باید تاختن
تا دریں صحرا بدست آری عنان خویش را

ہم عرصہ دراز تک توہمات اور ظنیات کو حق سمجھ کر ان کا اتباع کرتے ہیں۔ اس صحرائے تحقیق میں قرن ہا قرن گذر جاتے ہیں پھر کہیں جا کر ہماری عنانِ توجہ صحیح راستہ پر گامزن ہوتی ہے۔ عالم انسانی کے ذہنی ارتقا و تاریخ کی ورق گردانی کرو یہی کائنات ہے جس کی اشیاء ہمیں دیوتا اور دیویاں نظر آتی ہیں اور ان کی مورتیوں کو ہم پوجتے رہے، یہی سورج اور چندر دیوتا ہیں جو آج ہمارے گھر کے چراغ ہیں، یہی کائنات ہے جو کسی وقت ہماری معبود تھی اب ہم صحیح فہم کے ساتھ مسخر کر رہے ہیں۔ اب یہ ہماری پجارن ہے۔

در ہوائی بے نشانی تا نگردی بے نشان
سخت دشوار است پے بردن نشانِ خویش را

جب تک تو اپنے نفس کی خواہشات، توہمات، ظنیات غرض سب مکروہات سے خالی الذہن نہیں ہوتا جسے اصطلاح میں "تقوے" کہتے ہیں تو اپنی حقیقت کو نہیں پا سکتا کائنات ہماری پیدا کردہ نہیں اس کے تصورات ہمارے پیدا کردہ نہیں ان کا ایک شعور ہے، فہم ہے جسے ہم اپنا کہتے ہیں لیکن ہم کچھ آپ بھی پیدا کرتے ہیں خواہ اچھا ہو یا بُرا۔

ہے برہم زدن دارد قماش خوب و زشت
تا شناسی جنس موہوم دکان خویش را

ہماری دکان قلب کا سرمایہ اصلی تو یہی تصوّرات ہیں جن کا مذکور ہو چکا، لیکن مصری، یونانی، رومی، ایرانی، ہندی "مائی تھولوجی" کا مطالعہ کرو آپ کو عجیب و غریب شکلیں نظر آئیں گی۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا یہ سب جنس موہوم ہے اور باطل ہے حق کو ہماری قوت واہمہ باطل بنا رہی ہے۔ شیخ چلّی نے جو اسباب اپنے تخیّل میں جمع رکھے تھے انھیں حق کی ایک ٹھوکر نے پاش پاش کر کے رکھ دیا، غرض جب تک

نقوا: اعتبار نہ کرو گے حقیقت کا فہم محال ہے۔ تیری ہستی کا سرمایہ بھی خوب زشت ہے جو موہوم ہے

ہوش اگر باشد کتاب و نسخہ درکار نیست
چشم واکردن زمیں تا آسماں فہمیدن است
دور گردیہای وہم آنسوی خویشت می برد
ورنہ ہر چیزے کہ می بینی ہماں فہمیدن است

"واہمہ" ہمیں ہر ایک وادی میں سرگرداں لئے پھرتا ہے اور ہم کائنات کے باہر توہمات کے پر و بال پہ پرواز کرتے ہیں، ورنہ حقیقت یہی ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے بلکہ اس سے بھی نزدیک تر ہے، ہمارے شعراء کا تخیل عموماً یہی واہمہ ہے۔ صحیفہ فطرت یہی "کتاب" کائنات ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے کھلی ہے۔ ذرہ ذرہ اس کی آیت ہے (ذلک الکتاب لاریب فیہ) اور اسی سے ہمارے تمام علوم ماخوذ ہیں۔ اس لئے اہل عقل و فکر اسی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور حقائق ان پر منکشف ہوتے ہیں۔ یہ "واہمہ" ہے جو صحیح معنی میں شیطان ہے جو ہمیں دور تر رکھتا ہے اور ہم شبہات اور وسوسوں میں مبتلا رہتے ہیں، ورنہ جو کچھ کہ تو دیکھ رہا ہے اور دور جانے کی ضرورت نہیں، نزدیک تر دیکھ رہا ہے یہی کچھ سمجھنے کی بات ہے۔

مقامِ بیدل

بیدل کا جو کچھ مرتبہ ہے اس کے کلام سے اس کا پتہ مل سکتا ہے ہم نے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش کئے ہیں، ان میں اس کا حکیمانہ تفکر زیادہ تر کارفرما ہے۔ ایک خشک مضمون میں اس کے شاعرانہ تخیل نے جو لطافت اور رنگینی پیدا کی ہے وہ خاص بات ہے جو اسی کا حصّہ ہے ہم چاہتے تھے کہ ایسے اشعار کا بھی انتخاب کریں جس میں زیادہ تر شعریت پائی جائے، مگر وہ ہر ایک بات میں وہ بات پیدا کرتا ہے جو دل پر نقش ہو جاتی ہے جس پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ چند اشعار تلاش سے ہم نے منتخب کئے ہیں، شاید ان سے اس کی بلندی فکر کا کچھ اندازہ ہو سکے، بیدل نے اکثر دو غزل، سہ غزل بلکہ چہار غزل اور شش غزل بھی ایک ہی زمین میں کہی ہے، طویل بحر میں کہنا تو اس کا حصّہ ہے۔

یا رب چہ بلا بود کہ تر دستی ساقی

برخرمن مخمور نشاند آتش تر را

شراب کو "آتش تر" کہا گیا ہے۔ آگ کا کام جلانا اور تری کا بجھانا ہے۔ "خرمن مخمور" میں "خرمن" کو ڈر آگ کا ہے اور پانی کی تری اس خطرہ کو رفع بھی کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عالم اضداد ہے اور اضداد ایک دوسرے

کو فنا کرتی ہیں مگر ان میں عدل سے توازن ایسا قائم کیا گیا ہے کہ دونوں موجود بھی ہیں اور مخلوط بھی اور ایک دوسرے کے اثر کو زائل بھی کر رہی ہیں اور ممد حیات بھی ہیں، ساقی اصطلاح میں ذات حق تعالےٰ ہے، (وسقھم ربھم شرابا طھورا)

زیں بادیہ رفتم کہ بسر چشمہ خورشید
چوں سایہ بشویم ز جبیں گرد سفر را

اس شعر میں چند خیالات کے اختلاط سے ایک مضمون باندھا گیا ہے، بیدل کے کلام کی طرزِ یہ خاص ہے "بادیہ" یہ خاکدان کرۂ ارض ہے، سایہ بھی اسی پر پڑتا ہے، سایہ اسی شے کا ہوتا ہے جس پر سورج کی روشنی پڑتی ہے انسان کا جسم بھی خاکی ہے۔ غبار آلود چہرہ کو چشمہ کے پانی سے دھویا جاتا ہے، یہ تصورات ہیں، شعر میں آیہ کریمہ (کیف مد الظل الایہ) کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اس بادیہ ہستی میں کہیں سے مسافر آئے ہیں اور اس سے گزر رہے ہیں۔ اس بادیہ کی گرد و غبار سے ہم اثنار سفر میں ضرور آلودہ ہوئے اب چشمۂ خورشید پر جا کر منہ ہاتھ دھوئیں گے۔ جسطرح سایہ خورشید کی روشنی میں فنا ہو جاتا ہے اسی طرح یہ گرد بھی دور ہو جائے گی یعنی جب ہم اصل آفتاب حقیقت کی طرف رجوع کریں گے تو اس جسم خاکی کی آلودگی دور ہو جائے گی اور روحانی لطافت باقی رہ جائیگی۔

یکتائے آفرید لب خود ستائ عشق در نقطہ دہن الفے داشت میم ما

لفظ "ما" میں دو حرف میم اور الف ہیں۔ سب سے بڑا وصف اور تعریف کسی کی یہ ہے کہ وہ یکتا ہے، بے مثل ہے، اگر ویسا ہی کوئی اس کا مدِّ مقابل ہو تو ظاہر ہے کہ وصف یکتائی قائم نہیں رہے گا۔ منہ کی صورت بھی "نقطہ" کی ہے۔ عشق خود ستا ہے اپنی حمد وحدت آپ کر رہا ہے کہ وحدت یکتا ہے جیسا الف، الف نقاط کا مجموعہ ہے، "الف" کے معنی عربی میں یکہ و

تنہا شخص، الف تو وحدت بلا شرکت غیرے پر دلالت کرتا ہے، وحدت سے وحدت ہی کا ظہور ہو گا۔ "میم" جو لفظ "ما" میں ہے الف سے پیوستہ ہے اور ایک ہی حرف ہے۔ عربی میں حرف "میم" کے معنی جوڑنے والی شے "موم" بھی یہی لفظ ہے۔ کچھ شک نہیں کہ خالق تو ذات یکتا بے ہمتا ہے مگر مخلوق بھی یکتا ہے اور مخلوق کی یکتائی ہی ستائش یکتائے ذات الٰہی ہے۔ اور یہی اس کی یکتائی پر دلالت کرتی ہے، "دہن" کو نقطہ سے تشبیہ اس لئے دی گئی ہے کہ ریاضی میں یہ ایک موہوم شے ہے جس کا نہ طول ہے نہ عرض، "لب خودستائی عشق" نے نقطہ دہن میں الف وحدت کو "ما" کی میم سے ربط دیا ہے۔ مثنوی عرفان میں نعتیہ اشعار میں بیدل یہی خیال اور واضح کرتا ہے کہ نہ گنجد در احد غیر از احد ہیچ۔ "احد" کے دہن سے ایک حرف میم نکلا (احمد) تو وہ بھی ایک ہی ہے یعنی آنحضرتؐ کا نظیر بھی موجود نہیں، احد کا ظہور حرف دہن سے جو "میم" سے مل کر ہوا اور یہ احمدؐ ہے (لولاک لما خلقت الافلاک)۔

کشتۂ آں چشم مخمورم کہ حد سرمہ اش
تا سر کوئی تغافل می کشد دنبالہ را

میں تو اس مست آنکھ کا متوالا ہوں کہ اس میں سُرمہ کا دُنبالہ اتنا کھچا ہوا ہے کہ کوئے تغافل کی حد سے مل گیا ہے

با نرگست چہ عرض تمنا دہد کسے دیدیم سرمۂ کہ نگاہ شد صدائے ما

محاورہ میں "سرمہ کھلانا" سے مراد کسی کو چپکا کرنا ہے کہتے ہیں کہ سُرمہ کا اثر یہ ہے کہ اگر کوئی کھلائے تو گلا بیٹھ جاتا ہے اور آواز نہیں نکلتی۔ سُرمہ کا تعلق آنکھ سے ہے۔ نرگس استعارہ میں آنکھ کو کہتے ہیں۔ مطلب شعر یہ ہے کہ تیری آنکھوں کے سامنے اپنی خواہشات کا اظہار کوئی کیا کرے، ہم نے ان آنکھوں میں سرمہ دیکھا تو کچھ بول نہ سکے ہماری صدا نگاہ بن گئی، یعنی بول نہ

سکے دیکھتے رہے، اور سمجھ گئے کہ سُرمہ کا ایما یہ ہے کہ دیکھو اور چُپکے رہو، اللہ تعالےٰ بصیر ہے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور وہ بھی جو گزُر چکا اور گزُرنے والا ہے اس کے حضور عرض تمنا کی حاجت ہی کیا ہے، جو سب کچھ دیکھتا اور جانتا ہے۔

عدم گفتن کفایت می کند تا آدم و حوا
دگر اے ہرزہ دریں وہم طومار نسب مکشا

آدم و حوا کی اولاد تمام عالم انسانی ہے اور آدم و حوا کا نسب عدم سے شروع ہوتا ہے (لم یکن شی مذکورا)

ایں آدم و حوا شرف نسبت ہستیت
بیدل نتواں پیش عدم نام نسب برد

خلقے، امدادے، مدارائے، نیازے، خدمتے
اے زمعنی غافل آدم شو بایں مقدار ہا

انسانیت کا تقاضہ ہے کہ خلق سے پیش آئے، جو محتاج ہیں ان کی امداد کرو، دلجوئی کرو، انکسار سے کام لو، اور بزرگوں کی خدمت کرو۔

سرشکم، دود آہم، شعلہ ام، داغ دلم بیدل
چو شمع از حاصل ہستی سراپایم ہمیں دارد

شمع آنسو، دھواں، شعلہ، داغ سب کچھ ہے، میرا سراپا شمع کی طرح ہستی سے یہی کچھ حاصل کر رہا ہے۔

داغ زیر پا و آتش بر سر و در دیدہ اشک
شمع را در انجمن بودن چہ جائے خرمیست

اس انجمن ہستی میں ہم شمع کی مانند ہیں آنکھ میں آنسو، سر پہ آگ، پاؤں آبلہ پا، اس حال میں ہمیں خوشی کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔

دل وفا، بلبل نوا، واعظ فسوں، عاشق جنوں
ہر کسے درخورد ہمت پیشہ پیدا می کند

ہر کسے را بہر کارے ساختند، ہر ایک شخص اپنی فطری استعداد کے مطابق اور قابلیت کے مناسب عمل کرتا ہے (کل شی یعمل علیٰ شاکلتہ)

رنگ حال ہیچ کس بر ہیچ کس روشن نشد
شمع گل کردند یاراں یا ز محفل بردہ اند

کسی پر کسی کا حال روشن نہ ہؤا کہ کس رنگ میں ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس محفل ہستی میں یا تو یاروں نے شمع ہی بجھا دی ہے یا محفل سے باہر لے گئے ہیں۔ شمع ہوتی تو روشنی میں ہر ایک کا رنگ روپ بھی روشن ہوتا۔

در سراغ عافیت بیہودہ می سوزی نفس
زیں بیاباں رفتگاں با خویش منزل بردہ اند

منزل تو عافیت ہے جب مسافر دوڑ دھوپ کے بعد منزل پر پہنچ جاتا ہے تو آرام و آسائش سے بیٹھ جاتا ہے اس منزل عافیت کا سراغ اس زندگی میں تو ملنے سے رہا۔

مدعا از ہستی ما یس ہمیں آزار بود
ورنہ در کنج عدم آسودگی بسیار بود

اس بیاباں ہستی میں تو بے فائدہ عافیت کی تلاش میں سعی کر رہا ہے۔ جو بھی اس بیابان سے باہر نکلے وہ اس منزل کو اپنے ساتھ لے گئے یعنی عافیت اور آسودگی قبر ہی میں نصیب ہو گی۔

کردم از ہر کہ دریں خانہ سراغ تحقیق
گفت از آمدنت پیش ہمیں جائش بود

اس خانہ ہستی میں جس کسی سے میں نے "تحقیق" کا پتہ پوچھا تو جواب یہ ملا کہ تیرے آنے سے پہلے اسی جگہ تھی یعنی تیرے آنے سے پہلے تو یہاں تھی

تو آیا وہ گئی "تحقیق" کے معنی ہیں حق شناسی، بیدل کہتا ہے کہ میرے زمانہ میں رحلت فرما چکی تھی۔

از ترحم تا مروّت وز مدارا تا وفا
ہر چہ را کردم طلب دیدم زعالم رفتہ است

گاہ در چشم تر وگہ بر مژہ گاہے بخاک
ہمچو اشک نا اُمیدی خانہ بردوشیم ما

انسان عالم یاس میں روتا ہے، میں بھی آنسو کی طرح کبھی دیدہ تر میں، کبھی مژگاں پر، کبھی خاک پر آ رہتا ہوں، اسی طرح خانہ بدوشی میں عمر گزر گئی، آخر خاک میں مل گئے۔

بخاموشی تواں شد ایمن از ایذائے کج بحثاں
نفس دزدیدنست اینجا فسون نیش عقربہا

کہتے ہیں کہ اگر بچھو کاٹے تو دم بند کر لینا چاہیئے، زہر اثر نہیں کرتا، جس طرح بچھو "کژدم" ہے اسی طرح کج بحث بھی بچھو ہی ہوتے ہیں ان کے ڈنگ سے بچنے کا علاج یہی ہے کہ خاموشی اختیار کرو۔

ہر کہ آمد مشت خاکے بر سر او ریختند
تا کے آخر گرد ایں ماتم سرا خواہد شکست

جو بھی اس خاکدان میں آیا اس کے سر پر آخر مٹھی بھر مٹی ڈالی، نہ معلوم اس ماتم سرا کا غبار کب بیٹھے گا آدمی مرتا ہے تو اس کو سپرد خاک کرتے ہیں اور ایک مٹھی بھر مٹی ہر ایک شخص کار ثواب سمجھ کر ڈالتا جاتا ہے یہاں تک کہ قبر بن جاتی ہے خدا معلوم یہ دنیا ماتم سرا کب تک قائم رہے گی۔

چہ خوش است اگر بود آں قدر ہوس بلندی منظرت
کہ براں مکاں چو قدم نہی خم گردشے نخورد سرت

ہر ایک شخص کے سر میں اقتدار اور علو کی ہوا سمائی ہوئی ہے اس میں کچھ قباحت نہیں کیونکہ ارتقاء پسندیدہ امر ہے مگر ایسی بلندی تک جانا کہ سر چکرائے مذموم ہے، عموماً پست فطرت سفلے جب کسی بلند مرتبہ پر پہنچتے ہیں تو ان کا دماغی توازن قائم نہیں رہتا وہ لوگوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور جتنی بلندی پر آپ جائیں اتنی ہی چھوٹی پستی پر ہر ایک شے نظر آئے گی۔

بگذر ز غنا تا نشوی دشمن احباب — اوّل سبق حاصل زر ترک سلام است

بیدل اکثر اشعار میں اضداد جمع کرتا ہے اور ان سے ایک بات پیدا کرتا ہے اس شعر میں احباب یعنی دوست اور دشمن اور حاصل اور ترک اضداد ہیں۔ عام دیکھنے میں آتا ہے کہ اہلِ زر اپنے دوستوں سے کنارہ کش رہتے ہیں۔

بیدل اکثر سنگلاخ زمین میں بھی اسی طرح بے تکلف چلتا ہے جس طرح بحر طویل میں شناوری کرتا ہے۔

شوکت ملک و ملک تا اوج اقبال فلک
جملہ پامال است ہر گہ میفشانی پشت دست
از کفم بیدل نمیدانم چہ گل دامن کشید
کہ ندامت کردم آخر ارغوانی پشت دست

پہلے شعر میں پشت دست جھاڑنا یعنی دست بردار ہو جانا اور دوسرے شعر میں ندامت سے ہاتھ کاٹنا اسی طرح اس غزل میں اس نے "پشت دست" خوش اسلوبی سے نبھایا ہے۔ اسی طرح "تیغ است" ردیف ہے۔

غنچہ نیست کہ زخمے ز تبسم نخورد
با خبر باش کہ انداز شگفتن تیغ است
مصرع تازہ کہ از بحر خیالم موجیست
دوست را آب حیات است و بدشمن تیغ است

مثل ما وفنا موج وحباب ست این جا
سرِ زتن نیست کسے را کہ بگردن تیغ است

حباب کو سر سے اور موج کو تیغ سے کیا اچھی تشبیہ ہے۔ اور امر واقعہ بھی یہی ہے کہ امواج میں حباب اس طرح نظر آتے ہیں جیسے کٹے ہوئے سر۔ غالب مرحوم کا ایک شعر ہے کہ

تیغ تو نازد بسر فشانی عاشق
موج ہمی بالد از حباب شکستن

یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ لفظ "حباب" کو بیدل نے اکثر اشعار میں باندھا ہے۔ "مثنوی طور معرفت" کے تحت ہم چند اشعار پیش کر چکے ہیں۔ غالب مرحوم کی کلیات فارسی شروع سے آخر تک اس غرض سے دیکھ ڈالی، کہ مرحوم نے یہی لفظ کس مضمون میں باندھا ہے۔ تین شعر ملے ایک تو اوپر درج کیا گیا دو اور ہیں۔

وقت است کز روانی مے ساقیانِ بزم
پیمانہ را حباب لب آب جو کنند

تیسرا شعر بیدل کے اس شعر کے بعد پڑھیے۔

بہ بحر عشق ہر موج از حبابے سرخوش است اما
سرے کو تا بعرض گردش آرد ساغر تیغش

تیغش کی زمین کتنی سنگلاخ ہے۔

حباب از فرق عشاق است و موج از تیغ خوبانش
شہادت گاہ اربابِ وفا دریاست پنداری

(غالب)

مثل ما وفنا موج وحباب ست این جا
سرِ زتن نیست کسے را کہ بدامن تیغ است

(بیدل)

ممکن ہے کہ تلاش سے ایک دو شعر اور بھی مل جائیں مگر مجھے تلاش سے یہی تین شعر ملے۔ بیدل کہتا ہے کہ

گر آرزو شکند می شود عمارت دل
شکست موج بود باعث بنائے حباب

غالب کہتا ہے کہ (موج ہمی بالد از حباب شکستن) بیدل نے دل کو حباب سے تشبیہ دی ہے اور موج میں اضطراب "ہوا" کا پیدا کردہ ہے اگر یہ ٹوٹے تو حباب کی صورت پیدا ہوتی ہے ہوا و ہوس محو ہو تو "عمارت دل" ہے۔

بیدل نے "حباب" کو جن اشعار میں باندھا ہے علاوہ مثنوی طور معرفت ان کی تعداد بہت ہے اور انہی سے ایک دیوان مرتب ہو سکتا ہے میں نے یک صد اشعار جمع کئے تھے۔ اس مقام پر انھیں درج کرنا موجب طوالت ہے ایک غزل کی ردیف ہے "زیر پوست" دو شعر ملاحظہ ہوں۔

از لب خاموش نتوانم حریف عشق شد
چند دارد ایں حباب پوچ عمان زیر پوست

چوں حباب از پیکر حیرت سرشت ما مپرس
نقش ما بے پردہ پنہاں ست عریاں زیر پوست

اس مضمون کا ایک شعر ہے کہ

کہ دارد بے سروسامانی وضع حباب من
برنگے گشتہ ام عریاں کہ گوئی پیرہن دارم

لباس اور عریانی کا تخیل ان اشعار میں ملاحظہ ہو۔

نشد حجاب خیالم غبار جسمانی حباب را تہ پیراہنست عریانی

جس طرح حباب پیراہن کے نیچے بھی عریاں نظر آرہا ہے اسی طرح ہمارا خیال یا دل ہے کہ غبار جسم خاکی کے پردہ میں بھی عریاں ہے حباب

اور عریانی اضداد ہیں گرد و غبار ہر ایک شے کی صورت پوشیدہ کرتا ہے جسم خاکی بھی یہی گرد و غبار ہے اصل شئے دل ہے۔

نمی گنجم بعالم بسکہ از خود گشتہ ام فانی
حبابم را لباس بحر تنگ آمد بعریانی

مکان و زماں کی قید میں ہر ایک شے معین اور محدود ہے، اگر یہ حدود توڑ دئے جائیں تو ہر ایک شے آزاد غیر محدود ہے، عالم تو انہی حدود اور حجاب سے بنا ہے جس میں ہم بھی مقید ہیں اگر ان زنجیروں کو توڑ دیا جائے تو آزادی ہے۔ اسی تخیّل کا دوسرا رُخ ملاحظہ ہو۔

ز پیراہن بروں آ بے شکوہے نیست عریانی
جنوں کُن تا حبابے را لباس بحر پوشانی

"جنوں" میں کپڑے پھاڑتے ہیں، لباس زینت اور شکوہ کی شے ہے اور عریانی اس کی ضد ہے مگر بیدل کہتا ہے کہ عریانی بے شکوہ نہیں لباس تعینات کو پھاڑ کر اپنی حقیقت کو عریاں کر دے اگر حباب اپنے لباس تعیّن کو پھاڑ دے تو ظاہر ہے کہ بحر کا لباس پہن لے گا یعنی خود بحر ہو جائے گا (علےٰ کل شئ محیط)

ز پیراہن بروں آ، تا بہ بینی دستگاہ خود
حباب آئینہ دریاست از تشریف عریانی

دریں دریا کہ عریانی ست یکسر ساز امواجش
حباب ما بہ پیراہن رسید از چشم پوشیدن

حباب از پیرہن آئینہ داری می کند روشن
بپوشش ساختم تا ایں قدر دیدند عریانم

جب ہم آئینہ کو عریاں دیکھنے کے لئے اسے دیکھیں تو ہماری صورت خود بخود اس میں منعکس ہو گی جو اس کی پوشش بن جائے گی۔ اور پوشش محدود شے پر ہو گی، یہی کیفیت رونما ہوتی ہے جب ہم اپنے آئینہ قلب میں نظر کرتے ہیں ہم غیر محدود ہوتے ہوئے بھی محدود دکھائی دیتے ہیں۔

دیدۂ داری چہ می پرسی زجیب و دامنم

چوں حباب از شرم عریانی عرق پیراہنم

"عرق پیراہن" کیسی لطیف ترکیب ہے شرم کے مارے پانی پانی ہونا محاورہ ہے جیب و دامن سے مراد سرمایہ داری ہے۔ مجھ سے کیا پوچھتا ہے کہ سرمایہ ہستی میرے جیب و دامن میں کتنا ہے، تو دیکھ رہا ہے کہ شرم "نیستی" کی وجہ سے عرق پیراہن ہوں۔

ایک اور مشکل زمین کی ردیف "زنجیر پاست" ہے۔

چوں حبابم الفت وہم بقا زنجیر پاست

خانہ بردوش طبیعت را ہوا زنجیر پاست

آدمی گھر بناتا ہے تو رہائش اور آسائش کے لئے جو باقی رہنے والی ہو، ہوا میں قلعہ تعمیر کرنا اُمید موہوم سے تعبیر ہوتا ہے حباب نے بھی ایک خانہ کی صورت اسی ساز و سامان ہوا سے بنا رکھی ہے یا م خانہ کے اوپر ہوا ہی ہوتی ہے "وہم" کی بھی کچھ حقیقت نہیں ہوتی مطلب شعر یہ ہے کہ ہم بقا کے طالب ہیں اور انہی تقیدات و تعینات میں ہم بقا چاہتے ہیں یہ خام خیال ہے لیکن وہم کا کرشمہ ہے۔ کہ اسی کو پختہ کئے ہوئے ہیں کہ دُنیا میں نہیں تو عاقبت میں ضرور فرداً فرداً اسی تعین کے ساتھ دائمی زندگی ملے گی یہ ہوا ہوس ہے، یہ وہم ہے، حباب نے تو آخر ٹوٹنا اور پھوٹنا ہے، اگر بقاء کی طلب ہے تو محیط میں محویت سے ہی حاصل ہو سکتی ہے، لیکن اس میں تیری انفرادی خودی محو ہو جائے گی۔

غرقِ بحر ز فکر حباب مستغنی است
رسیدہ ایم بجائے کہ بیدل آنجا نیست

ہستی و عالم میں جو ربط ہے وہ اسی فردیت میں مفہوم ہو سکتا ہے اس لئے بیدل کا مشورہ ہے کہ "زیں دو مصرع دور مگذر اندکے پیوستہ باش"۔

از ہوا برپا ست بیدل خانہ وہم حباب
در لباس ہستی ما جز نفس یک تار نیست

زندگی میں سکون نہیں اس دنیوی زندگی میں جو ہم ایک دم ٹھہرے ہوئے ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ

یک نفس ساکن دامان حبابیم امروز
ورنہ چوں آب رواں است ہماں پیشہ ما

زبسکہ می برم افسوس ازیں محیط ندامت
حباب آبلہ دارد چو موج سودن دستم

کفِ افسوس ملتے ملتے ہاتھوں میں چھالے اس طرح پڑ گئے جس طرح موجوں میں حباب، یہ پھپھولے تو ہاتھ کے ہیں پاؤں کے چھالے ملاحظہ ہوں۔

رہرو از رنج سفر چارہ ندارد بیدل موج دایم ز حباب آبلۂ پا دارد

اس شعر میں حباب و موج کو مسافر اور جادہ سے تشبیہ دی ہے منزل دل ہے۔

در طلب گاہ دل چو موج و حباب منزل و جادہ ہر دو در سفر است

اس شعر میں حباب کو "جرس" کارواں سے تشبیہ دی ہے اور قافلہ کو موج سے۔ بے جنبشِ دل راہ بجائی نتواں برد
یکسر جرس قافلہ موج حباب است

بیدل کے بعض اشعار میں "مبالغہ" ہے اور یہ ایک صنعت ہے مگر وہ مبالغہ میں بھی "واقعیت" ہی بیان کرتا ہے۔

بدل شکستہ ازیں چمن زدہ ایم بال گذشتنی
کہ شتاب اگر ہمہ خوں شود نرسد بگرد درنگ ما

"شتاب" اور "درنگ" اضداد ہیں، جو شخص دل شکستہ ہو اس کی رفتار سست پڑ جاتی ہے، لیکن باوجود اس کے کہ میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ اس باغ دنیا سے گذر گیا۔ اور قیاس ہو سکتا ہے کہ میں کتنا آہستہ آہستہ رُک رُک کر گذرا اس لئے بہت دیر سے گذرا مگر امر واقعہ یہ ہے کہ "درنگ" اتنا تیز رفتار تھا کہ خود "شتاب" اگر سرتاپا سعی ہو تو اس کی گرد تک نہیں پہنچ سکتا عموماً دُنیا سے جاتے وقت دل شکستہ ہی ہوتے ہیں اور کون مرنا چاہتا ہے مگر دُنیوی زندگی کیلئے ایک عرصہ ہے جس کا فاصلہ مژگاں سے مژگاں تک ہے آنکھیں کھلی ہیں تو زندہ ہے بند ہوئیں تو مُردہ۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا۔

سایہ ام را میتواں چوں زلف خوباں شانہ کرد
بسکہ طبع من بصد فکر پریشاں آشناست

نیستم آگہ چہ گل می چینم از باغ جنوں
ایں قدر دانم کہ دستم با گریباں آشناست

بیدل ایں محفل نہاں در گریہ شمع است و بس
داغ آں زخمم کہ با لب ہائے خنداں آشناست

بیدل کی نازک خیالی میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے ایک کیفیت ہے جو ذہن میں ..... اس کے اشعار کے الفاظ پیدا کرتے ہیں، محبوب کی زلفیں بھی پریشان ہیں اور ان کو سنوارنے اور ہموار کرنے کے لئے شانہ کی ضرورت ہے، اسی طرح میری طبع میں سینکڑوں

پریشان خیالات ہیں جو میرے وجود کا ایسے ہی جزو ہیں جیسا میرا سایہ، مگر سایہ میرے جسم سے جدا ہے اور یہ پریشانی ہے۔ خیالات کا اظہار حروف میں ہوتا ہے اور خیالات اور حروف میں ایسی ہی مماثلت ہے جیسی جسم اور سایہ میں اس لئے میرے سایہ کو بھی اسی طرح شانہ کی ضرورت ہے جیسے محبوب کی زُلف پریشان کو۔

"گل چینی" کے معنی فائدہ اُٹھانا، گل کا گریبان بھی تار تار ہوتا ہے، اس کی پنکھڑیاں جُدا جُدا ہوتی ہیں اور جنون میں بھی کپڑے پھاڑتے ہیں مطلب یہ ہے کہ باغ جنوں کی سیر سے مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ میں کیا حاصل کر رہا ہوں یہ "تجاہل عارفانہ" ہے، اتنا جانتا ہوں کہ میں دست دگریباں ہوں یعنی یہی گل چینی کر رہا ہوں۔

مقطع میں نازک خیالی اور بلندی فکر دونوں جمع ہیں ظاہر ہے کہ محفل کو روشن شمع کر رہی ہے۔ لفظ "نہاں" یعنی پوشیدہ روشنی کی ضد ہے۔ اضداد جمع کرنا بھی صنعتِ شعر ہے، شمع نہ روئے تو روشن بھی نہیں ہوتی، اس لئے محفل کی رونق کا راز شمع کے ایک گریہ میں مضمر ہے، مجھے تو اس زخم کے لبوں پر رشک آتا ہے جو خندہ سے واقف ہے۔ زخم کا مُنہ کھلا ہو تو وہ خندہ مماثلت ہے کہ ہنسی کے وقت لب کھل جاتے ہیں لفظوں میں زخم کا کھلنا بیان نہیں کیا لفظ "خندہ" سے یہ بات پیدا کی ہے، خندہ اور گریہ اضداد ہیں، لیکن خندہ تو بوجہ مسرت ہوتا ہے اور گریہ بوجہ غم، زخم کا خندہ مسرت کی وجہ سے کیسے ہو سکتا ہے مگر شعر میں یہی بات پیدا کی گئی ہے کہ دنیا تو غم و الم کی ماری شکوہ و شکایت و گریہ وزاری کرتی ہے اور جو اسباب گریہ وزاری کے موجب ہیں وہی عشاق کی فرحت و انبساط کا باعث ہیں کہ زخم خوردہ ہیں اور ہنستے ہیں، یہاں تک تو شعر کا مفہوم لفظی ہے، لیکن بیدل اس سے ایک کیفیت پیدا کرتا ہے، کہ شمع میں یہ سب باتیں پائی جاتی ہیں، گریہ وزاری بھی

ہے، وہ اہلِ بزم کے حال پر ہے اور اسی غم میں گھل رہی ہے۔ آگ میں جل رہی ہے اور داغدار بھی ہے، محفل کو روشن کر رہی ہے اس کا معاوضہ اسے داغ ہی ملتا ہے، لیکن وہ گلریز بھی ہے اور گل زخم خوردہ لب خنداں ہے۔ یہ مثال ان مصلحان بالخصوص انبیاء و رسل پر صادق آتی ہے جو ہر ایک ممکن مصیبت میں لوگوں کے بھلے کے لئے مبتلا ہوتے ہیں اور بخوشی خاطر برداشت کرتے ہیں، چنانچہ ایک شعر میں کہتا ہے کہ

مرگ صاحب دل جہانے را دلیل کلفت است
شمع چوں خاموش گردد داغ محفل می شود

صاحب دل ہی بزم ہستی کی رونق کا سبب ہیں جب یہ شمع خاموش ہو جاتی ہے تو محفل بھی تاریک ہے۔

نیست نقش پا بگلزار خرامت جلوہ گر
دفتر برگِ گل از دست بہار افتادہ است

"نقش پا" افتادہ ہوتا ہے، تیرے خرام میں چمن کی رنگینی ہے۔ تیرا نقش پا گیا ہے اوراق گل کا ایک دفتر ہے جو بہار کے ہاتھ سے گر کر بکھر رہا ہے، یہ تو ہے لفظی مفہوم، ہم بیدل کے نظریہ ہستی پر بحث کر چکے ہیں کہ کثرت جو ہم کائنات میں مشاہدہ کر رہے ہیں وحدت ہے جو مختلف صورتوں میں رونما ہے، اور صورتیں نقوش ہیں۔ مگر یہ صورتیں کتنی حسین ہیں کتنی دلکش ہیں، یہ حسن یہ رنگینی جو ان میں مشاہدہ ہوتی ہے وہ عکس اسی حُسن ازلی کا ہے جو بیرنگ ہے، "نقش پا" خاک پر نمایاں ہوتا ہے، اور یہ انسان خاکی ہے، یہ نقش اور اس کی چمن بندی انسان ہی ہے۔

دوستاں ظلمے بحال نامرادم رفتہ است
داشتم چیزے و "من بودم" زیادم رفتہ است

کتنا نازک خیال ہے، کتنا لطیف شعر ہے، کتنا دقیق مضمون ہے، یارو میری حالت قابلِ رحم ہے کتنا ظلم مجھ نامراد پر ہوا ہے (ربنا ظلمنا انفسنا) میرے پاس ایک چیز تھی اب بھول گیا کہ وہ کیا تھی، کتنا تجاہلِ عارفانہ ہے جب یہ گراں قدر شے میرے پاس تھی میں "باخود" تھا، "من بودم" اب ایسا بیخود ہوا ہوں کہ خودی کھو بیٹھا، یہ "من" یا "انا" ہے جس پر بیدل نے سیر حاصل بحث کی ہے۔

شکر اللہ خاں کے ہاں محفل شعر و ادب گرم تھی، ہم عصر شعرا میں ناصر علی بھی موجود تھا، بیدل نے ایک غزل پڑھی۔ مطلع ہے:

نہ شد آئینہ کیفیت ما ظاہر آرائی

نہاں ماندیم چوں معنی بچندیں لفظ پیدائی

ناصر علی نے اعتراض کیا کہ معنی تابع لفظ ہے، جب لفظ ظاہر ہے تو معنی بھی ظاہر ہیں۔ بیدل نے مسکراتے ہوئے کہا کہ جس معنی کو آپ لفظ کے تابع سمجھ رہے ہیں۔ "آں نیز لفظے بیش نیست، اما آنچہ من جیست ہی معنی است ہیچ لفظے در نمی آید، مثلاً صفت انسان کہ بایں ہمہ شرح و تفاصیل، کہ در کتب مندرج است ہیچ مکشوف نگردیدہ" ناصر علی چپکا ہو رہا۔ مطلب یہ ہے کہ "من" جیسا کہ وہ فی الحقیقت ہے معنی دارد کہ در گفتن نمی آید۔

بیدل کے اشعار میں جو تخیلات کارفرما ہیں ان سے بہت خیالات اور بھی پیدا ہو سکتے ہیں، اسی شعر سے یہ تخیل بھی اخذ کیا جا سکتا ہے۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں

لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

اسی غزل کے چند اشعار اور بھی ملاحظہ ہوں، ہر ایک فرد ہے۔

قفل وسواس است چشم من دریں عبرت سرا

ہمچو مژگاں عمر در بست و کشادم رفتہ است

بے نفس در ملک عبرت زندگانی می کنم
خاک برجا ماندہ است امروز بادم رفتہ است

سیر گل نذر جنون بے دماغی کردہ ام
پیش پیش رنگ و بو ہا اعتماد م رفتہ است

بر خیال خلد بیدل زاہداں را ناز ہست
یک از یں غافل کز یں ویرانہ آدم رفتہ است

قفل اور چشم میں تشبیہ اور مژگاں کے ساتھ بست وکشاد، گویا یہ کلید ہے جو قفل چشم کو کبھی کھولتی اور کبھی بند کرتی ہے اسی بست وکشاد میں اسی توڑ جوڑ میں وسوسوں میں عمر بسر ہو رہی ہے، جب دم ہوا ہو جائے تو مٹی میں ہماری مٹی ہی باقی رہتی ہے اور جو بے نفس آدمی ہیں ان میں بھی ہوا و ہوس نہیں ہوتی، کیا بیدماغی ہے کہ رنگ و بو کی طرح اعتماد بھی اُٹھ گیا، جہاں آدمی نہ ہو ویرانہ ہے، جنّت بھی خانہ بے آدمی ہے، زاہدوں کو آدمیت سے کچھ نسبت نہیں، ورنہ طالب جنّت کیوں ہوتے۔

ایک غزل کا مطلع ہے۔

دی ترنگے از شکست ساغرم گل کردو ریخت
شش جہت کیفیّت چشم ترم گل کرد و ریخت

اس غزل کی ردیف "گل کرد و ریخت" ہے اور قافیہ ساغرم، ترم ہے، اس غزل کا ایک شعر ہے کہ

شب چو شمع وعدہ دیدار در آتش نشاند
تا سحر آئینہ از خاکسترم گل کرد و ریخت

رات بھر وعدہ دیدار کی اُمید پر شمع کی طرح انگاروں پر لوٹتے رہے، دیدار اور آئینہ میں مناسبت ہے، رات تو اس طرح گزری صبح ہوئی تو شمع بھی جل کر خاکستہ ہو چکی تھی، لفظ گل نے ایک لطف پیدا کر دیا ہے،

شمع صبح دم گل ہو جاتی ہے یعنی بجھ جاتی ہے، اور شمع صبح تک گلریزی کرتی رہی، میں شمع کے گل جھاڑتا رہا کہ روشن رہے۔

کوہکن در تلخ کامی جوئے شیر ایجاد کرد

برزبان تیشہ گوئی نام شیریں رفتہ است

شیریں و فرہاد کا قصہ مشہور ہے۔ فرہاد کی عمر تو تلخ کامی ہی میں گزری مگر زبان تیشہ پر شیریں کا نام تھا کہ جوئے شیر بہادی "جوئے شیر آوردن" محاورہ ہے یعنی ناممکن کام کے لئے سعی بے حاصل ہے، اگرچہ فرہاد کی کوشش بھی بے فائدہ ہی تھی مگر اس میں بھی ایک ذائقہ تھا وجہ یہ ہے کہ شیریں کا نام درمیان تھا۔

ذوق وفائے وعدہ ات از دل نمیرود

قاصد ثمر نبود کہ گویم رسید و رفت

اس شعر میں لفظ "رسید" میں لطف پیدا کیا گیا ہے۔ ثمر کے ساتھ معنی پختگی ہے، پھل جب پکتا ہے تو گر جاتا ہے "رسید و رفت" "قاصد" کے ساتھ "رسید و رفت" یہ کہ آیا اور گیا، مطلب شعر یہ ہے کہ قاصد نے جو وعدۂ دیدار سنایا تو اس امید پر کہ ضرور وفا ہوگا کچھ ایسی لذت دل محسوس کر رہا ہے کہ یہ احساس دل سے نہیں جاتا اور نہیں جائے گا، یہ قاصد جو اس خاص مقصد کا حامل ہے پھل کی طرح نہیں کہ "رسید و رفت" یعنی یہ مقصد بالذات مستقل ہے، عارضی نہیں، بات بھی یہی ہے کہ اس وعدہ دیدار پر خواہ حشر میں ہو، زندگی ہے۔

گفتم رموز مطلب ہستی بیان کنم

تا برزباں رسید سخن لب گزید و رفت

میں نے چاہا کہ اسرار ہستی کے مطالب بیان کروں، ابھی یہ بات یعنی میرا کہنا کہ "رموز ہستی بیان کرتا ہوں" لبوں تک آئی تھی کہ کٹ

گئی، اتنا کہنا ہی ادھورا رہ گیا، اصل سخن رموزِ ہستی تو دل کے دل ہی میں رہے، یعنی یہ کہنے سننے سے باہر ہیں۔

گر ہمہ حرف حق است آندم کہ گفتی باطل است
ہرچہ بیروں آمد از لب خارج آہنگِ دل است

عمر بیست سراغِ دلِ گم گشتہ ندارم
یارب کجا ایں ورق از دفترِ من ریخت

ایک عمر گزر گئی اور مجھے دلِ گم گشتہ کا سراغ نہ ملا۔ خدا معلوم میرے دفترِ ہستی سے یہ ورق کہاں گرا۔

چگونہ عمر اقامت کند براہِ نفس
گرہ نمی خورد ایں رشتہ بسکہ کوتاہ است

نفس کو رشتہ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس رشتہ سے زندگی وابستہ ہے۔ لیکن یہ رشتہ اتنا کوتاہ ہے کہ اس میں گرہ نہیں دی جا سکتی "گرہ کو اقامت سے تعبیر کیا ہے، ویسے ہی تارِ نفس کوتاہ ہے۔

نہ لفظ دانم و نے معنی ایں قدر دانم
کہ گر سخن ز تو باشد جواب دشوار است

لفظ و معنی سے ہی متکلم کا ما فی الضمیر واضح ہوتا ہے۔ لیکن چون و چرا و چوں کا جواب نہیں اگر "ذات" باری کے متعلق ہو۔

نقشِ ہستی جز غبار دقت نظارہ نیست
ذرہ را آئینہ گر ہست چشمِ روزن است

فضا میں ذرّات نظر نہیں آتے مگر روزن میں سورج کی کرن پر رقص کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی کیفیّت نقشِ ہستی کی ہے کہ اس کا مشاہدہ جزوی تنگ تر حدود ہی میں ممکن ہے مثلاً برق تمام فضا میں موجود ہے اس کا علم ہمیں نہ ہوتا اگر اس کو قمقمہ کی تاروں میں نہ لاتے۔ ذرہ کو چشم

روزن ہی سے دیکھ سکتے ہیں۔ فہم ہستی کتنا دقیق ہے۔

خموشی نالہ می گردد مپرسید
کہ آں نا آشنا بیگانۂ کیست

یہ مت پوچھو کہ وہ نا آشنا کس کا آشنا نہیں ہے، یعنی سب کا آشنا ہے باوجود اس کے کہ آشنا ہے، کوئی اس سے واقف نہیں ہے، اگر پوچھو گے تو میں جو اس حقیقت سے واقف ہوں اور خموش ہوں بہ بانگِ دہل کہوں گا کہ

معشوق من بہ شیوۂ ہر کس برابر است
با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد
(حافظ)

شعورم رنگ گرداند از کہ پرسم
"زخود رفتن" رہ کاشانہ کیست

اس شعر میں بیدل نے اضداد سے ایک بات پیدا کی ہے، شعور اور لاشعور اضداد ہیں، شعورِ خودی کے ساتھ ہی ممکن ہے کسی راستہ کا علم شعور کے ساتھ ہی ہوتا ہے، لیکن جب راستہ کا نام ہی "از خود رفتن" یعنی بیخودی یا بے شعوری ہو تو شعور کیا بتائے گا؟ میں نے اس راستہ کی نسبت شعور سے دریافت کیا تو اس کا رنگ فق ہوگیا، اس شعر میں بیدل نے خودی اور بیخودی کا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ اس موضوع پر ہم کافی بحث بحوالہ بیدل کر چکے ہیں۔

گر بہ تحسین نکشاید لب یاراں بر جاست
در نیستاں قلم معنی ما شکر داشت

مٹھاس سے لب چمٹ جاتے ہیں قلم کو بھی "نے" کہتے ہیں گنّا کی پوری پوری قلم ہے اور اس سے شکر پیدا کی جاتی ہے قلم کا جوف نے کی طرح خالی ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ قلم حضرات اگر داد تحسین نہ دیں

تو بجا ہے کیونکہ جن معانی کا اظہار میں کر رہا ہوں وہ تو شکر ہیں، اس کی مٹھاس سے لب بند نہ ہوں تو کیا ہوں۔

ہر چند کہ عنقا ز خیال تو بروں است
ہر رنگ کہ داری بہ نظر نقش پر اوست

اگرچہ ذات باری تعالٰی تیرے خیال و قیاس و گمان و وہم سے بالاتر ہے مگر جو بھی رنگ جو بھی صورت تو دیکھ رہا ہے اسی کے پر کا نقش ہے۔

سواد نسخہ تحقیق بیدل دقتے دارد
دو عالم جلوہ باید خواندن و بیرنگ فہمیدن

اسی ذات کے اسما و صفات کا پرتو دو عالم ہیں۔

بیدل غبار قافلہ اعتبار ما
بارے دگر نداشت ہمیں چشم بست و رفت

تمام کائنات عالم اعتبارات ہے کہ اس کی ہر ایک شئے کسی نام سے تعبیر ہوتی ہے، قافلہ جا رہا ہو تو غبار راہ سے اس کا سراغ ملتا ہے، کہ یہ گرد قافلہ کی رفتار کی پیدا کی ہوئی ہے، قافلہ اسباب سے لدا ہوا ہوتا ہے، بیدل علائق دنیوی سے اپنی بے تعلقی ظاہر کرتا ہے کہ مجھ بے نوا کے پاس آنکھوں کے سوا اور کچھ نہ تھا، یہی اسباب باندھا اور چلتا ہوا، یعنی آنکھیں بند ہوئیں تو دنیا سے گزر گئے، اس خاکداں کا غبار جسم خاکی یہیں رہ گیا، "چشم بست"، گویا یہی اسباب باندھا اور چل پڑے۔

وارث دیگر ندارد دودمان زندگی
ہر کہ حسرت برد ازیں جا عبرتے با ما گذاشت

لوگ مر کر "حسرت" تو ساتھ لے جاتے ہیں، وراثت میں پیچھے "عبرت" چھوڑ جاتے ہیں وہ مجھے پہنچتی ہے، (فاعتبروا یا اولی الابصار)

عالمے با فتنہ می جوشد ز مرگ اغنیاء
خواب این ظالم سرشتاں بدتر از بیداری است

کوئی مالدار مر جائے تو ورثا میں تنازع شروع ہو جاتا ہے، صاحب تخت و تاج مرے تو قتل و غارت کا بازار گرم ہو جاتا ہے، ان کا مرنا ان کی زندگی سے بدتر ہے، زندگی میں جس فتنہ و شر کا باعث رہے اس سے بڑھ کر مرنے کے بعد ہوئے، زندگی میں فتنہ خوابیدہ مرنے کے بعد جاگ اُٹھتا ہے۔

بیدل نے فرمائشی غزل "حنا" کی تعریف میں کہی، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مشاطہ شوخی کہ بدست دل ما بست
میخواست چمن طرح کند رنگ حنا بست

آخر چمنے را بسر انگشت تو پیچید
واکرد نقاب شفق و غنچہ نما بست

زیں نور کہ از شمع سر انگشت تو گل کرد
تا شعلہ زند آتش یاقوت حنا بست

آں رنگ کہ می داشت دریغ از ورق گل
از دور کف دست تو بوسید و بپا بست

آبست ز شبنم دل ہر برگ گل امروز
کایں رنگ چمن ساز و فا سخت بجا بست

تا چشم کشاید مژہ آغوش بہار است
رنگ سر ناخن چقدر عقدہ کشا بست

بیدل تو ہم از شوق چمن شو کہ بایں رنگ
شیرازہ دیوان تو امروز حنا بست

نقاشِ ازل تا کمر مو کمراں بست
تصویرِ میانت بہماں موئی میاں بست
از غیرت ناز است کہ آں حسن جہانتاب
واکرد نقاب از رُخ و بر چشم جہاں بست
آنچہ نتواں داد جز در دست محبوباں دل است
وانچہ نتواں ریخت جز در پائی خوباں آبروست
وہ شے جو کسی کے ہاتھ میں سوائے محبوب نہیں دی جا سکتی دل ہے،
اور آبرو خوبروؤں کے پاؤں کے سوا کہیں اور نہیں گرائی جا سکتی۔

چقدر عالم بیدل بخیال آمدہ ایم
ہر کہ برما نظرے کرد دل از ما برداشت
"دل از ما برداشت" میں شعر کی لطافت ہے، جس کسی نے مجھ پر
نظر کی دل برداشتہ ہوگیا یا میرا دل لے گیا، اس لئے میں بیدل ہی
رہ گیا۔

ہر کجا گل کرد داغے بر دل دیوانہ سوخت
ایں چراغِ بیکسی تا سوخت در ویرانہ سوخت
وضعِ دنیا ہیچ بر دیوانہ تاثیرے نکرد
بیشتر ایں برقِ عبرت خرمنِ فرزانہ سوخت
داغِ دل شد رہنمائی کوہ و ہاموں لالہ را
سر بصحرا میزند ہر کس متاعِ خانہ سوخت

شب کہ شد زاہد بفیضِ گردشِ جامِ آشنا

سبحہ جائی جُرعہ مے بر زمین رندانہ ریخت

دستور رنداں ہے کہ شراب پینے سے پہلے تھوڑی سی زمین پر چھڑک دیتے ہیں۔ چنانچہ حافظ کہتا ہے کہ

اگر شراب خوری جرعہ فشاں بر خاک
ازاں گناہ کہ نفعے رسد بغیر چہ باک

حضرت زاہد گردشِ جام سے فیض یاب ہوئے تو دستور کے موافق ایک دو گھونٹ زمین پر چھڑکتے مگر آپ نے سبحہ کو زمین پر پھینک دیا، یعنی زہد وریا سے توبہ کی۔

ہر کہ آمد سیر یاسے زیں گلستاں کرد و رفت
گر ہمہ گل بود خون خود بداماں کرد و رفت

محملے بر شعلہ، اشکے توشہ، آہے راہبر
شمع در شبگیر فرصت طرفہ ساماں کرد و رفت

گوہر اشکے کہ پرورد م بچشم انتظار
در تماشائی تو از دست نگہ غلطید و رفت

چشم عبرت ہر کہ بر اوراق روز و شب کشود
ہیچو بیدل معنی بے حاصلی فہمید و رفت

کس نرفتے بعدم ہستی اگر جا میداشت
خلقے از تنگی ایں خانہ بصحرا زدہ است

خانۂ ہستی کتنا تنگ ہے کہ لوگ صحرا کی طرف جا رہے ہیں، عدم ہی کشادہ مقام ہے۔

بیدل

ہر نگہ رنگ خرابات دگر میریزد
کس ندانست کہ آں چشم چہ صہبا زد است

حق رفاقت یاراں بجا نیاوردم
بپا یک آبلہ دل بود عذر خواہ شکست

حق رفاقت تو تب ادا ہوتا کہ یاروں کا ساتھ دیا جاتا وہ تو تنہا چلے گئے، پاؤں میں چھالے مانع رفتار ہیں، میرے بھی پاؤں میں ایک آبلہ تھا جسے دل کہتے ہیں پھوٹ کر ٹوٹ گیا، اتنا ہی عذر میں پیش کر سکا کہ چلنے سے معذور ہوں۔ دوستوں کی جُدائی پر دل کا شکستہ ہونا اور دل کو آبلہ سے تشبیہ، مضمون آفرینی اسے کہتے ہیں۔

ہلاک شد جم و خمیازہ ہای جام بجاست
بمرگ نیز ندارد خمار جاہ شکست

جم تو مر گیا مگر اس کا جام ابھی تک نشہ کی ٹوٹ کی وجہ سے انگڑائیاں لے رہا ہے، اہلِ جاہ خواہ مر جائیں خمار جاہ ٹوٹ نہیں سکتا۔

گاہے بکعبہ میروم و گہ بسوئے دیر
دیوانہ ام ز ہر طرفم سنگ میزنند

دیوانہ کے سر کی تواضع سنگ و خشت ہی سے ہوتی ہے، کعبہ و دیر بھی سنگ و خشت کی عمارت ہیں سنگ آستانہ پر ماتھا رگڑو۔

رہے آباد سنگ و خشت سے بتخانہ و کعبہ
علاج شورش سر اس سے بہتر ہو نہیں سکتا

آئینہ حضور دل تحفہ دیر و کعبہ نیست
آنچہ نثار ناز تست در ہمہ جا کہ میبرد،

رنگ ہا گم کردہ ام در خامۂ نقاش عجز
خار پائی گر کشی تصویر من پیدا شود
بو بہ دیگر ہم نمی خواہد گداز وہم و ظن
مے بساغر ریز تا اکسیر من پیدا شود

خواہد آخر بے نفس گشتن بعریانی کشید
مدتے شد رشتہ از پیراہن مامی کشند

تار نفس سے ہی رشتہ زندگی وابستہ ہے، میرے لباس وجود سے یہ تار ایک ایک کر کے نکال رہے ہیں آخر مجھے ننگا کر کے ہی چھوڑیں گے، جب یہ رشتہ ہی نہ رہا تو زندگی بھی ختم ہو گئی۔

آں طرف احتیاج انجمن کبریاست
چوں ز طلب در گذشت بندہ خدا می شود

بندگی اور احتیاج لازم و ملزوم ہیں، خدا بندہ نہیں ہے کہ غنی عن العالمین ہے اور احتیاج سے پاک ہے، اگر بندہ بھی محتاج نہ ہو تو یہ بھی خدا ہو جائے، مگر یہ ممکن نہیں۔

چہ ممکن است رود داغ بندگی ز جبیں
زمیں فلک شود و آدمی خدا نشود

البتہ اخلاق الٰہی حاصل ہو سکتے ہیں۔

اگر تسخیر دلہا در خیالات گزرد بیدل
باحساں جہد کن کاینجا خدائی بندہ می گردد

اگر دماغم دریں خمستاں خمار شرم عدم نگیرد
ز چشمک ذرہ جام گیرم بآں شکوہے کہ جم نگیرد

اس شراب خانہ ہستی میں اگر ہمارے ذہن میں عدم کا خیال نہ ہو تو

ہر ایک ذرّہ کی چشمک سے وہ جام لوں اور اس شان کے ساتھ کہ جم کو بھی یہ بات نصیب نہ تھی، جم تو مرگیا اور عدم میں ہے، کتنا نازک خیال ہے اور لفظوں کی بندش میں کیا لطف پیدا کیا ہے، نشہ ہستی ہرن ہو جاتا ہے جب عدم کا خیال ذہن میں ہو۔

زحرص منعماں سعی گدا ہم کم مداں بیدل
کہ خاک از بہر خوردن بیش از آتش اشتہا دارد

صرف آگ ہی ہر ایک شے کو نہیں اس سے بڑھ کر مٹی کھا رہی ہے، اس لئے دولت مند تو حریص ہیں مگر گدا بھی کم نہیں، ایک لوگ اور دوسرا خاک دونوں "خوردن" میں لگے ہوئے ہیں۔

ہر گل کہ دیدم آبلہ خوں چکیدہ بود
یارب چہ خار در دل گلشن شکستہ اند

ہر ایک پھول ایک آبلہ ہے جس سے خون ٹپک رہا ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ گلشن کے دل میں کیا کانٹا تھا کہ ٹوٹ کر رہ گیا۔

صد برق در کمیں نفس موج می زند
مردم نظر بشعلۂ ایمن شکستہ اند

لوگ تو شعلۂ طور کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں حالانکہ ہر ایک دم میں سو بجلیاں کوند رہی ہیں، یعنی تیرے ہی سینہ میں جلوۂ سینا ہے۔

ہستی برائے ہیچ کس آسودگی نخواست
گر دوست این کند بتو دشمن چہ می کند

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو (غالب)

ہستی سے ہمیں محبت ہے مگر یہ محبت تو دشمنی مول لینی ہے کیونکہ کوئی زندگی میں آسودہ نہیں، البتہ "کنج عدم میں آسودگی بسیار بود" اور عدم ہستی کا دشمن ہے۔

جہانے می کند جاں یک جز عبرت کہ می داند
کہ سقف خانہ فرہاد آخر بیستوں گردد

لفظ "بیستون" اصل "بہ ستون" ہے، عام بول چال میں "بے ستون" رہ گیا، اگر گھر کی چھت ستون پر نہ کھڑی ہو تو قائم نہیں رہ سکتی، ایک دنیا کوشش میں جان توڑ رہی ہے مگر دیدۂ عبرت ہی دیکھ رہا ہے کہ فرہاد کی طرح کوہ بیستوں سے ندی لانا جوئے شیر لانا ہے۔ فرہاد کے گھر کی چھت آخر بیستون ہی تو ہے۔

جان پاکم فارغ از تیمار جسم کردہ اند
عیسٰی بر چرخ بردم خر نمیدانم چہ شد

دریں زمانہ تقدس کجا تنزہ کو
مسیح رفتہ و نقش سم خر افتاد است

مرا آبلۂ پا چہ مشکل افتاد است
کہ تا قدم زدہ ام پائے بر دل افتاد است

بقدر سعی دراز است راہ مقصد ما
وگرنہ در قدم عجز منزل افتاد است
تو در کنارے و ما بے خبر، علاجے نیست

فروغ شمع تو بیروں محفل افتاد است
اُمید گوھری دیگر از یں محیط کراست
ہمیں بس است کہ گردے بساحل افتاد است
نہ نقش پاست کہ در وادی طلب پیداست
ز کارواں جرس چند بیدل افتادہ است

یہ تمام غزل مرصع ہے، مقطع کتنا لطیف ہے کہ وادی طلب میں نقش پا نہیں، "کاروانِ جرس" سے چند بینوا گرے پڑے ہیں یعنی کوئی بھی منزل تک نہ پہنچا، راستہ میں دم توڑ دیا۔ "جرس" کی آواز سے کارواں کا سُراغ ملتا ہے اور نقش پا سے بھی رہرو کا پتہ چلتا ہے، جرس بے صدا ہو کر رہ گئی اور نقش پا بیدلوں کی داستان مایوسی سُنا رہے ہیں۔

چساں ز خلوت بروں خرامد نقاب نکشودہ نازنینے
کہ شش جہت ہمچو موج گوہر ہجوم آغوش کرد تنگش

نازک خیالی بیدل پر ختم ہے۔ شعر کی لطافت میں دقیق نکات معرفت کا حل بھی ہے، یعنی ذات باری تعالےٰ تو ابھی تک الغیب ہے، ابھی وجہہ ذوالجلال والاکرام زیر نقاب اسما وصفات ہے کہ شش جہت یعنی ابھی اسما وصفات نے اسے آغوش میں تنگ لیا ہوا ہے۔ "موج گوہر" کیسی اچھی تشبیہ ہے گوہر بھی ہر طرف سے اسی امواج آب کے آغوش میں ہے۔

یار در آغوش و نام او نمیدانم کہ چیست
سادگی ختم است چوں آئینہ بر نسیان ما

یہ شعر نہایت لطیف اور دقیق ہے، آئینہ سادہ لوح ہے، اس کی آغوش میں حسین صورت ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ اس کی تعریف کیا ہے؟

تعریف اسم اور صفت سے کی جاتی ہے، اور وہ ذات منزہ اسما و صفات ہے، اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں، حقیقت بیرنگ ہے اور یہ حقیقت انسانی ہے لیکن ہم اس کی کُنہ کو نہیں پہنچ سکتے، بات یہ ہے کہ مجھے میرے نام ہی سے بلاتے ہیں، میں اپنے آپ کو اس نام کے بغیر ہی جانتا ہوں، لیکن دوسرے نام ہی سے تیری جان پہچان ہو گی۔ اسی طرح ذات کو اسما و صفات سے موسوم اور متصف معرفت کے لئے کر رکھا ہے، ذات اس سے بے نیاز ہے، "بایدیزباں خلق موسوم شدن" اسما و صفات کو ہم نے طاقِ نسیاں پر رکھ دیا، ہم ذات پرست ہیں، اور وہ حقیقت مجردہ ہے۔

بحرِ ہزج سالم میں جوالبش را نقابش را کی زمین میں اکثر شعراء نے طبع آزمائی کی ہے، بیدل نے اس زمین میں دو غزلیں کہی ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بتدبیر دگر زاں جلوہ نتواں کام دل بردن
غبار من مگر از پیش بردارد نقابش را
خرامش مصرع شوخ رمیدن درمیاں دارد
نخواہم رفت اگر از خود کہ می گوید جوالبش را
ندارد نازِ لیلی شیوہ بے پردہ گردیدن
مگر مجنوں زجیب خود دردطرف نقابش را
دراں وادی کہ از خود رفتم و پر می زند بیدل
شرر عرض خرام سنگ می داند شتابش را

بلبل بنالہ حرف چمن را مفسر است
یارب زبان نکہت گل ترجمان کیست

نالۂ بلبل اور بوئے گل دونوں پریشان ہیں، "حرفِ چمن" کی شرح تو نالۂ بلبل ہے مگر بوئے گل کس کی ترجمانی کر رہی ہے حسن و عشق کس کی نمایندگی کر رہے ہیں۔

شیرازۂ گل تھا بکھرا ہوا یے ربطِ عبارت نکہت تھی
یہ مصرع بہارِ ہستی کا موزوں نہ تھا، انشا ہو نہ سکا
کوشش تو بہت کی غالب نے اور اختر نے بھی ریختہ میں
انداز وہ طرزِ بیدل کا اشعار میں پیدا ہو نہ سکا

تمام شُد